میں اک جگنو
میمونہ نصر اللہ
SohniDigest.com

ناول

میمونہ نصراللہ

میں اِک جگنو

وہ ہوٹل کے قدرے سنسان کاریڈور سے گذر رہی تھی کہ موڑ مڑتے ہی سامنے دولڑکے باتیں کرتے نظر آرہے تھے۔خاموشی کی وجہ سے انکی باتیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں۔وہ بلوچی زبان میں باتیں کرر ہے تھے۔وہ خود بلوچ تھی اوران کے گھر میں بھی بلوچی بولی جاتی تھی۔اس لیے اسے انکی گفتگو سمجھ آرہی تھی وہ آہستہ قدموں سے انکے قریب سے گزرتی گئی۔

اس پر سرسری نگاہ ڈال کر وہ پھر اپنی پریشانی کو ڈسکس کرنے لگے۔شاید انکا خیال تھا کہ انکی باتیں اسے سمجھ نہیں آرہی تھیں۔

"یہ جس کی بھی حرکت ہے میں اسے دیکھ لوں گا اور بتاؤں گا کہ اس کی سزا کیا ہے۔"

"پہلے انکو رخصت کرلیں جن کو بلایا ہے۔"

ان میں ایک جو زیادہ ہینڈسم تھا۔یہ اسکی آواز تھی۔دونوں ہی دراز قد تھے۔کاریڈور مڑ کر اس نے پرس کھول کر موجود رقم کو چیک کیا۔خاصی رقم تھی۔عموماً وہ بیگ میں اتنے زیادہ پیسے نہیں رکھتی تھی۔آج ردا کے لیے لائی تھی جانے کتنا بل ہوتا اسکی شاہ خرچیاں تو پتہ تھیں۔وہ رقم کو گنتی پرس میں ڈال کر کاؤنٹر پر گئی۔

"یہ میر حاشر خان کا بل"۔اس نے رقم نکال کر کاؤنٹر پر رکھی۔

"میم ٹیبل نمبر؟"ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ اسکا کیا جواب دے آگے وہ لڑکی خود ہی بول اٹھی۔

"ٹیبل نمبر 26؟"اس نے سر اثبات میں ہلایا۔آتے ہوئے وہ نام سن چکی تھی اس کے علاوہ تو کچھ نہیں جانتی تھی۔باون ہزار کی ادائیگی کے بعد بقیہ رقم کاؤنٹر پر رکھ دی گئی۔وہ پیسے پرس میں ڈالتی باہر آ گئی تھی۔خدا جانے کتنے لوگوں کو مدعو کر رکھا تھا ان بلوچوں نے۔

موسم اچھا تھا ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔اس نے گہری سانس لی۔کل پیپر ہے اور میں باہر پھر رہی ہوں۔اس نے خود کو یاد دلایا۔پھر اسکی سوچیں ان لڑکوں کی جانب مڑ گئیں۔انکی جیب کٹ گئی تھی۔ساتھ ہی موبائل فون اور گاڑی کی چابی بھی گم تھی۔دونوں شاید بھائی تھے اور زیادہ ہینڈسم والا بڑا بھائی تھا۔یہاں وہ اپنے دوستوں کو دعوت پر لے کر آئے تھے۔

بل کی ادائیگی کے لیے ایک بھائی نے والٹ نکالنا چاہا تو پتہ چلا والٹ غائب ہے۔سب کے سامنے اس بات کو ظاہر کرنا بھی بے عزتی کے مترادف تھا۔اور بلوچ غیرت کے منافی۔۔کہ مہمان بلا کر پھر یہ ظاہر کرتے کہ جیبیں کٹ گئیں۔وہ چھوٹے بھائی کو اشارہ کرتا قدرے الگ حصہ میں لے آیا وہاں پتہ چلا دونوں کی جیبیں کٹ چکی ہیں۔یا اپنے کسی دوست کے فضول مذاق کا شکار ہو چکے ہیں۔اب ریسپشن پہ جا کر کسی کو فون کر کے بلانا بھی انہیں بے عزتی لگ رہا تھا۔لیکن شاید حل یہی تھا یا کچھ اور سوچ رہے تھے وہ اتنا ہی سن سکی تھی۔

ایک تو وہ اپنی ہر کسی کی مدد کرنے والی عادت سے مجبور تھی۔دوسرا بلوچ غیرت کو بھی سکون نہ آیا کہ اسکے سامنے کسی بلوچ کے ساتھ ایسا ہو کہ وہ سب کے سامنے شرمندہ ہو جائے۔اگر وہ خود جا کر مدد کا کہتی تب بھی انھوں نے قبول نہیں کرنی تھی۔اس لیے وہ خاموشی سے انکی مدد کر آئی تھی۔

یہاں وہ اپنی ہاسٹل کی ایک دوست کی مدد کے لیے آئی تھی جو یہاں اپنی کالج فرینڈز کے ساتھ آئی تھی۔ان میں سے ایک کی برتھ ڈے تھی تو ردا بی بی نے حاتم طائی کی قبر کو لات مار کر کھل کر خرچ کیا۔لیکن اسکے پاس پیسے کم پڑ گئے تھے تو ایسے میں کہ جب ہاسٹل کی تقریباً ہر لڑکی پیپروں کی تیاری میں مصروف ہو کون اسے پیسے دینے آ سکتا تھا۔سوائے اس ایدھی کی رشتہ دار کے۔

ردا پڑھائی کو اتنا ہی سیریس لیتی تھی کہ پیپر سے ایک دن پہلے پارٹیاں دیتی پھر رہی تھی۔اور رہی وہ یعنی مریم عالم۔تو اسکا سب کو پتہ تھا کہ ٹاپ تو اس نے ہی کرنا ہے۔روز کا کام روز کرنے کا فائدہ یہی تو ہوتا ہے کہ عین وقت پر کوئی بھی ایمر جنسی آپکا نقصان نہیں کرتی۔اب بھی اس نے واپس ہاسٹل جا کر تیسری بار رویژن کرنی تھی۔اچھے موسم کی وجہ سے وہ پیدل چل رہی تھی تھوڑا آگے جا کر ٹیکسی کرنے کا ارادہ تھا اسکا۔اسے ردا کی بوکھلاہٹیں یاد آئیں تو ہونٹوں پہ ایک بار پھر مسکراہٹ آگئی۔"اتنی دیر لگا کے آئی ہو اب تو سب کو شک ہونے لگا تھا کہ شاید میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"شرم نہیں آتی کل پیپر ہے اور تم پارٹیز دیتی پھر رہی ہو۔"مریم نے اسے گھورا۔"تو یہ کہاں لکھا ہے کہ پیپر سے ایک دن پہلے پارٹی دینا گناہ ہے۔"ردا نے ڈھٹائی سے دانت نکالے۔مریم گھورتی رہی۔

"اب اپنی آنکھوں سے جلاؤ گی؟ یار سچ میں تو صرف شاپنگ کرنے نکلی تھی کہ اس کے بعد واپس جا کر صرف پڑھائی کرنی ہے۔ لیکن وہاں یہ مصیبتیں مل گئیں۔تو انھیں لنچ کے لیے یہاں لے آئی اور یہیں آکر پتہ چلا کہ موٹی کی برتھ ڈے ہے سو چا مل گئے ہیں تو پارٹی میری طرف سے۔"مریم ہنوز گھورتی رہی۔"ٹھیک ہے اب بل ادا کرو اور چلو۔"مریم اسی طرح گھورتے ہوئے بولی۔

"اور بل آیا، تو یاد آیا۔شاپنگ کے بعد پرس میں صرف ٹیکسی کا کرایہ تھا۔تمہیں میسج کر کے میں نے ایک دو اور ڈشز کا آرڈر دیا۔جو ایک گھنٹے تک آئیں گی۔کیونکہ مجھے پتہ نہیں تھا کہ تم صرف پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤ گی۔ورنہ سچ میں، میں نے سنجیدگی سے پیپر کی تیاری کا سوچا ہوا تھا۔اب کم از کم دو گھنٹے لگیں گے۔ایسا کرو آؤ تم بھی۔۔۔انجوائے کر لیتے ہیں۔۔پھر اکٹھے چلیں گے۔"

مریم کے خونخوار تیور دیکھ کر وہ بات کرتے اٹک گئی تھی۔"دفع ہو جاؤ۔واپس میرے پاس نہ آنا اپنی انہی مصیبتوں کے ساتھ چلی جانا بلکہ ہو سکے رات کے لیے ایک اور پارٹی ارینج کر لو۔اور کل پیپر دینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"اس کے ہاتھ میں پیسے تھماتی وہ پلٹی۔"مریم آئی لو یو ٹو یار۔اور آج رات میں تمھارے ساتھ بیٹھ کر کمبائن سٹڈی کروں گی۔"مریم کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی تھی لیکن وہ مڑے بغیر آگے چل پڑی تھی۔آگے وہ بلوچ بھائی بھی ردا جیسی مشکل میں گرفتار تھے۔وہ ردا کو سوچتی چلتی جا رہی تھی کہ پیچھے سے آتی

آوازوں پر مڑ کر اس نے دیکھا وہ دو ہینڈسم اور وہ ریسیپشن والی لڑکی اسے ہی آوازیں دے کر رکنے کا کہہ رہے تھے۔پھر وہ لڑکی چلی گئی اور وہ دونوں اسکی جانب آنے لگے۔وہ وہیں رک کر ان کا انتظار کرنے لگی۔بڑی تیز سروس تھی کہ تھوڑی دیر میں اسے ڈھونڈ لیا تھا۔

لیکن اگر وہ ٹیکسی کر کہ جا چکی ہوتی تو کیسے ڈھونڈتے۔آخر ایسے وقت میں مدد کرنے والے کا شکریہ ادا کرنا تو بنتا تھا۔ان کے قریب آتے ہی وہ جو خیر مقدمی مسکراہٹ سجانے لگی تھی۔بڑے بھائی کے سوال پر حیران رہ گئی۔

" کون ہو تم ؟"

"جی؟؟" وہ الفاظ پہ کم اسکے لب و لہجے اور انداز پہ حیران ہوئی۔وہ خونخوار نگاہیں اسکے چہرے پہ گاڑے جیسے آنکھوں سے ہی اسے کھا جانا چاہتا تھا۔"زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے۔بتاؤ کس نے بھیجا ہے تمہیں۔کس کا مہرہ ہو۔یا پھر تم خود ہی ہمارا سامان چرا کر ہماری نظروں میں اچھی بننا چاہتی تھی۔راہ و رسم بڑھانے کا اچھا طریقہ ہے۔" وہ تو اسقدر زہریلے لہجے کو سن کر ہی پریشان ہو گئی تھی۔

" مسٹر آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔نہ کسی کا مہرہ ہوں۔وہاں سے گزرتے ہوئے آپکی باتیں سنیں تو میں نے سوچا انسانیت کے ناطے آپکی مدد کر دوں۔اور بس۔" وہ بالکل ٹھنڈے لہجے میں بولی۔" کیا آپ بلوچ ہیں؟" چھوٹے بھائی نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔"جی اسی لیے تو آپکی گفتگو سمجھ آ گئی تھی۔" مریم کا اب اخلاق دکھانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے نرمی سے جواب دے گئی تھی کہ نرم انداز میں بولنا اسکی عادت تھی۔حاشر ابھی بھی اسے بے اعتمادی سے دیکھ رہا تھا۔

" میرا نام میر جاذب خان ہے۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔" میرا نام ۔۔" ابھی وہ بول ہی رہی تھی کہ حاشر نے اسکی بات کاٹ دی۔" میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ راہ و رسم بڑھانے کا طریقہ ہے یہ۔لیکن محترمہ ہمیں آپ کے بارے میں جاننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" مریم کو تو اسکے الفاظ و انداز نے آگ لگا دی۔

" محترم انسان آپ ہیں کون کہ جس سے میں راہ و رسم بڑھاؤں گی۔آپ اگر خود کو کوئی توپ شے سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں۔میری بلا سے جہنم میں جائیں۔یعنی حد ہے خوش فہمیوں کی۔میں نے تو صرف انسانیت کے ناطے مدد کی تھی اور دوسرا میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ کوئی بلوچ پیسے کے لیے کسی کی کوئی بات سنے۔" وہ دھیمی آواز

میں سلگتے لہجے کے ساتھ بولی۔ میر حاشر نے اسکی بات سن کر یوں گردن ہلائی جیسے بہت متاثر ہوا ہو۔ اور دراصل یہ طنزیہ انداز میں کیا تھا اس نے۔ جاذب نے بھائی کے تیور دیکھے اور جلدی سے بات سنبھالنے کو بولا۔

"تو پ شے نہیں لیکن اپنے قبیلے کے سردار ہیں۔۔۔" مریم نے اسکی بات پوری ہونے سے پہلے کاٹ دی۔

"ایسی سرداری کا کیا فائدہ جب انسان کو دوسروں سے بات کرنے کی تمیز ہی نہ ہو۔" وہ تنفر سے کہتی مڑی۔ حاشر غصے میں اسکے پیچھے لپکا لیکن جاذب نے جلدی سے اسکا بازو پکڑ کر روکا۔

"اڈا کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ اب سر عام خواتین سے بحث کریں گے؟" حاشر نے بازو چھڑوایا۔

"تم نے سنا نہیں وہ کیا کہہ کے گئی ہے"

ان دونوں میں بحث چل رہی تھی۔ لیکن مریم نے مڑ کر نہ دیکھا۔ آوازیں تو آ رہی تھیں۔ اس نے پاس سے گزرتی ٹیکسی کو روکا۔ نیکی گلے کیسے پڑتی ہے اسے آج معلوم ہوا تھا۔

ان کے چوری ہوئے سامان کا تو کوئی اتا پتہ نہیں تھا۔ لیکن میر حاشر نے بینک کال کر کے اپنے کریڈٹ کارڈز بلاک کر دیے تھے۔ اور یہ بھی کہ جو بھی انہیں لے کر آئے اسے بٹھا دیا جائے۔ اور پھر فوراً کال کر کے اسے بلایا جائے۔

اسکی زندگی بہت مصروف سی زندگی تھی۔ وہ اپنے قبیلے کا سردار تھا یہ اور بات کہ وہ مانتا نہیں تھا۔ اور بابا جان سے اکثر ہی اس بات پر بحث رہتی تھی۔ پھر یہاں اسلام آباد میں وہ اپنے کاروبار کا سربراہ تھا۔ یہ بھی بابا جان کی عنایت تھی اور وہ اس عہدے پر بنا کسی بحث کے کام کرتا تھا اور پھر وہ قومی اسمبلی کا ممبر بھی تھا جو کہ اسکی اپنی خواہش تھی۔

اتنی مصروفیات کے ساتھ کبھی کبھی وہ جھنجھلا جاتا تھا۔ اور بابا جان سے کہتا میں سرداری سے دستبردار ہو رہا ہوں اور بابا جان غصے میں آ جاتے تھے۔ یہ اور بات کہ اپنے غصے کے باوجود بھی اس سے نرم لہجے میں ہی بات کرتے۔ وہ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ جو دراصل آپکی کمزوری ہوتے ہیں تو وہ بھی بابا جان کی کمزوری تھا۔ پہلا بیٹا تھا اور انکے لیے دنیا جہان سے بڑھ کر تھا۔

"بابا جان میں اتنی ذمہ داریاں ایک ساتھ نہیں اٹھا سکتا۔آپ جاذب کو یا کسی اور بھائی کو یہ عہدہ دے دیں۔اور مجھے تو حیرت ہوتی ہے آپ کیسے بادشاہ ہیں۔جو جیتے جی اپنی سلطنت چھوڑ بیٹھے ہیں وہ بھی بیٹے کے لیے۔۔"

"تو کس کے لیے چھوڑوں؟ تم میرے سب سے بڑے بیٹے ہو تمہارے علاوہ تو کسی کو یہ پگ نہیں دوں گا۔اپنی زندگی میں تمہیں اس لیے یہ عہدہ دیا ہے کہ جہاں تم کوئی غلط فیصلہ کرو تو تمہارے سر پر کوئی ہونا چاہیے جو تمہیں اچھی شاہی کے طریقے سمجھائے۔میرے مرنے کے بعد شاہی کرو گے تو مجھے کیا معلوم کیسی کرو گے کیا غلطیاں کرو اور ان غلطیوں سے تمہیں کوئی نقصان ہو جائے پھر؟"

وہ دراصل کسی بیٹی کے جیسی ٹینشن پالے بیٹھے تھے۔بابا جان کی بات سن کر وہ ہنس دیا۔

" آپکی محبت میرے لیے قیمتی سرمایہ ہے بابا جان لیکن مرد کا بچہ ہوں اور بلوچ ہوں۔۔آپ میرے لیے یہ بیٹیوں والی فکریں نہ پالیں۔ساری دنیا آپ کے رعب و دبدبے سے ڈرتی ہے اور آپ اپنے سب سے بہادر بیٹے کے لیے ایسی فکریں پالتے ہیں۔"

بابا جان نے اسکی بات سن کر سر جھٹکا۔" تم بھی جانتے ہو میری اصل پریشانی کیا ہے۔اور یہ تو میں بھی جانتا ہوں میرا بیٹا بہت بہادر اور مضبوط ہے۔تم تو میرا فخر ہو لیکن یار اب بس کردو میں مزید یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔" بابا جان نے اسے پھر سے گھیر لیا تھا۔حاشر نے گہری سانس لی۔

" اسکے علاوہ جو بات منوانی ہے منوائیں یہ نہیں۔" اس نے دو ٹوک اپنا مؤقف بیان کیا۔

" باپ کو ایسے بے بس کرو گے؟"

" یار بابا جان کیا ہو گیا ہے آپکو۔میں نے پہلے دن ہی آپ پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ میں آپکی بھانجی سے شادی نہیں کروں گا کیونکہ وہ مجھے نہیں پسند۔اور آپکو بھی معلوم ہے جو مجھے نہیں پسند میں اسے اپنے آس پاس بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

" کیا کمی ہے اس میں؟" کسی فکرمند ماں کی طرح وہ بولے۔

" کمی تو کوئی نہیں بلکہ زیادتی ہی ہے۔" وہ ہنسا۔" بابا آپ کیوں اس کی میرے منہ سے برائی کروانا چاہتے

ہیں؟ ہوسکتا ہے اچھی لڑکی ہو لیکن وہ مجھے نہیں پسند۔"

"تمہاری بچپن کی منگیتر ہے۔"

"اور آپ بھی جانتے ہیں مجھے بچپن سے ہی ناپسند ہے وہ۔" وہ بے مروت ہوا۔ "تم میری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو۔" اب کے بابا جان نے اسے گھورا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ وہ جائز ناجائز سب فائدے اٹھایا کرتا تھا۔ اس خاندان میں کس کی جرٔت تھی کہ وہ میر سراج خاں کے آگے انکار کرتا یہ خاندان کیا انکا تو اپنے پورے علاقے میں دبدبہ تھا۔ انکی بات حرفِ آخر تھی۔ سرداری بیٹے کے ہاتھ دینے کے باوجود بھی انکی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

سنجیدہ اور غصیلے چہرے کے ساتھ جب وہ کوئی حکم جاری کرتے۔ تو سامنے والے میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کے آگے کوئی اعتراض کر سکے۔ میر حاشر حقیقتاً ایک خوش نصیب شخص تھا۔ جب وہ دونوں باپ بیٹا بند کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے تو بابا جان کی سنجیدگی، رعب اور غصہ سب کہیں دور چلا جاتا اگر جو انکے کسی اور بیٹے کو یہ معلوم ہو جاتا تو وہ بلا جھجک انکار کر دیتے۔ بابا جان اور نرم لہجہ؟؟۔

بابا جان کی تین شادیاں تھیں۔ حاشر پہلی بیوی سے تھا۔ اسکا بھائی جاذب اور ایک بہن نیناں تھی۔ انکی اماں کو اسکے بعد کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ دوسری بیوی سے انکے چھ بیٹے تھے اور تین بیٹیاں اور تیسری بیوی سے چار بیٹے اور چار بیٹیاں۔ بہت ہی لمبا چوڑا خاندان تھا اور دو تین شادیاں بھی عام سی بات تھی۔ سب کے رشتے خاندان میں ہی طے تھے۔

انکے ہاں جلدی شادیاں ہوتی تھیں۔ سو اسکے کچھ بہن بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اپنے سگے بہن بھائی کے لیے وہ ڈٹ گیا تھا کہ جب تک وہ تعلیم مکمل نہیں کر لیتے تب تک انکی شادی کا نام نہ لیا جائے۔ اس لیے جاذب جو بزنس کا سٹوڈنٹ تھا ابھی تک شادی سے محروم تھا یہ اور بات کہ اسے اس بات کا بہت قلق تھا۔ پھر اس سے چھوٹی نیناں کا حاشر نے ایم ایس سی کیمسٹری کے لیے قائد اعظم یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروا دیا تھا۔ سوتیلے بہن بھائیوں سے اچھے تعلقات تھے لیکن جس بھائی نے شادی کو ترجیح دی تو اس نے کچھ نہیں کہا تھا کہ پہلے پڑھو۔

خیر لڑکوں کی پڑھائی کے لیے تو کوئی پابندی نہیں تھی اور بہنوں کے لیے حاشر تھا کہ جو جتنا پڑھنا چاہتی ہے پڑھے۔اس لیے نیناں کے ساتھ ناز بھی پڑھنے آ گئی تھی۔وہ دونوں ہاسٹل میں رہتی تھیں۔کہ یہاں اسلام آباد والے گھر میں سیاست اور سرداری کی وجہ سے ہر وقت آنا جانا لگا رہتا تو اس لیے حاشر نے خود ہی انہیں ہاسٹل بھیجا تھا۔

"ادی زہرہ بہت پریشان ہے اپنی بیٹی کے لیے۔حاشر ضد چھوڑ دو۔" بابا جان نے جیسے منت کی۔

"بابا جان آپ انکی بیٹی کی شادی اپنے کسی اور بیٹے سے کر دیں۔دو دو شادیاں تو عام سی بات ہے۔" بابا جان نے گھورا۔"شرم نہیں آتی۔اپنی منگیتر کو کسی اور کے حوالے کرتے۔"

"بابا جان میں اسے اپنی منگیتر نہیں مانتا۔" وہ جیسے زچ ہوا۔"اور ویسے بھی یہ حل بہترین ہے کہ آپکی زبان کی پاسداری بھی رہ جائے گی اور پھوپھو زہرہ کی پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔"

"زبان تو میں نے یہ دی تھی کہ میں اپنے سردار بیٹے سے اسکی بیٹی کی شادی کرونگا۔"

"تو ٹھیک ہے آپ یہ سرداری کی پگ اس بیٹے کو دیں جس سے بھانجی کی شادی کریں گے۔" وہ صحیح معنوں میں انکی برداشت اور محبت کا امتحان لے رہا تھا۔

"اچھا جو لڑکی پسند ہے وہ بتاؤ۔" بابا جان نے تھک ہار کر ہمیشہ والا سوال دہرایا۔

" کوئی بھی پسند نہیں ہے آپ جانتے ہیں۔میں کبھی ان چکروں میں نہیں پڑا۔" کیا شان بے نیازی تھی۔

"یار کیسے آدمی ہو جس کی زندگی میں ایک بھی عورت نہیں آئی۔مجھے دیکھو تین تین شادیاں کی ہیں۔خاندان کے سب مرد شادی کے بعد اور پہلے بھی عشق رکھتے ہیں تم کہتے ہو کوئی نہیں پسند۔وہاں امریکہ میں گھاس کھاتے رہے تھے کیا۔کوئی انگریزن ہے تو بھی بتا دو بیاہ لاؤں گا اسے بھی۔لیکن اس طرح میری برداشت کا امتحان نہ لو۔" وہ زچ ہو کر ہاتھ جھاڑ کر بولے۔حاشر نے لب بھینچ لیے۔

"واللہ بابا جان کوئی پسند نہیں ہے۔اور شادی کرونگا ضرور کروں گا لیکن اس سے جو پسند آئے گی۔کیونکہ مجھے دو تین شادیاں کر کے گڑ دھال (جھنجال پورہ) اپنے گلے میں نہیں ڈالنا۔"

"اور اگر تمہیں ایک ماہ تک کوئی پسند نہ آئی تو میں اپنی بھانجی سے تمہاری شادی طے کر دوں گا۔" بابا جان نے دھمکی بھرے انداز میں کہا۔

" اور اگر ایسا ہوا تو میں نہ صرف سرداری چھوڑوں گا بلکہ فیملی بزنس بھی چھوڑ دوں گا اور امریکہ شفٹ ہو جاؤنگا اور وہاں جا کر پاکستانی نشنیلٹی ختم کر کے ہمیشہ کے لیے امریکی بن جاؤں گا۔" لیں بابا جان اور دیں دھمکیاں۔۔" الو کا پٹھا۔گدھے۔۔لوگ جائیدادوں کے لیے لڑتے مرتے ہیں سرداریوں کے لیے اتنی سکیمیں بنائی جاتی ہیں اور ایک تم ہو گھاس چرنے والے گدھے جوان سب کو چھوڑ کر جانے کی باپ کو دھمکیاں دیتے ہو۔" بابا جان دھیمی آواز میں بڑبڑاتے رہے یہ اور بات کے وہ سن چکا تھا۔ہنستے ہوئے انکے ہاتھ پر بوسہ دیتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

" شکریہ بابا جان مجھے سمجھنے کے لیے۔" پھر وہ تو چلا گیا۔بابا جان خود کلامی کرتے رہے۔ساری دنیا پر حکم چلاتا ہوں اور یہ ہے کہ مجھے ہی دھمکیاں دے جاتا ہے۔۔۔"

لیکن وہ اسکے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے تھے۔کہ جانتے تھے یہ ناممکن تھا۔اگر اس نے کہا تھا کہ وہ ایسا کرے گا تو مطلب کرے گا بلوچ ہو اور بات سے پھر جائے؟ اور وہ بھی سردار۔۔وہ گہری سانس بھر کر رہ گئے۔وہ یہ بات محبت سے منوانا چاہتے تھے کہ ضد کے ساتھ منوا لیتے لیکن انجام برا ہونا تھا۔

وہ صرف بہادر اور ذہین نہیں تھا ضدی اور ہٹ دھرم بھی تھا۔پھر خانگی کا بھی غرور کہ جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔وہ ان کا شیر تھا ایک سربراہ کو ایسا ہی ہونا چاہئے جیسا وہ تھا، نا جھکنے والا اور ڈٹ کر مقابلہ کرنے والا۔۔سمجھداری سے وہ جرگے کے معاملات کو سلجھاتا تھا لیکن وہ غیر شادی شدہ تھا جس کا انہیں بہت افسوس تھا۔وہ انتیس برس کا تھا اور اسکی زندگی میں کوئی عورت نہیں تھی۔

اسے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔لیکن بابا جان کی اب اصل پریشانی یہی تھی۔صرف انکی نہیں حاشر کی اماں کی بھی لیکن انہیں کیونکہ نند ناپسند تھی ،تو وہ اسکی بیٹی کے لیے بیٹے کو کبھی بھی نہیں مناتی تھیں۔ہاں وہ یہ کہتی تھیں کہ کوئی اور پسند کر لو۔

☆......☆......☆

ردا رات کو لوٹی تھی۔ جب وہ عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو دیکھا کہ وہ کمرے میں آچکی تھی۔ وہ اسے ایک نظر دیکھ کر اپنی تسبیح پڑھنے لگی۔ پھر دعا مانگ کر جائے نماز اپنے بیڈ کے سرہانے رکھی۔

" مل گئی فرصت آنے کی۔" دوپٹہ کھولتے ہوئے وہ بیڈ پر بیٹھی۔ ردا نے اسے دیکھ کر مسکراہٹ اچھالی۔" یار تمہیں تو پتہ ہے مجھے پیپرز کی کتنی ٹینشن رہتی ہے بس اس لیے جلدی آگئی ورنہ وہ لوگ تو کہہ رہی تھیں کہ کہیں اور چلتے ہیں۔ مشکل سے انہیں منع کر کے آئی ہوں۔"

" ہمم واؤ۔۔" مریم نے متاثر ہونے والے انداز میں سر کو ہلایا۔ وہ اس طنزیہ انداز پر ڈھٹائی سے ہنسی۔" اب ذرا مجھے ایک دو ٹاپک سمجھا دو۔ مجھے پورا یقین ہے وہ کل پیپر میں ضرور آئیں گے۔ جب سر نے پڑھایا تھا مجھے اس دن اندازہ ہو گیا تھا۔۔" مریم مسلسل اسے گھورتی رہی۔ ردا نے اسکے نوٹس اٹھا کر اسکے آگے رکھے اور خود سامنے بیٹھ گئی۔" کیونکہ تمہیں پہلے دن سے اندازہ تھا کہ وہ بہت اہم ہیں تو تم انہیں خود کر چکی ہو گی۔ اس لیے اب میرا سر نہ کھاؤ۔"

" یار کیا ہو گیا ہے۔ تم میری پڑھائی کے لیے یوں سیریس رہتی ہو جیسے میری ماں ہو۔" اب کے ردا بے زاری سے بولی۔" تم زندگی مزے سے نہیں گزارنے دیتیں تم چاہتی ہو کہ میں ہر وقت پڑھائی کرتی رہوں اور۔۔"

" کیونکہ میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔ تو یہ اہم ٹاپک اپنی ماں سے جا کے سمجھو۔" مریم مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ردا نے اسکی پشت کو گھورا۔" مجھے ویسے بھی پڑھائی کا شوق نہیں ہے یہ تمہاری وجہ سے تھوڑا بہت پڑھ لیتی ہوں۔" مریم ان سنا کیے الماری سے چائے بنانے کا سامان اٹھانے لگی۔ آج ان بلوچوں نے جو اسکے سر میں درد کیا تھا وہ ابھی تک نہیں گیا تھا اور اب اس نے چائے پینے کا سوچا تھا کہ درد بڑھتا جا رہا تھا۔" تم سن رہی ہو؟"

" ہاں۔ اور میں حیران ہوں کہ جب تمہیں پڑھائی میں بالکل بھی انٹرسٹ نہیں ہے تو تم نے ایم ایس سی کیمسٹری میں داخلہ ہی کیوں لیا تھا۔" ردا گڑبڑائی۔" ممی کی وجہ سے تم جانتی ہو۔۔"

" جانتی ہوں ممی کی وجہ سے یہاں آئی ہو لیکن میں اس بات پر حیران ہوں کہ تمہارے پڑھنے کے حال میں دیکھ چکی ہوں تو تمہارا ایم ایس سی کیمسٹری کا میرٹ کیسے بن گیا تھا پڑھتی تو تم ہو نہیں؟"

مریم نے مڑ کر ایسے دیکھا جیسے چیلنج کیا ہو۔ ردا کی آتی جاتی سانسیں رکنے لگیں۔ مریم عالم بے وقوف ہی اچھی تھی وہ ذرا سا بھی دماغ چلانے لگتی تھی تو ردا کی سانسیں بند ہونے لگتی تھیں۔

"خیر اب اتنی بھی نالائق نہیں ہوں۔ میرے بی ایس سی میں بہت اچھے مارکس تھے اور یونی ٹیسٹ بھی آرام سے کلیئر کر لیا تھا اور ویسے بھی میں ہر وقت پڑھنے کی قائل نہیں ہوں۔ بس پیپر کی رات پڑھ لینا کافی ہوتا ہے۔"

"جی آپ کی پیپر کی رات والی پڑھائی کو میں جانتی ہوں۔ اسی سے تو مجھے اندازہ ہوا کہ آپ میں ایک ٹاپر لڑکی چھپی ہوئی ہے۔" ردا نے بے بسی سے اسے گھورا۔ اور دل میں خود کو کوسا۔ کیوں وہ اس لڑکی کی بے وقوفی کو چیلنج کرتی تھی۔ جب وہ نرم مزاجی سے ہٹتی تھی تو بہت ظالم بن جاتی تھی۔

مریم چائے بناتے ہوئے سب سامان اکٹھے ڈالتی تھی۔ اور اب بھی ایسا ہی کیا تھا۔ وہ چائے کا برتن اٹھائے ایک طرف رکھے سلینڈر کی طرف جانے لگی کہ دروازے میں سر گھسا کر ماریہ نے مریم کو دردناک آواز میں پکارا۔

"ہائے مریم ہمارا سلینڈر ختم ہو گیا ہے اور سب چائے کے لیے ترس رہے ہیں۔ پلیز اپنا سلینڈر دکھا دو۔" اس لڑکی کا روم ان کے روم سے تھوڑا دور تھا لیکن جب کوئی مدد نہیں کرتا تھا تو ہاسٹل کے ہر کونے سے ایک ہی آواز آتی تھی مریم عالم کے پاس جاؤ۔ اور وہ یہاں تھی۔ مریم نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا برتن قریبی میز پر رکھا اور آگے بڑھ کر سلینڈر اٹھا کر اسے پکڑا دیا۔

ردا تیر کی طرح اٹھ کر دروازے تک آئی۔ "ابھی مریم خود چائے بنا رہی تھی۔ وہ بنا کے پی لے۔ پھر آنا لے جانا۔" ردا کو وہ بے وقوف اچھی لگتی تھی لیکن صرف اپنے معاملے میں وہ ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ اسکی دوست سب کے لیے ہی ایسی ہو۔ بیوقوف (اسکے خیال میں)۔ ردا نے سلینڈر کو ایک جانب سے پکڑا۔ مریم نے اسے گھورا۔ "ماریہ تم لے جاؤ۔ میں بعد میں بنا کے پی لوں گی۔" کسی کو انکار کرنا تو اسکی شان کے خلاف تھا۔ ماریہ تو شکریہ کے ساتھ سلینڈر لیے چلی گئی۔ پیچھے ردا غصے سے اسے گھور رہی تھی اور مریم اسے۔ "جب اپنے لیے بنا رہی تھی تو اسے کیوں دیا اتنی ہی ہمدردی ہے تو پہلے خود تو پی لیتی چائے پھر انہیں دیتی۔"

"جب وہ مانگنے آئی تھی تو کیا کہتی انتظار کرو۔"

"ہاں یہ کہنے سے تو بلوچ صاحب کی شان میں کمی ہو جاتی۔" مریم نے گھورا۔ وہ تھوڑی دیر میں دے جائے

گی بنا کے پی لوں گی۔"

"تم بھی جانتی ہو اب دو گھنٹے تو کہیں نہیں گئے۔اور اگر وہ آپ کو سلینڈر آ کے دینا بھول جائے گی تو جا کر مانگنا بھی آپکی توہین ہو گا۔" وہ جل کر بولتی اپنے بیڈ پر جا بیٹھی۔وہ تو سب کی مدد کرتی تھی لیکن خود کسی سے نہیں مانگتی تھی اور مانگنے والے کو انکار کرنا؟؟ یہ بھی اسکی شان کے خلاف تھا۔

خود اسے تو اس سب سے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔لیکن ردا تو شروع سے اسکی ان عادتوں سے چڑتی تھی۔ بلکہ اکثر لڑائی ہوتی بھی اسی بات پر تھی۔ کچھ لوگ تو مریم کی اچھی عادتوں کی وجہ سے اسکا احساس کرتے تھے۔لیکن عمومی طور پر اسکی نرم مزاجی ،اور فراخ دلی کو لوگ فار گرانٹڈ لیتے تھے۔ادھار لے کر فکس ڈیٹ پر نا دیتے،تو وہ مانگنے نہیں جاتی تھی۔

اور جو لے کر بھول جاتے تھے وہ تو انہیں بھی کچھ نہیں کہتی تھی۔ردا ان عادتوں پر جل بھن کر اسے بہت سناتی تھی اور وہ اسکے دوست ہونے کی وجہ سے ہنس کر یہ سب سن لیتی تھی۔اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا کہ دو گھنٹے بعد ماریہ معذرت کرتے کہنے لگی۔"یار سلینڈر ختم ہو گیا ہے سوری وہ مجھے بھوک لگ رہی تھی تو اپنے لیے چاول بنا لیے تھے چاولوں میں ابھی پانی رہ گیا تھا کہ سلینڈر ختم۔۔" مریم نے بنا کچھ کہے سلینڈر لے کر رکھ دیا تھا۔جب کہ ردا اونچی آواز میں بولی۔

"پیاری ماریہ ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہمارے گیس نے آپکو بیچ راستے دغا دے دی اگلی بار ہم پورا گیس فل کرا کے آپکو دیں گے تاکہ آپ کو تنگی نہ ہو۔" ماریہ گڑبڑا گئی تھی۔

"کوئی بات نہیں ماریہ۔۔" مریم نے مسکرا کر ماریہ کو دیکھا،جو ہولے سے کھسک لی۔

"دیکھ لیا آپ نے بلوچ صاحب۔لوگ ایسے ہی بے غیرت اور بے شرم ہوتے ہیں۔" ردا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ یا تو ماریہ کے ہاتھ توڑ کر آئے یا مریم کو کہیں اٹھا مارے۔یار کیا ضروری ہے کہ بندہ بے وقوفی کی حد تک اچھا اور بامروت ہو۔اگر جو کبھی ردا کو ایسا ہونا پڑتا تو اسکی یقیناً سانسیں بند ہو جاتی تھیں۔

مریم نے ٹیبل پر رکھے اپنے چائے کے برتن کو دیکھا۔جہاں پتی اب رنگ چھوڑ رہی تھی۔وہ خاموشی سے اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔چائے کی طلب تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی اور گیس ختم تھا۔اس وقت تو ہاسٹل کا کچن بھی بند

ہونا تھا۔ ردا کو پتہ تھا اب وہ صبح ہی چائے پی سکتی تھی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے پاؤں میں چپل ڈالتے باہر چلی گئی اور تھوڑی دیر میں جب واپس آئی تو اسکے ہاتھ میں ایک سلینڈر تھا۔ بنا بولے اس نے مریم کی چائے بنائی اور اسکے آگے تقریباً پٹخنے کے انداز میں مگ رکھتی پلٹ گئی تھی۔ مریم مسکراہٹ دبائے اسے دیکھتی رہی۔ اسکی دوست کو پتہ تھا کہ اسے چائے کی شدید طلب تھی لیکن کسی سے سلینڈر مانگنا بھی اسکے لیے ناممکن تھا۔ لیکن ردا کے تو باقی لڑکیوں کی طرح ادھار چلتے رہتے تھے۔ ردا سامان کو جگہ پر رکھتے دوبارہ سلینڈر کمرے سے اٹھائے باہر جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

ان کے پیپرز ختم ہوئے دو دن ہو چکے تھے۔ سب لڑکیاں گھر جانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ جن کے پہلے ختم ہو گئے تھے وہ جا چکی تھیں۔ موسم کی پرندوں کی طرح سب اڑتی جا رہی تھیں۔ مریم بھی انہی تیاریوں میں تھی۔

لیکن انگلش ڈیپارٹمنٹ کی حسنہ جس کا پہلا سمسٹر تھا اور اسے دیکھ کر میلے سے کھوئی ہوئی بچی کا گمان آتا تھا تو اس کی ابھی دوستیں نہیں بنی تھیں۔ نہیں بنی تھیں تو کیا ہوا؟ مریم عالم تھی تو سہی ٹوینٹی فور آرز اویل ایبل سروس۔۔ یعنی جو مدد دوست کرتے ہیں وہ مدد اسکی مریم عالم کر دیتی تھی۔

تو اسکا آخری پیپر رہتا تھا اور اس بے چاری کے پاس پیپر میں لکھنے کے لیے مواد نہیں تھا۔ وہ مریم کے پاس آئی تھی اور مریم جو گھر کے لیے سامان باندھے بیٹھی تھی، بے بسی سے اسے دیکھا۔ اسے گھر والوں کی بہت یاد آئی ہوئی تھی۔ وہ تو پیپر دے کے بس بھاگنا چاہتی تھی یہاں سے۔ اور حسنہ نہ سننے کے خوف سے آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ "پلیز مریم۔۔" اور اسکا دل پسیج گیا تھا۔ زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لا کے اس نے حسنہ کو تسلی دی تھی۔ پھر اس کے لیے لائبریری کے چکر اور اسکے لیے شارٹ نوٹس بنانا اور ساتھ بیٹھ کے سمجھانا۔ ردا تو شدید غصے میں تھی۔

"دو دن میں اس سے ٹاپ کروا لوگی کیا؟ نالائق لڑکی۔۔ عین ٹائم پر اسے یاد آیا کہ اس کے آخری پیپر کی تیاری نہیں ہے۔ وہ اس لیے ریلیکس ہو گی اسے پتہ تھا یہاں ایک بے وقوفی کی حد تک رحم دل ملکہ رہتی ہے جو آخری منٹ پر بھی اسکی مدد کرنے کو تیار ہو گی۔"

"تو تمہیں کیوں غصہ آرہا ہے۔ تمہاری بھی تو کرتی ہوں سب کی کرتی ہوں۔"

"دفع ہو جاؤ اپنی اس چہیتی کے پاس۔ یہ تم اس روم میں سونے ہی کیوں آئی دو دن۔۔ اسی کے کمرے میں رہتی نا چوبیس گھنٹے پڑھاتی اسے تا کہ وہ ٹاپ کرتی۔۔" ردا تو جلی بھنی بیٹھی تھی۔ "مجھے نہیں پتا تھا مجھ سے زیادہ نالائق بھی اس دنیا میں پائے جاتے ہیں جنہیں سرے سے ہی پیپرز کا کچھ آئیڈیا ہی نہیں ہوتا۔ پورے چھ ماہ کلاس میں جھک مارتی رہی تھی۔ اور حد تو یہ کہ سارے پیپرز تو جیسے تیسے دے دیے بس آخری پیپر ہی گلی کی ہڈی بن گیا۔ بی بی آپ یہ پیپر بھی دے آتیں۔"

"اس کے کچھ فیملی پرابلم کی وجہ سے وہ زیادہ تیاری نہیں کر پائی تھی اس سبجیکٹ کی۔۔" مریم نے ردا کو سرزنش کی تھی جیسے۔۔

"اچھا کونسا سبجیکٹ ہے؟" مریم نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔ "جو بھی۔۔ اس سے نہیں ہوا۔ تمہیں کیا مسئلہ ہے؟"

"حسنہ پریشان تو یوں نظر آرہی تھی جیسے اٹامک سائنس کی سٹوڈنٹ ہو۔" مریم کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

مریم عالم بھی تو جب مدد کرتی تو اگلے کے کرنے کے لیے کوئی کام نہ چھوڑتی۔ ہر کام مکمل کر کے دیتی تھی۔ رات وہ اسکے لیے لائبریری سے لائی دو بکس سے نوٹس بناتی رہی۔ اب جا کر بکس بھی واپس کرنی تھیں اور نوٹس بھی فوٹو کاپی کرا کے اپنے پاس رکھنے تھے۔ کہ پھر کبھی کسی کو مدد کی ضرورت پڑے۔ اسکی تیاریوں کو دیکھ کر ردا طنز کی بوچھاڑ کیے جا رہی تھی۔

اور مریم یوں مسکرا کر سن رہی تھی جیسے اسکی تعریف کی جا رہی ہو۔ اور ہر دوسرے جملے کے بعد وہ پلٹ کر ردا کے آگے ہلکا سا شکریے کے لیے سر جھکاتی تو اسے اور آگ لگ جاتی اور وہ سپیڈ پکڑ لیتی تھی۔ "شکریہ۔۔ عین نوازش۔۔ العارض۔۔" ردا نے ایک بار پھر سپیڈ پکڑ لی تھی۔ "ڈھیٹ عورت، بے وقوف۔۔"

"یار میری رحم دلی کو میری بے وقوفی نہ کہو۔ بس میرا دل نہیں چاہتا کوئی مجھ تک مدد کے لیے آئے اور میں اسے انکار کر دوں۔"

"ہاں تو نہ کیا کرو۔لیکن آؤٹ آف دا وے جا کر کون مدد کرتا ہے کسی کی؟صرف ایک بیوقوف۔۔"

مریم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔پھرردا کو خدا حافظ کہتے وہ باہر آ گئی تھی۔راستے میں اسے بلوچ سسٹرز مل گئی تھیں نیناں اور ناز،دونوں اسی نام سے مشہور تھیں۔وہ اس سے جونیئر تھیں۔ان کے پہلے سمسٹر کے پیپرز ہوئے تھے جب کہ مریم تھرڈ سمسٹر میں تھی۔" کہاں جا رہی ہیں؟"

"بس یہیں لائبریری تک۔"اور لائبریری کوئی یہ سامنے نہیں کھڑی تھی۔ذرا دور تھی ان کے ہاسٹل سے۔"تم لوگ بتاؤ پیپرز کیسے ہوئے؟"

"بہت اچھے۔آپکے؟"

"میرے بھی اچھے ہوئے۔"وہ ہنسی۔یہ بھی سب کو پتہ تھا ٹاپ اسی نے کرنا تھا۔وہ لوگ ہلکی پھلکی باتیں کرتے ہاسٹل گیٹ سے باہر آ گئی تھیں۔

گیٹ کے سامنے ہی ایک بلیک کلر کی فور بائے فور کھڑی تھی۔جس کی فرنٹ سیٹ پر میر حاشر تھا اور ڈرائیونگ سائیڈ پر میر جاذب تھا۔مریم نے ایک ہی نگاہ میں انہیں پہچان لیا تھا۔اور پہچان تو انہوں نے بھی لیا تھا۔مریم نظر پھیر کر دونوں بہنوں کو خدا حافظ بولتی آگے چلی گئی تھی۔دونوں بہنوں کے بیٹھتے ہی جاذب نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

" کون تھی یہ لڑکی؟"جاذب نے ہی پوچھا۔میر حاشر کو بھی تجسس تھا کہ آخر وہ کون تھی اور انکی مددکیوں کی تھی۔لیکن جاذب تیز رفتار تھا۔"مریم عالم۔ہماری سنئیر اور ٹاپر۔"نیناں نے مسکرا کر جواب دیا۔"اور پتہ ہے وہ بھی بلوچ ہے اور ان کے گھر میں بھی بلوچکی (بلوچی) بولی جاتی ہے۔"ناز نے آگے ہو کر بتایا۔میر حاشر کی نظر سامنے جاتی مریم پر تھی۔جو فون کان سے لگائے ہوئے تھی۔پھر ان کی گاڑی اس کے قریب سے گزر کر دور ہوتی گئی۔

میر حاشر پرسوچ نگاہوں سے مرر پر نظریں جمائے اسکے عکس کو دیکھ رہا تھا۔جواب ہنسی چھپانے کو منہ پر ہاتھ رکھ رہی تھی۔اور جاذب نے بہنوں سے اسکی معلومات نکلوانا شروع کر دی تھی۔انہیں ذرا بھی شک نہیں ہوا کہ بھائی ان سے کچھ اگلوا رہے ہیں۔

بھئی جب بندے کو زیادہ بولنے کی عادت ہو تو اسے لگتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے بول رہا ہے جب کہ سامنے والا اسے بولنے پر اکسا رہا ہوتا ہے اور اپنی مرضی کی معلومات لے رہا ہوتا ہے اور نیناں ناز جیسے بھولے بچے سمجھتے ہیں کہ ہم نے پوچھے بغیر سب بتا دیا۔" پورے ہاسٹل کی ایدھی ہیں۔ جہاں کوئی کسی کے کام نہیں آتا وہاں مریم عالم زندہ باد۔ سچی اڈا کیا بتاؤں اتنی خوش اخلاق ہیں اور نرم دل۔۔" وہ اسکی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں۔" نا، تو ان کے منہ میں ہے ہی نہیں۔ آؤٹ آف داوے جا کر ہیلپ کرنا پڑے، کرتی ہیں۔۔"

" مثلاً؟" جاذب نے ہی سوال کیا۔" ہم تو تب نہیں تھیں ہاسٹل میں لیکن ہماری ایک روم میٹ بتاتی ہیں کہ ایک بار ایک لڑکی کی بہن کی شادی کا مسئلہ تھا۔ وہ رو رہی تھی کہ ان کے پاس پیسے پورے نہیں ہو رہے تھے وہ ورکنگ لیڈی تھی تو مریم نے اپنی سونے کی بریسلٹ اتار کر اسے دے دی تھی۔۔ ایسے ہی ہاسٹل میں جس بندے سے پوچھو تقریباً سب کی ہی مدد کر چکی ہونگی۔ آج بھی یہی تھا۔ ہمارے ساتھ والے روم میں انگلش ڈیپارٹمنٹ والی حسنہ کو آخری پیپر نہیں آتا تھا مطلب اسے کوئی آئیڈیا بھی نہیں تھا اور مریم نے اپنا سامان رکھ دیا۔ وہ گھر جا رہی تھیں۔ پھر دن رات لگ کے اس کے لیے شارٹ نوٹس بنائے کہ وہ پیپر سے نکل آئے۔"

" تو نیکی کی دیوی نے نیکی کر کے اشتہار بھی لگایا یعنی پورے ہاسٹل کو بتاتی ہیں دیکھو آج یہ نیکی کی۔" میر حاشر نے سرسری تبصرہ کیا۔

" نہیں اڈّا انہوں نے نہیں بتایا۔ وہ تو حسنہ ساتھ والے روم میں رہتی ہے تو اس نے خود ہمیں بتایا۔ اب بھی وہ لائبریری جا رہی تھی بکس واپس کرنے۔ حسنہ سے کہا تم بیٹھ کے پڑھتی رہو ٹائم ویسٹ نہ کرو۔ میں خود بکس دے آتی ہوں۔" ناز ناراضگی سے گویا ہوئی۔

" اتنا پیسا کہاں سے لاتی ہے؟ جو یوں لٹاتی ہے؟" اب یہ مدد تو ایک طرح سے اخلاقی تھی لیکن میر حاشر حقیقتاً جاننا چاہتا تھا کہ اس لڑکی کے پس اتنا پیسہ کہاں سے آتا تھا کہ وہ دل کھول کے چیریٹی کرتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ مشکوک حرکت تھی۔

" اڈّا وہ اچھے گھر کی لڑکی ہے۔" اس کی دونوں بہنوں نے ناراضگی سے بھائی کو دیکھا۔" اور ویسے بھی مدد صرف پیسے سے نہیں ہوتی۔۔ وہ اخلاقی طور پر بھی کسی کو مشکل میں اکیلا نہیں چھوڑتی ہیں۔"

" ٹھیک ہے بہت ہوا مریم نامہ۔اب اپنی باتیں کرو۔" جاذب نے گردن موڑ کر بھائی کو دیکھا۔جو سنجیدہ نظروں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔

" ٹھیک کہا تم نے ایسے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں جو مشکل وقت میں کسی کی مدد کریں۔" جاذب نے بھائی کو جتایا تھا جیسے۔میر حاشر نے گردن موڑ کر اپنی سنجیدہ نظریں اس پر ٹکائیں تو جاذب نے گڑبڑا کر رخ سامنے کر لیا۔بادشاہ سلامت نے جب کہا تھا کہ مریم نامہ بند کرو تو پھر بند ہونا چاہیئے تھا۔ایک تو بڑا بھائی اور وہ بھی سردار۔جب حاشر اچھے موڈ میں ہوتا تو جاذب کہہ دیتا۔

" اڈا آپ جب سنجیدہ چہرے کے ساتھ شاہانہ حکم نامہ جاری کرتے ہیں۔تو بندہ ڈر میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ نہ مانا تو کہیں سر ہی قلم نہ کروا دے۔" سب کو پتہ تھا اسکی بات وہ غصے میں کہے یا آرام سے،وہ حرفِ آخر ہے۔بہنیں تو اب دوسرے موضوع کو شروع کر چکی تھیں۔لیکن جاذب نے غلطی کر دی تھی۔اس لیے بھائی کی گھوری سے دماغ واپس جگہ پر آ گیا تھا۔

علی فون پر اسکی منتیں کیے جا رہا تھا۔" اچھا دیکھو وہ فلاں برینڈ کی شرٹ لازمی ہو۔بہن نہیں ہو میری۔۔اور وہ پرفیوم۔۔اور۔۔"

" میرے باپ کی فیکٹریاں نہیں لگی ہیں یہاں۔اتنی مہنگی چیزیں بتا رہے ہو۔۔"

" بھوکی پچھلی بار جب آئی تھی تو ابو نے کتنے پیسے دیے تھے۔۔"

" ہاں تو سارے تم پر لٹا دوں۔"

" پورے جہان پر لٹاتی ہو بھائی کو ترسا رہی ہو۔ظالم مریم۔۔"

وہ دانت پیستے گویا ہوا۔پھر یاد آیا اپنا ہی کام تھا تو فوراً ہی تصحیح کی۔" میری پیاری بہن مریم۔۔" مریم نے اسکی بات پر چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔" کچھ میں خرچ کر چکی ہوں۔اب جتنے ہیں اتنے میں جو آیا،لے آؤنگی۔"

" کاش کہ میں خود آ سکتا۔ابو نے مجھ پر پھر سے پابندیاں لگا دی ہیں۔۔" وہ جیسے رو دینے کو ہوا۔

" پھر کوئی تمہارا لوفر دوست دروازے پر آیا ہوگا۔" وہ ہنسی۔

" ان کمینوں کو بھی کتنی بار سمجھایا ہے کہ۔۔"

مریم نے کان سے ہٹا کر فون کو گھورا۔" ابو کو بتا دونگی گالی دیتے ہو۔۔" اب کے علی نے فون کو کان سے ہٹا کے گھورا۔" چڑیل۔۔یہ تو گالی نہیں ہے نا۔" وہ چبا چبا کے بولا۔

" ہاں جیسے گدھا اور گھوڑا گالی نہیں ہوتی۔"

" ہاں جیسے بندریا گالی نہیں ہوتی۔۔"

" ٹھیک ہے اس بار خود آ کے اپنا سب برانڈڈ سامان لے جانا۔" مریم نے ناک سکوڑی۔ پتہ تھا ابو نے بین لگایا ہوا تھا تو مطلب وہ اسے لینے آنے کے بہانے بھی گھر سے نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ ابو کے بقول میری بیٹی بہت پر اعتماد ہے وہ اکیلے سفر کر سکتی ہے۔اور پھر اسکی منمناہٹ کے ابو جی آپ کیسے بلوچ ہیں بیٹی دوسرے شہر کا اکیلے سفر کر کے آئے کوئی اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔۔جیسی منمناہٹ کا ابو جی پھر بہت اچھے سے گلا گھونٹتے تھے۔اور پھر امی درمیان میں آ کر اسکی نازک عزت بچاتی تھیں۔نازک اس لیے کہ گھر میں سب سے چھوٹا ہونے پر اسکی عزت جالی کے کپڑے جیسی پتلی تھی۔تھی بھی اور نہیں بھی۔اور وہ کڑھتا خدا دشمن کو بھی آخری اولاد نہ بنائے پتہ نہیں کونسے چھوٹے لاڈلے ہوتے ہیں۔وہ تو بڑا ہی ذلیل ہوتا تھا۔مریم شکر کرتی تھی کہ وہ اس سے ایک سال پہلے آ گئی تھی ورنہ اسکی عزت بھی اتنی ہی نازک ہوتی۔ذرا ذرا سی بات پر اتر جاتی۔اور پھر فوراً ہی نیچے گری ناک اٹھا کہ چہرے پر سجانی پڑتی۔نہیں تو میری تو بے عزتی نہیں ہوئی۔۔یقیناً آپکی آنکھوں، کانوں کو دھوکہ ہوا ہے۔میری عزت محفوظ ہے۔

علی کو پتہ تھا یہ محض دھمکی تھی کہ وہ کچھ نہیں لائے گی۔وہ اسکے کہے سامان کے لیے ابو سے اور پیسے بھی منگوا سکتی تھی۔یار یہ بیٹیاں ابو کی دولت لوٹنے کے لیے پیدا ہوتی ہیں۔ڈاکو کہیں کی۔۔خیر ایسے وقت علی کو بہن کے لاڈلا ہونے پر قطعاً اعتراض نہیں ہوتا تھا۔آپ ہی بتائیں کیا ہونا چاہیئے تھا؟

☆......☆......☆

گھر آتے ہوئے وہ لیپ ٹاپ ہاسٹل میں ہی چھوڑ آتی تھی جو کہ اکثر ردا کے پاس ہوتا تھا اور وہ اس وقت بھی یہی کہتی یار مجھے دیتی جاؤ میں اکیلے ایسے بور ہوتی رہونگی۔

کیونکہ وہ جب سے ہاسٹل آئی تھی بس دو بار اپنے گھر گئی تھی۔وہ گھر نہیں جاتی تھی۔ہاں جب عید وغیرہ کی

چھٹیاں ہوتی تھیں تب اسے ہاسٹل چھوڑنا پڑتا تھا۔مریم کا لیپ ٹاپ بس نام کا اس کا تھا۔پھر ویسے بھی اسے کم ہی ضرورت پڑتی تھی وہ زیادہ کام موبائل پر کر لیتی تھی۔

" کوئی نہیں یار۔۔گھر ویسے بھی علی کا لیپ ٹاپ ہے ضرورت پڑی تو اسکا لے لوں گی۔" بھولی مریم بس ایک بے چارگی بھرے جملے کی ماری تھی۔کوئی اتنا نرم دل کیسے ہو سکتا ہے۔نہیں ہونا چاہیئے۔نقصان دہ ہوتا ہے اتنا اچھا ہونا۔

وہ علی اور امی کے لیے شاپنگ کر آئی تھی آج شام کو اسکی بہاولپور کی ٹکٹ تھی۔بلآخر وہ گھر پہنچ گئی تھی۔"ہائے امی آپکی اتنی یاد آرہی تھی۔۔" وہ امی کو زور سے گلے لگائے ہوئے تھی۔امی اسکی بات پر ہنسیں۔" تمہارے ابو کا شوق نہ ہوتا تو میں کبھی تمہیں اتنی دور پڑھنے نہ بھیجتی جیسے یہاں یونیورسٹی نہ ہو۔" امی نے ہمیشہ والا گلہ دہرایا۔" بیاہی بیٹیوں کی طرح تمہارا بھی میکے آنے کا انتظار کرو۔"

علی تو اسکے جاتے ہی ہائے ہیلو کے بعد اسکا بیگ لیے اسکے کمرے میں کھسک گیا تھا۔وہ سب سے مل کر جب اپنے کمرے میں آرام کرنے پہنچی تو علی پورے سامان کو بیڈ پر نکال کر اسے چیک کر چکا تھا۔اب شرٹس اٹھا اٹھا کر آئینے کے سامنے جا کر اسے دیکھتا۔" یہ کونسا کلر اٹھا لائی ہو؟"

" کیوں نظر نہیں آرہا کونسا کلر ہے؟" اس نے غصے سے بیڈ پر پھیلے سامان کو اپنے ہاتھوں سے ایک طرف کر کے بیڈ سے نیچے پھینک دیا۔" اپنا سامان لیتے جاؤ۔میں سو رہی ہوں اب نہ اٹھانا۔۔" وہ کوئی اتنی سگھڑ بچی نہیں تھی کہ اتنی تھکن میں پہلے سامان سمیٹ کے رکھتی۔اسے پتہ تھا امی یا بھابھی آکے اسکے اٹھنے سے پہلے ہی سامان سمیٹ لیں گی کمرہ پھر سے صاف ستھرا ملے گا۔علی جو اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا اسے سوتا دیکھ اپنا سامان سمیٹ کے باہر آگیا تھا۔

" امی ابھی میرا بہت سا کام رہتا ہے۔کل چلی جاؤں گی۔" امی اور بھابھی رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔وہ کچن میں رکھی ٹیبل کے گرد رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی تھی۔

" تمہارا ماسٹرز ختم ہو تو جان چھوٹے۔میں ترس گئی ہوں اپنی اولاد کو دیکھنے کے لیے۔ایک جرمنی بیٹھا ہے تو ایک یہ بس چند دن کے لیے شکل دکھاتی ہے۔" امی اچھی خاصی ایموشنل ہو گئی تھیں۔مریم جلدی سے اٹھ کر

امی کے پاس گئی اور انہیں گلے لگایا۔ "یار امی کیا ہو گیا ہے۔۔ میرا بس اب ایک سمسٹر رہ گیا ہے۔ میں پھر یہیں آپکے پاس ہی رہونگی۔ اور بھائی کی اب، جاب جو ہے وہاں، کیا کر سکتے ہیں۔۔"

"ہاں یہاں تو کسی کو نوکری ملتی نہیں ہے۔۔" مریم نے اشاروں میں بھابھی سے پوچھا ماجرا کیا ہے۔

"عاطف کہہ رہے ہیں کہ فیملی سیٹل کرنی ہے وہاں۔" امی کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ انہیں اپنی چاروں اولادیں بہت پیاری تھیں۔ بڑے بھائی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتے تھے پھر وہاں سے بیلجیئم پوسٹنگ ہو گئی تھی۔ بھابھی کو وہاں رہنا پسند نہیں تھا۔ تو وہ بچوں کو لے کے کچھ عرصے کے لیے وہاں جاتی تھیں پھر واپس آجاتی تھیں۔

امی ایک تو بیٹے کی جدائی اور اب ممکنہ طور پر پوتوں کی جدائی پر اتنی ایموشنل ہو رہی تھیں۔ علی بھی اسی وجہ سے یہیں کالج میں پڑھ رہا تھا کہ گھر میں ایک اولاد تو ہو۔ یہ تو شکر تھا کہ آپی کی شادی اسی شہر میں ہوئی تھی اور انہیں تین چار دن سے اوپر ہوتے امی رونے لگ جاتیں۔ میری اولاد کو میری پرواہ ہی نہیں کہ ماں کے لیے وقت نکالے۔ وہ سب لوگ شروع سے ایک ساتھ رہے تھے۔ آپی کی گریجویشن کے بعد ہونے والی شادی تو ایسے ثابت ہوئی، کہ جیسے تسبیح کے دانے بکھرے ہوں۔ اسکے بعد عاطف بھائی بیلجیئم چلے گئے تھے۔ ابو نے اسکا داخلہ اسلام آباد کروا دیا تھا۔

یکے بعد دیگرے سب اولادوں کا جانا۔ ویسے آج کل کے ماں باپ اب ان چیزوں کے عادی ہیں جیسے ابو تھے لیکن امی اس صورت حال کو قبول نہیں کر پا رہی تھیں۔ وہ اس وقت کو یاد کرتی تھیں جب انکا پورا خاندان اپنی ڈائننگ ٹیبل کے گرد اکٹھا ہوتا تھا۔ ہنسی، مذاق، قہقہے۔۔ خوبصورت اور قیمتی لمحات۔۔

اور دیکھا جاتا تو انہیں دراصل اپنے بیٹے کی یاد زیادہ آتی تھی جو میلوں دور تھا۔ حالانکہ وہ ہر دوسرے تیسرے دن سب گھر والوں سے ویڈیو کال پر بات کرتا تھا تو ایک حد تک کمی پوری ہو جاتی تھی۔ لیکن وہ امی تھیں۔ اور وہ پھر بھی بیٹے کو مس کرتی تھیں۔ بھابھی اور مریم نے اپنی باتوں سے انہیں اس ایموشنل فیز سے نکالا تھا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ اپنے شوہر کے پاس۔ میری طرف سے کوئی منع نہیں ہے لیکن بچے میرے پاس چھوڑ

جاؤ۔میں اپنے پوتوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" بھابھی نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔"امی۔۔" مریم نے امی کے کندھے پر بازو پھیلایا۔" بھابھی بچوں کے بغیر کیسے رہیں گی۔"

"تو شفٹ نہ ہو ہمیشہ کی طرح کچھ دن رہ کے آجانا۔" مریم نے بھابھی کو دیکھ کے کندھے اچکائے۔یہ ساس بہو کا مسئلہ تھا جسے ابو بھی نہیں سلجھا پائے تھے۔تو مریم کس کھیت کی مولی تھی۔"امی آپی کب آرہی ہیں۔جب سے میں آئی ہوں ایک بار نہیں آئیں۔" اپنی طرف سے مریم نے ان کا دھیان بٹانا چاہا۔

"اسے اپنے گھر سے فرصت ملے،تو سوچ کہ بوڑھے ماں باپ ہیں جوان کے لیے راہ تکتے ہیں۔پتہ نہیں کونسی لڑکیاں میکے کی شیدائی ہوتی ہیں۔ایک میری اولاد ہے ذرا جو انہیں ماں کی یاد آئے۔ہفتوں پروا نہیں کرتی۔۔"

"امی۔۔بڑھاپے کی بات رہنے دیں۔آپ کو بھی پتہ ہے آپ اچھی خاصی جوان ہیں۔اور یہ امیاں ایموشنل ہو کے بات کو اتنا ایگزیجوریٹ کیوں کر دیتی ہیں۔آپ کی باتیں سن کے ایسے لگ رہا ہے جیسے آپ کو سب سے نالائق اولاد ملی ہو۔اور ہفتوں کا رہنے دیں جیسے مجھے پتہ نہ ہو،نا۔۔اگر جو واقعی کبھی آپی نے پورا ایک ہفتہ لگا دیا تو آپ نے طعنوں سے ان کی حالت خراب کر دینی ہے۔" بھابھی نے ہنسی چھپانے کو چہرے کا رخ موڑ لیا تھا۔

"اچھا اب تم میری ماں نہ بنو۔بڑی آئی میری غلطیاں بتانے والی۔جاؤ اپنے فرولٹس ختم کرو۔" امی نے ڈانٹ دیا تھا۔وہ مسکراتی ہوئی واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تھی۔

"بھابھی جونیئر پارٹی کہاں ہے؟" وہ تھوڑی دیر پہلے سو کر اٹھی تھی۔" مسجد گئے ہیں قرآن پڑھنے۔علی جب نماز کے لیے جاتا ہے ساتھ لے جاتا ہے۔"

وہ علی کا سن کے ہنسی۔یقیناً اس بار ابو نے زیادہ کر دی تھی۔اس لیے ریگولر مسجد جا رہا تھا۔کیونکہ ابو کی ہدایت تھی کہ پانچوں وقت کی نماز مسجد میں ادا کرے وہ۔آگے پیچھے تو وہ یہاں وہاں نکل جاتا تھا۔لیکن جب ابو کے ہاتھ لگتا،تو وہ سب قضاء [] نمازیں بھی ادا کرواتے تھے۔تو مطلب اس وقت گھر کے سب مرد مسجد گئے ہوئے تھے۔پھر جب وہ لوگ واپس آئے تو ٹیبل لگا دی گئی۔ہنستے مسکراتے ماحول میں کھانا کھایا جا رہا

تھا۔اسکے بھتیجے مسلسل بولے جا رہے تھے۔مریم نوٹ کر رہی تھی سب بولنے میں حصہ لے تھے علی منہ بنائے بیٹھا تھا۔مریم نے اشارے میں پوچھا۔اس نے ابو کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔اس نے سمجھ کر سر ہلایا۔ابو سربراہی کرسی پر بیٹھے تھے۔

وہ عموماً کھاتے ہوئے نہیں بولتے تھے۔لیکن انکی باتوں میں ایک آدھ جملہ کہہ دیتے تھے۔

اسکے ابو قائد اعظم یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ تھے۔انکی خواہش تھی کہ ان کے بچے بھی وہاں سے پڑھیں۔آپی کی تو گریجویشن کے بعد شادی ہوگئی تھی سو وہ یہ خواب پورا نہیں کر پائی تھیں۔عاطف بھائی کو لاہور میں پڑھنا تھا سو اسکے لیے ابو نے اسکے بی ایس سی کے رزلٹ کے فوراً بعد ہی اسے سامان باندھنے کا کہہ دیا تھا۔ اور علی کو امی نہیں جانے دیتی تھیں کہ ویسے بھی گھر میں صرف وہی بچتا تھا۔

اسکے ابو بہت شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ہینڈسم، پڑھے لکھے۔سلجھے ہوئے مزاج کے مالک تھے وہ۔

"پیپر کیسے ہوئے تھے۔" ابو نے جیسے سرسری پوچھا تھا۔پتہ تھا ٹاپ ہی کرے گی وہ۔

"بہت اچھے ہوئے ہمیشہ کی طرح۔" وہ مسکرائی تھی۔"انڈوں اور ٹماٹروں کی ضرورت تو نہیں پڑے گی؟" ابو نے اسے چھیڑا۔" گھر کے لیے تو انکی ہمیشہ ہی ضرورت رہتی ہے ابو جی۔۔" وہ ہنس دیے۔

"اللہ کامیاب کرے تمہیں۔آمین۔۔" سب نے زیر لب آمین کہا تھا۔

کھانے کے بعد نماز پڑھ کر وہ علی کے کمرے میں چلی آئی تھی۔جو بیڈ پر بیٹھا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔اسکے گرد کتابیں تھیں۔

"واہ بھئی میرا بھائی اتنا لائق کب سے ہوگیا۔" مریم نے مسکراتے ہوئے اسکی کتابوں کو دیکھا۔اسے دیکھ کر علی نے گہری سانس لی۔اور رجسٹر ایک طرف رکھ دیا۔

"مریم کچھ کرو ابو تو مجھ پر زمین تنگ کیے جا رہے ہیں۔"

"شرم کرو ابو کے لیے ایسا بولتے ہو۔۔"

"جس دن سے میرے دوست آئے تھے دروازے پر۔اس دن سے ابو نے میری نمازوں کی نگرانی شروع کر دی ہے۔مسجد میں سب نماز پڑھ کر جا چکے ہوتے ہیں۔لیکن میری قضاء نماز چل رہی ہوتی ہے قسم سے

ٹانگوں میں درد ہو جاتا ہے۔اور تو اور میری اکیڈمی بھی ابو نے ختم کروادی ہے۔خود پڑھاتے ہیں،اور جو کالج کا سبق ہو روز یاد کروا کے اسکا ٹیسٹ لیتے ہیں۔" بس اسکے آنسو ہی نہیں چھلکے تھے ورنہ تو وہ پورا ہوا بیٹھا تھا۔مریم نے بہت کنٹرول کر کے اپنے قہقہے کو قابو کیا۔جو بس مسکراہٹ کی صورت ظاہر ہوا تھا۔

" کونسے ایسے دوست تھے جن کی وجہ سے صورتحال اتنا پیچیدہ ہوئی۔"

" کالج کے دوست ہیں۔۔"

" سچ بتاؤ بیٹا۔۔۔" مریم نے ڈیلے گھمائے۔

" دوپہر کے وقت آئے تھے مجھ سے ملنے۔ابو تو اس وقت گھر نہیں ہوتے لیکن اس دن پتہ نہیں کیسے ابو گھر آ گئے تھے اور ابو نے جا کر دروازہ کھولا۔۔۔"

" تو۔۔؟؟"

" تو دو سگریٹ پی رہے تھے۔۔"

" اوہ مائی گاڈ علی۔۔تمہارے اتنے آوارہ دوست ہیں۔۔" مریم نے ڈرامائی انداز میں کہا۔علی نے گھور کر دیکھا۔" ڈرامہ کوئین۔۔سگریٹ وہ پی رہے تھے سختی مجھ پر آ گئی۔۔"

" تو بیٹا جی دوست ہی انسان کی پہچان ہوتے ہیں۔۔" مریم نے ابو کے لہجے میں کہا تھا۔" مریم کچھ کرو۔۔اچھا باقی سب ٹھیک ہے لیکن ابو سے نہیں پڑھنا یار۔۔کام کیے بغیر سونے نہیں دیتے ہیں۔"

مریم نے اب کی بار بلا تکلف قہقہہ مارا۔" ویسے ابو آفس سے آنے کے بعد اتنا تھکے ہوئے ہوتے ہیں تمہیں کیسے پڑھاتے ہیں۔۔"

" سیم۔۔ایگزیکٹلی میں نے بھی ابو سے یہی کہا تھا کہ ابو جی آپ تھکے ہوئے ہوتے ہیں میں اکیڈمی میں پڑھ تو رہا ہوں۔لیکن نہیں،ابو کہتے یہ احساس پہلے کر لیتے باپ تھکا ہوا آتا ہے خود ہی پڑھ کر اچھا رزلٹ دے دوں۔۔"

" اسکے لیے ابو کو منع نہیں کرونگی میں۔باقی دیکھتے ہیں کیا ہو سکتا ہے۔۔"

علی کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔سب سے بڑا مسئلہ ہی تو یہی تھا۔جو نہ امی حل کر کے دے

رہی تھیں نہ مریم۔۔اسے ابو جیسے سخت استاد سے نہیں پڑھنا تھا یار۔۔

☆......☆......☆

وہ واپس ہاسٹل آچکی تھی۔ریسرچ کے لیے کافی کام رہتا تھا۔کام کے ختم ہونے کے بعد اس نے پھر گھر جانا تھا اور علی کے لیے وہ اس بار اپنی طرف سے بہت کچھ لینا چاہتی تھی۔بے چارہ آجکل دکھی آتما بنا رہتا تھا۔شاپنگ مال میں مردانہ کپڑوں کی دکان میں گھومتی وہ علی کے لیے شاپنگ کیے جا رہی تھی۔ایک جانب سے وہ شرٹس چیک کر رہی تھی جب نگاہ اٹھائی تو دوسری جانب سے میر حاشر اسکے سامنے کھڑا تھا۔وہ بھی شرٹس چیک کر رہا تھا۔

مریم منہ بناتی پھر سے اپنے کام میں لگ گئی۔ہونہہ۔۔حاشر تو پہلے ہی اسے دیکھ چکا تھا۔وہ تین شرٹس کو سلیکٹ کرتے مڑی تو حاشر نے اسے آواز دی۔"ایکسکیوزمی مریم عالم۔"

مریم نے گردن موڑ کو اسے دیکھا۔"جی؟"اس نے ابرو اٹھایا۔

"ایک منٹ رکیں۔"وہ یہ کہتا سائیڈ سے مڑ کر اس تک آیا۔اور اسکے قریب آکر کوٹ کی جیب سے اپنا والٹ نکالا۔اور پانچ پانچ ہزار کے کچھ نوٹ گن کر اسکی طرف بڑھائے۔"یہ آپکا قرض۔بہت شکریہ آپ کا کہ آپ نے ہماری مدد کی۔"مریم نے سنجیدگی سے ان نوٹوں کو دیکھا۔یہ آپکی رقم سے زیادہ ہے شکریہ کے طور پر۔۔"میر حاشر نے سنجیدگی سے نوٹ اسکی جانب بڑھائے ہوئے تھے۔

"محترم انسان۔۔میں مریم عالم ہوں۔اور مجھے راہ چلتے اپنے قرض واپس لینے کی عادت نہیں ہے۔ دوسری بات مشکل وقت میں آپکی مدد کی تھی میں نے،تو اس ناطے آپکو کچھ لحاظ کر لینا چاہیئے تھا۔قرض جیسے احسان یوں نہیں اتارے جاتے۔وضع داری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔لیکن آپ کو کیا معلوم کہ وہ کیا ہوتی ہے۔"ٹھنڈا لہجہ،سخت الفاظ اور سنجیدہ نگاہوں سے مریم نے اسے لتاڑا تھا۔وہ اسکے جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ گئی۔

میر حاشر نے کچھ کہنے کو منہ کھولا تھا لیکن پھر خاموشی سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔اس کی باتوں نے اسے چونکا دیا تھا۔اور اسکی اٹھی گردن اور اس کے لہجے کو یاد کر کے اسکے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی

تھی۔وہ دوسری جانب سے ایک اور شرٹ اٹھا کر اب ریسپشن پر کھڑی تھی۔پھر وہ بل ادا کرتی وہاں سے جا چکی تھی۔

میر حاشر پھر اپنی شاپنگ کرتا رہا لیکن پھر وہ اسکے دماغ سے نہیں نکل پا رہی تھی۔پھر وہ ایک زنانہ رسٹ واچ لیے وہاں سے باہر نکلا تھا۔شکریے کے طور پر اضافی پیسے نہیں کوئی تحفہ ہی اچھا لگتا ہے میر حاشر۔۔وہ اسکی وضع داری کی بات کو یاد کر کے پھر سے مسکرایا تھا۔پہلی ملاقات میں جتنی زہر لگی تھی۔پتہ نہیں اب کیوں نہیں لگی تھی؟ پچھلی بار ایسی باتوں نے اسے غصہ دلا دیا تھا اور اب۔۔

نیناں اور ناز کل شام کو ہاسٹل آنے والی تھیں۔پہلے اس نے سوچا کہ نیناں کے ساتھ اسکا شکریہ ادا کرے۔پھر نیناں کے سوالوں کا سوچ کر اس نے آج ہی آنے کا قصد کر لیا۔سورج ڈھلنے سے پہلے وہ اسکے ہاسٹل پہنچا۔وہاں پہنچ کر اس نے مریم عالم سے ملنے کا کہا۔ہاسٹل کی وارڈن اسے جانتی تھیں لیکن مریم سے کیوں ملنا چاہتا تھا وہ؟ وہ حیران تو ہوئیں لیکن پوچھا نہیں شاید اسکے عہدے کا لحاظ تھا۔

اسے ویٹنگ روم میں بٹھا دیا گیا تھا۔پانچ منٹ بعد مریم بھی آ گئی تھی۔اسے وہاں دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔آج ہی تو اسے اتنا سنا کر آئی تھی۔"جی؟"

"السلام علیکم۔"وہ اسے دیکھتا اٹھ کھڑا ہوا اور سنجیدگی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔جی؟؟"مریم نے سلام کا جواب دے کر پھر اپنی بات دہرائی تھی۔حاشر کی سنجیدگی لمحوں میں گم ہوئی تھی۔وہ ہلکا سا مسکرایا۔بہت تیکھی تھی وہ۔پھر فوراً ہی خود پر قابو پا کر اسکی طرف متوجہ ہوا۔"میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔آپ نے اس دن بے شک بنا کہے لیکن ہماری مدد کر کے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔یہ آپکی رقم جو آپ نے ہم پر خرچ کی تھی۔اور یہ شکریہ کے اظہار کے طور پر تحفہ۔۔"

اس نے رقم کا لفافہ اور ہاتھ میں پکڑا،ایک چھوٹا شاپنگ بیگ ایک ہی ہاتھ میں منتقل کر کے مریم کی جانب ہاتھ بڑھایا۔وضع داری کا طعنہ تو خوب ہی دل پر جا لگا تھا شاید۔مریم نے اس کے ہاتھ سے رقم کا لفافہ تھام لیا۔"یہ میں آپ کے لیے لایا تھا۔"حاشر نے شاپنگ بیگ کے نہ لینے پر بات دہرائی۔"بہت شکریہ لیکن مجھے

ہر کسی سے تحفے لینے کی عادت نہیں ہے۔"

"اچھی بات ہے۔لیکن میں کسی اور مقصد کے تحت نہیں بس آپکے احسان کے بدلے دے رہا تھا۔" دونوں ہی بلا کی سنجیدگی سے گفتگو کر رہے تھے۔"میں نے آپکے بنا کہے آپکی مدد کی تھی یعنی آپ کے کہنے پر نہیں۔۔سو میری مدد کوئی احسان نہیں تھی۔جس کا میں بدلہ لوں۔" وہ رقم کے لفافے کو ہاتھ میں تھامے مڑ گئی۔میر حاشر کا تحفے والا ہاتھ ویسے ہی رہا۔حاشر نے شہادت کی انگلی سے مونچھ کو چھوا۔وہ بہت نخرے والی تھی۔اور وہ اسے نڈر اور دلیر لگی تھی۔

اور وہ شاید پہلا شخص تھا جسے وہ نڈر،اور دلیر لگی تھی۔ورنہ تو کالج،یونی میں وہ نرم دل اور گھر میں ڈرپوک مشہور تھی۔وہ اسے نظروں میں رکھتے ویٹنگ روم سے باہر آ گیا تھا۔جو وہاں سے گزرتی ایک ملازمہ ٹائپ خاتون کو روکے ہوئے تھی۔بولتے ہوئے لفافے سے کچھ نوٹ نکال کر اسکے حوالے کیے پھر وہاں سے نکلتے باہر لان میں آ گئی تھی۔اور ایک مالی کو بلا کر وہ لفافہ ہی اسکے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

حاشر کو سمجھ آ گئی تھی کہ وہ اسے کیا جتا رہی تھی۔مالی خوشی میں اب اسے دعائیں دے رہا تھا۔حاشر نے ہلکے سے سر کو نفی میں ہلایا۔اسکے سامنے بنا لفافے میں موجود رقم کو گنے وہ اسے کسی اور کو دے رہی تھی۔وہ اسے جو پیغام دینا چاہتی تھی اسے مل چکا تھا۔وہ ہاسٹل کے گیٹ کے قریب جا کر ایک بار پھر مڑا جو ابھی بھی مالی سے باتیں کیے جا رہی تھی۔حاشر نے آنکھوں پر گلاسز لگا کر غور سے اسکا جائزہ لیا۔بظاہر عام سی تھی وہ۔اور دوپٹہ بھی ماتھے تک لیتی تھی یعنی سر کے بال نظر نہیں آتے تھے۔اور پھر گردن سے ذرا سا ڈھیلا ہوتا تھا۔دوپٹہ پھیلا کر لیتی تھی کسی چادر کی طرح۔۔جس میں وہ اچھی خاصی چھپ جاتی تھی۔مجموعاً وہ اپنی خوبصورتی کو چھپا کر رکھنے والی لڑکی تھی۔اور پھر بہت عام سی لگتی تھی۔میر حاشر نے اسے اب تک اسی حلیے میں ہی دیکھا تھا۔اور اس حلیے میں وہ کسی کو اٹریکٹ نہیں کر سکتی تھی سوائے اسکے۔۔آج کے دن اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔اور پھر اس فیصلے کو سوچتے وہ مڑ کر چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

"بابا جان لڑکی پسند کر لی ہے۔اس سے شادی کرنی ہے۔" اس نے بابا جان کو کال کر کے مختصر کہہ کہ کال

کاٹ دی تھی اور اگلے ہی دن بابا جان اور اماں دونوں ہی اسلام آباد میں تھے۔صبح ناشتے کے وقت وہ پہنچے تھے۔حاشر انہیں دیکھتے ہوا ہنستا ہوا،ان کے استقبال کیلیے کھڑا ہوا۔

"خوش آمدید۔بابا جان۔۔اماں جان۔"

باری باری دونوں سے گلے ملا۔وہ دونوں اس سے ملنے کے بعد اپنی اپنی کرسی گھسیٹ کر بیٹھے تھے۔"اتنی صبح صبح سب خیریت بابا جان۔۔"اس نے انہیں چھیڑا۔رات ہی تو کہا تھا اور صبح وہ یہاں تھے۔"میں نے سوچا کہیں صبح ہوتے ہی مکر نہ جاؤ اس لیے۔۔"

ہ دل کھول کر ہنسا۔"نہیں بابا جان اب یہ ممکن نہیں ہے۔"اماں نے گہری نظروں سے بیٹے کے چہرے پر پھیلی خوشی کو دیکھا۔بس انکی نند کی بیٹی کا نہ کہے۔۔

" کون ہے وہ؟"بابا جان نے آس سے پوچھا شاید انکی بھانجی کا نام لے دے۔دلِ ناداں۔۔

"مریم عالم۔۔نیناں کی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔اس سے سینئیر ہے۔"

"یاہو۔۔"اماں کے دل نے نعرہ مارا۔

بابا جان نے سر ہلا کر خود کو اس جھٹکے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔" کب سے اسے جانتے ہو۔؟ کتنا عرصہ افیئر رہا؟"

حاشر نے منہ تک لے جاتے جوس کے گلاس کو ٹیبل پر رکھا۔"بابا جان میرا کسی سے کبھی کوئی افیئر نہیں رہا اور اسے پندرہ دن پہلے سے جانتا ہوں۔" اسکی مسکراہٹ سمٹ چکی تھی۔بابا جان نے بیٹے کے موڈ کو دیکھا۔جو پھر سے سنجیدگی میں جا چکا تھا۔اماں نے باپ بیٹے کو دیکھ کر ہولے سے گلا کھنکارا۔

"لڑکی پیاری ہے؟" وہ اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن پھر بھی چھپ نہیں رہی تھی۔

"پیاری تو نہیں ہے لیکن مجھے لگتی ہے۔" اسکی بات سن کر بابا جان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔زندگی میں پہلی بار اسکے منہ سے کسی لڑکی کی تعریف سنی تھی۔" تمہیں پیاری لگنے والی سے بھی تمہاری شادی کروائیں گے۔لیکن میری بھانجی سے بھی کرنی ہوگی۔" بابا جان نے حتمی انداز میں کہا۔"میں صرف ایک شادی کروں گا وہ بھی اپنی پسند کی لڑکی سے۔اور جو لڑکی مجھے پسند ہے اتفاقِ حسن سے وہ آپکی بھانجی نہیں

ہے۔" وہ اب سکون سے ناشتہ کر رہا تھا۔

بابا جان نے غصے سے اسے گھورا۔جو اولاد سب سے زیادہ پیاری ہو عموماً وہی آپکے صبر کا امتحان لیتی ہے۔" میری بھانجی سے تمہیں مسئلہ کیا ہے۔؟"

" اچھی لڑکی ہے وہ۔مجھے اس سے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ بس بیوی کے لیے اچھی نہیں لگتی۔"

" تم سے لاکھ گنا اچھی ہے۔" وہ زچ ہو کر زنانہ انداز میں اسے لتاڑنے لگے۔" اس لیے تو نہیں پسند۔ میاں بیوی کا لیول برابر ہونا چاہیئے۔" وہ ڈھیٹ ترین انسان تھا۔اماں مزے سے انہیں سنتے ہوئے اب ناشتے سے انصاف کر رہی تھیں۔اس دوران ایک آدھ محبت بھری نگاہ بیٹے پر بھی ڈال لیتیں۔جانتی تھیں دنیا پر رعب جمانے والے میر سراج بیٹے کو حکم نہیں دیتے تھے۔نہ کوئی قسم دیتے نہ کچھ بس بات منوانے کی کوشش کرتے۔اور وہ بھی فرمانبردار بیٹا اس معاملے پر آکے اڑیل گھوڑے کی مانند اڑ جاتا۔

باپ کہتا میں نے جو کہا وہ مانو۔اور بیٹا کہتا جو میں نے کہہ دیا وہ مانیں۔اس سب کا،سب سے زیادہ کسی کو فائدہ تھا تو وہ بس انہی کو تھا کہ وہ تنی گردن کے ساتھ نند کے سامنے بیٹھتی تھیں۔اور نند صرف بیٹی کی وجہ سے بھابھی کے غرور بھرے انداز پر کچھ نہیں کہتی تھیں۔آہ۔۔زندگی کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

آپ سمجھ رہے ہونگے کہ پھپھو کوئی بہت ہی اچھی خاتون تھیں تو آپ غلط ہیں۔ہاجرہ (حاشر کی اماں) کی شادی کے چار ماہ بعد وہ ان کے لیے سوتن لے آئی تھیں۔یہ بات انکے لیے دھچکا تھی کیونکہ انکے شوہر نے انہیں پسند کر کے ان سے شادی کی تھی۔لیکن شادی کے بس چار ماہ بعد ہی شوہر کی دوسری شادی نے انھیں بہت بڑا دھچکا دیا تھا۔اور وہ یہ بات کبھی نہیں بھول سکتی تھیں کہ یہ شادی انکی نند نے بڑی کوششوں سے اپنی خالہ زاد کے ساتھ طے کروائی تھی۔اگر پہلی شادی کو چند سال گزرنے کے بعد وہ دوسری شادی کرتے تو شاید اتنا دکھ نہ ہوتا۔بس چار ماہ،اور صنم بے وفا نکلا تھا۔پھر جب حاشر پیدا ہوا،تو دو ماہ کے فرق سے اسکا سوتیلا بھائی پیدا ہوا تھا۔حاجرہ کو اگر کوئی بات اپنی خوش بختی لگتی تھی تو بس یہی کہ انکے بیٹے سے میر سراج ٹوٹ کے محبت کرتے تھے۔

وہ خود کو خوش نصیب سمجھتی تھیں کہ انکا بیٹا سوتن کے بیٹے سے پہلے پیدا ہوا تھا۔وہ پہلا بیٹا تھا اور وہ وارث تھا۔اب پوری دنیا بھی سر پٹخ لیتی وہ مستقبل کے سردار کی ماں بن چکی تھیں۔انکو اور ان کی سوتن کو شادی کے دو

سال بعد جا کہ ماں بننے کی خوش خبری ملی تھی۔خوش خبری چند دن کے فرق سے ملی تھی لیکن کچھ مسئلوں کی وجہ سے ان کے ہاں بیٹے کی پیدائش پہلے ہو گئی تھی۔بس اس دن سے وہ جان گئی تھیں۔دکھ جتنے بھی ہوں ان کا سویرا ہے۔

اور اصلی ٹھنڈ تو تب پڑی تھی کلیجے میں، جب ان کے شوہر نے تیسری شادی کی تھی۔اس دن انہوں نے جشن منایا تھا۔ناز کی ماں صدمے میں تھی کہ ان پر تو اب سوتن آئی تھی۔اس وقت بھی اماں مزے سے باپ بیٹے کو سن رہی تھیں۔

ان کا بیٹا میر سراج کی کمزوری تھا۔وہ تو چاہ کر بھی حاشر پر غصہ برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔وہ اس دنیا کا واحد انسان تھا جو انہیں اپنی جان سے بڑھ کر تھا۔اور یہ بات میر حاشر کو معلوم تھی۔سو وہ باپ بیٹا ہمیشہ کی طرح دلائل سے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔بابا جان محبت اور بے بسی سے۔حاشر نرمی اور بے نیازی سے۔وہ اسے غصہ دلا کر اس بات کو اسکی ضد نہیں بنانا چاہتے تھے۔اور وہ انہیں غصہ دلا کر انکا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔وہ اپنی اپنی طرز پر اس بازی کو کھیل رہے تھے۔جس میں زیادہ جیت کے امکان حاشر کے تھے۔" ٹھیک ہے تمہاری پسند آئے گی تو پھر میری پسند بھی آئے گی۔" بابا جان نے آخری فیصلہ سنایا۔" نہیں صرف میری ہی پسند آئی گی۔کیونکہ مجھے ایک ہی شادی کرنی ہے۔"

" اگر میری پسند نہیں تو تمہاری بھی نہیں۔"

" کوئی مسئلہ نہیں۔میں ویسے بھی شادی کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔" ڈھیٹ ابن ال ڈھیٹ۔۔

" کچھ لو اور دو کا اصول چلتا ہے دنیا میں۔میری مانو میں بھی تمہاری مانوں گا۔"

" بالکل چلتا ہے۔لیکن کیونکہ آپ میرے والد محترم ہیں اور والدین اولاد کے لیے بے غرض ہوتے ہیں سو آپ میری مانیں گے اور دنیاوی اصولوں کو بھول جائیں گے۔ایم آئی رائٹ؟" اماں نے تو باقاعدہ جھوم کر سر کو گھمایا۔شاباش میرے شیر۔۔بابا جان نے انہیں گھور کر دیکھا۔

" بہت اعلی قسم کا پراٹھا بنا ہے۔سواد آ گیا۔" انھوں نے پھر مستی میں سر کو دائیں بائیں گھمایا۔حاشر نے مسکراہٹ ضبط کرنے کو دونوں ہونٹوں کو دانتوں کے بیچ دبایا۔اماں تو بس حد ہی کرتی تھیں۔بابا جان نے سر

جھٹک کراماں سے رخ پھیرا۔ پتہ نہیں کب اس عورت کا دوسری شادی والا غصہ اترے گا۔ حاشر کو گھورا۔ کاش کے اس پر غصہ کرسکتے بلکہ غصے میں حکم دے دیتے پھر چاہے سر پٹختا رہے۔ لیکن وہ بھی تو انکی ضد کے بعد اپنی ضد بتا چکا تھا۔ بگڑی ہوئی لاڈلی اولاد۔۔ وہ بے بسی سے بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے جیسا ضدی، اڑیل تھا پتہ نہیں وہ کس پر آ کے نرم ہوتا ابھی تک تو اسے جھکانے والا کوئی نہیں تھا۔ "جب تمہارا بیٹا آئے گا تو احساس ہوگا کہ ضدی اولاد پر کیسا غصہ آتا ہے۔"

"میں بھی اس کے آنے کا انتظام کر رہا ہوں۔ لیکن آپ ہیں کہ اسے آنے ہی نہیں دے رہے۔" وہ مزے سے بولا۔ بابا جان کو بیک وقت غصہ اور ہنسی آئی۔ کیسا ضدی بیٹا پیدا کرلیا تھا۔ اماں کی خوشی کا عالم تو بیان سے باہر تھا۔ جب حاشر نے کہہ دیا تھا انکی نند کی بیٹی بہو نہیں بنے گی ،تو مطلب نہیں بنے گی۔

"مجھے ایسی کسی عورت سے شادی نہیں کرنی جس سے شادی کے بعد مجھے پھر دوسری شادی کرنی پڑے۔ یعنی کہ میں ایک ہی بار شادی کرونگا اور اپنی پسند سے کرونگا۔ تاکہ بار بار یہ جھنجھٹ نہ پالنا پڑے۔" بابا جان کے بعد اب جاذب تھا۔ جاذب اسکے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہ بھی بابا کی طرح یہی کہہ رہا تھا۔ کوئی مسئلہ نہیں اپنی پسند بھی کرلے اور بابا کی بھی مان لے۔

"یار اڈا آپ کو دوسری شادی سے کیا الرجی ہے۔ بابا جان مجھے کہیں میں تو سو جان سے پوری چار کرنے کو بھی تیار ہوں۔"

"اس لیے وہ نہیں کہتے۔"

مذاق ایک طرف اڈا بتائیں نا۔۔ آپ کو دوسری شادی سے کیا مسئلہ ہے؟"

"بابا جان کی دوسری شادی کی وجہ سے اماں کو ہمیشہ روتے دیکھا۔ ان کے دل سے یہ دکھ کبھی نہیں گیا۔ میں نہیں چاہتا کہ میں اپنی ذات سے کسی کو یہ تکلیف دوں۔ بس ایک ہی بار اچھی لڑکی لے آؤں۔" حاشر نے پہلی بار اس بات کی وجہ بتائی تھی۔ "تو پلوشہ سے کرلیں۔ اچھی تو ہے۔" جاذب نے بابا جان کی بات دہرائی۔ "میں نے کب انکار کیا کہ اچھی نہیں ہے؟ وہ بہت اچھی لڑکی ہے لیکن ضروری نہیں کہ دنیا کی ہر اچھی شے سب کو اچھی لگے۔ وہ مجھے نہیں پسند بات ختم۔۔"

"ویسے اڈّا یہ بات تو چلیں سمجھ آ گئی لیکن آپ نے کبھی کوئی گرل فرینڈ کیوں نہیں رکھی یہ سمجھ نہیں آئی۔" جاذب نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔اگر جو بڑے بھائی والا موڈ آن ہو جاتا تو خیر نہیں تھی۔"انسان ہوں جانور تو نہیں کہ ہر جگہ منہ ماروں۔" جاذب کو لگا خصوصاً اسکو سنایا تھا اڈّا نے۔

"جانور والی کیا بات۔بندہ ملتا ہے دیکھتا ہے بات کرتا ہے تو سمجھ لگتی ہے کہ کون لائف پارٹنر بنانے کے قابل ہے۔" جاذب نے جلدی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔"سریسلی؟؟" حاشر نے اسے دیکھ کر ابرو اچکایا۔

"تم بھی جانتے ہو مرد کی نگاہ کیا چیز ہے۔جو اڑتی چڑیا کے پر گننے کے دعوے رکھتے ہوں انہیں عورت کو دیکھ کہ ہی اندازہ ہو جاتا ہے کتنے پانی میں ہے وہ۔اس پہلی نگاہ میں فیصلہ ہو جاتا ہے عورت گھر لانے کے قابل ہے کہ نہیں۔لیکن جو عورت گھر لانے کے قابل نہیں لگتی مرد اس کو بھی رجھاتا ہے۔کیوں؟؟ کیونکہ وہ اپنی منہ مارنیوالی عادت سے مجبور ہوتا ہے۔وہ غرور میں یہ کہتا ہے ایسی عورتیں شادی کے قابل نہیں ہوتیں یہ بس ٹائم پاس ہیں تو در حقیقت وہ اپنی بے عزتی کر رہا ہوتا ہے۔کہ دیکھو جو میرے معیار پر پورا نہیں اترتا میں تو اسے بھی نہیں چھوڑتا۔ایسے مردوں کی مثال کتوں جیسی ہوتی ہے جو ہر جگہ منہ مارتا ہے اسے کچھ بھی مل جائے۔اسکی کوئی چوائس نہیں۔

مرد میں اور کچھ ہو نہ ہو غیرت ضرور ہونی چاہیئے کہ وہ انسان اور جانور کے فرق کو جانتا ہو۔مرد کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ہر جگہ منہ مارے صرف عورت کی کوالٹی چیک کرنے کے لیے۔اور وہ بھی تب جب وہ یہ دعوے کرتا ہو کہ عورت کی چال سے اسکا کردار معلوم ہو جاتا ہے۔جب آپ کو معلوم ہے کہ وہ آپکے معیار کی نہیں تو آپ اپنی عزت کو بلند رکھتے اسے مڑ کر بھی نہ دیکھیں۔مگر نہیں غیرت مندوں کو یہ تو بے عزتی نہیں لگتی کہ وہ انسان ہو کے جانور جیسے ہیں۔ہاں مگر یہ ضرور بے عزتی لگتی ہے کہ معلوم بھی ہو کہ عورت آپ کے معیار کی نہیں اور چھوڑ دی؟ ارے کیوں؟ کیوں جانے دیا ہاتھ سے۔۔ٹھیک ہے شادی میٹیریل نہیں چلو ٹائم پاس کر لیتے۔کیا فرق پڑتا ہے کہ جانوروں کی بھی کوئی چوائس نہیں ہوتی۔جانورں کو چاہیئے کہ طور طریقے بدلیں۔غیرت مند کبھی اپنہ رستہ نہ بدلیں گے۔۔"

جاذب کی ناک اتر کر دور جا پڑی تھی۔واہ اڈّا خوب بے عزتی کی تھی۔جاذب یہ سوال پوچھ کر پچھتا رہا

تھا۔نہیں تھی کوئی گرل فرینڈ تو نا ہوتی ۔۔اسے کیا پڑی تھی کہ بھائی کے خیالات سنتا۔خیالات نہیں بلکہ اپنی بے عزتی کرواتا۔"معاف کردیں اڈّا پھر نہیں پوچھوں گا۔"

"ہاں پھر نہ پوچھنا تاکہ سننا نہ پڑے۔لیکن جو کام کرتے شرم نہیں آتی وہ سنتے کیوں آتی ہے؟" جاذب کو اندازہ ہو چکا تھا۔اب ناک بس آپریشن کے ذریعے لگ سکتی تھی۔میر حاشر نے اسکے لگنے کی کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔"اڈّا میں آتا ہوں ذرا۔تھوڑا کام ہے۔۔"وہ ہولے سے بولتا اٹھ کھڑا ہوا۔حاشر نے افسوس سے بھائی کو دیکھا۔پتہ تھا وہ اپنی عادتیں نہیں بدل سکتا تھا۔ہر آئے دن نئی لڑکی۔۔کہ لڑکیاں تو خود آ کے پھنستی تھیں تو وہ انکار کر کے بے غیرت کیوں بنتا؟۔۔

☆......☆......☆

اتنے دن اس کے ساتھ مغز ماری کے بعد بابا جان کو معلوم ہو چکا تھا اس نے بات نہیں ماننی تھی۔پھر فیصلہ کر کے ادی زہرہ کو اسلام آباد آنے کے لیے بلاوہ بھیج دیا تھا۔

اُدھر مریم اپنا ریسرچ کا کچھ کام ختم کر کے گھر جانے کی تیاریوں میں تھی۔

بابا جان اور اماں نے کافی دنوں سے یہاں ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ناز تو آبائی گھر چلی گئی تھی۔نیناں کو اماں کے ساتھ واپس جانا تھا۔سو اسلام آباد والے گھر میں فی الحال خوب رونقیں تھیں۔وہ سب بہن بھائی تو بہت خوش تھے۔کہ اڈّا شادی کے لیے مان گئے تھے۔

ایک بابا جان ہی پریشان سے پھرتے تھے۔اور ان کا بیٹا ذرا بھی ترس نہ کھاتا کہ بابا جان سے یہ ہمدردی پلوشہ کو ساری عمر کے لیے اس کے سر باندھ سکتی تھی۔اور حاشر کے خیال سے بابا جان کے لیے ساری زندگی بیٹے کو خوش دیکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ یہ چند دن پریشانی میں گزار لیتے خیر تھی۔پھوپھو زہرہ اگلے دن آن پہنچی تھیں۔پہلے تو بابا جان نے اکیلے ان سے بند کمرے میں میٹنگ کی تھی۔وہ تو یہ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئی تھیں۔کہ حاشر نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا ہے۔

"تم نے مجھے زبان دی تھی کہ میری بیٹی تمہاری بہو بنے گی۔"

"تو میں کب انکار کر رہا ہوں میری ہی بہو بنے گی۔لیکن رقیہ اسکی ساس ہو گی۔"

" کیوں تم نے سرداری رقیہ کے بیٹے کو دی ہے؟" وہ بھڑک کر بولیں۔

"اڈی میرا دماغ خراب مت کرو۔ جو کہنا تھا کہہ دیا۔"

" تمہیں ذرا بھی اپنی زبان کا پاس ہے؟ تم نے کہا تھا کہ سردار بیٹے سے میری بیٹی بیاہو گے۔"

" ہاں کہا تھا مگر نصیب کی بات کہ پورا نہیں ہو سکتا۔" وہ افسوس سے بولے۔" کیسے بلوچ ہو جسے اپنی زبان کا پاس نہیں۔لوگ تو زبان کا پاس رکھنے کو جان تک دے دیتے ہیں۔" وہ چیخ اٹھی تھیں۔اسی وقت کمرے میں ہاجرہ داخل ہوئیں۔وہ اطمینان سے چلتے نند کے بالکل سامنے صوفے پر جا بیٹھیں۔"تو اڈی زہرہ آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپکی بیٹی کے لیے میرے شوہر یا بیٹے میں سے کسی کو مرنا ہی کیوں نا پڑے ،مر جائے۔مگر آپکی شہزادی لازمی میرے بیٹے سے ہی بیاہی جائے۔خیر ہے آپ اتنا احتجاج کر رہی ہیں۔کہیں آپکی بیٹی نے میرے بیٹے سے دل تو نہیں لگا لیا۔"

" منہ نوچ لونگی میں تمہارا۔" وہ غصے میں اٹھ کر ہاجرہ کی طرف آنے لگیں۔لیکن میر سراج نے اٹھ کر بہن کو بازو سے پکڑ کر دوبارہ بٹھایا۔" کوئی جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

" بیوی کو سمجھاؤ یہ بات۔۔" وہ تنفر سے رخ پھیر کر بولیں۔" کیا سمجھائیں گے کچھ غلط تو نہیں کہا۔" ہاجرہ بی بی کو تو زندگی اب صحیح معنوں میں موقع دے رہی تھی۔"ہاجرہ تم جاؤ۔" میر سراج نے بیوی کو گھورا۔وہ فاتحانہ نگاہوں سے نند کو دیکھتی باہر چلی گئیں تھیں۔وہ گہری سانس لیتے بہن کی طرف متوجہ ہوئے جو ابھی تک رخ پھیرے ہوئے تھیں۔

"اڈی زہرہ اب بتائیں۔میرے کس بیٹے سے آپ پلوشہ کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔؟"اڈی زہرہ نے بھائی کو دیکھا تو آنکھیں نم تھیں۔"میں مجبور ہوں اڈی حاشر مان جاتا تو مجھے اپنی بھانجی سے بڑھ کر کون تھی۔۔"

" تم حاشر کو مناتے تو مان جاتا۔حکم دیتے کوئی قسم دیتے۔ایسے مجبوری ظاہر کر رہے ہو جیسے بڑے کوئی نرم دل اور دوسروں کی ماننے والے رہے ہو۔"وہ روٹھے لہجے میں بولیں۔" آپ بھی جانتی ہیں حاشر مزاج میں مجھ سے بڑھ کر ہے۔پھر سردار وہ ہے میں نہیں۔اب اسکی کہی بات حرف آخر ہے۔"

اڈی زہرہ تو تلملا اٹھی تھیں۔ "اس لیے تم نے وقت سے پہلے اسکے سر پر پگ رکھی تھی؟"

☆......☆......☆

"سنو نیناں اس لڑکی کو یہاں بلاؤ۔" اماں نے بیٹی کے قریب بیٹھتے ہی سرگوشی کی۔ یہ اور بات کہ یہ سرگوشی سامنے والی کرسی پر بیٹھے بندے تک بھی آرام سے پہنچ جاتی تھی۔

" کیسے آئے گی وہ؟"

" کیسے کیا۔۔جیسے سب آتے ہیں ویسے۔۔" اماں کی آواز بلند ہوئی۔

"اوہو اماں۔ مطلب کیا کہوں اسے؟" دونوں ہی بھول گئیں کہ کانفیڈینشل گفتگو ہو رہی تھی۔ دونوں ہی اب سرگوشی انداز ترک کیے، نارمل بات کر رہی تھیں۔

" کہو میری اماں بلا رہی ہیں۔"

"ہاں میری بڑی پکی سہیلی ہے۔اور بچپن سے میرے گھر آتی رہی ہے۔اور میری اماں کے ساتھ اسکی خوب بنتی ہے۔میں کہوں گی میری اماں بلا رہی ہیں، وہ فٹ سے آجائے گی۔" نیناں نے اماں کی بات کا خوب ہی جواب دیا تھا۔

" آرام سے لیڈیز۔۔" پیچھے سے جاذب کی آواز آئی۔" کیوں کیا ہوا؟"۔اماں اور نیناں نے بیک وقت مڑ کر پوچھا۔وہ چلتا ہوا ان دونوں کے سامنے آبیٹھا۔"

پہلی بات ذرا دھیمے سے بات کریں۔پھپو ابھی یہیں ہیں۔اور دوسرا مریم بھابھی کو نہیں پتہ کہ وہ ہمارے بھائی کو پسند آچکی ہیں۔سو اُن پر ابھی کچھ ظاہر نہیں کرنا۔"

" کیا مطلب۔۔نہیں پتہ۔۔دونوں ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے۔۔"

"اماں۔۔" جاذب نے ماں کو دیکھا۔" جانتی تو ہیں اپنے بیٹے کو۔آج تک کبھی کسی لڑکی سے دو منٹ سے زیادہ بات کی ہے؟ مریم بھابھی سے کوئی افیئر نہیں رہا۔جب میں نے پوچھا کہ وہ بھی آپ کو پسند کرتی ہیں تو کہا۔ ناپسند کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اس میں۔اور ویسے بھی اسے نہیں پتہ کہ میں اسکے گھر رشتہ بھیجنے والا ہوں۔"

" تم اسے بھابھی کیوں کہہ رہے ہو پھر؟" اماں نے مشکوک نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔" کیوں کہ میں جانتا ہوں اب دنیا یہاں سے وہاں ہو جائے میر حاشر کی بیوی تو مریم عالم ہی بنے گی۔تو اس ناطے وہ میری بھابھی ہوئیں۔" اس نے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے۔" اب انہیں بلانا ہے تو بلالیں۔لیکن یہ بتا دوں کہ ان پر اس رشتے کی کوئی بات ظاہر نہیں کرنی۔اڈّا نے منع کیا ہے۔"

" کاش کہ میرا بیٹے کی بھی کوئی لوسٹوری ہوتی۔۔" انکی ماڈرن اماں نے حسرت ظاہر کی۔وہ دونوں ہنس دیے۔" اماں آپ ٹینشن کیوں لیتی ہیں میری ایک نہیں کئی کئی لوسٹوریز ہیں۔" جاذب نے اماں کو آنکھ ماری۔" تم تو شروع سے ہی کمینے رہے ہو۔" اماں نے نقد بے عزتی کر لی تھی۔" یہ زیادتی ہے۔بڑے بیٹے کی لوسٹوری کے لیے حسرتیں ہیں اور جو میری لوسٹوری ہے تو میں کمینہ۔۔"

" تو کیا غلط کہا وہ میرا بیٹا اتنا شریف سا ہے۔اور دیکھو تیس کا ہونیوالا ہے اور کبھی کوئی عورت نہیں آئی زندگی میں۔اس رقیہ کے پوتے پوتیاں ہیں اور میرے بیٹے کو اب آکے لڑکی ملی۔" انکی اماں ویسے بہت اچھے مزاج کی تھیں۔بچوں سے ہمیشہ دوستانہ سلوک رہا تھا۔وہ بہت مثبت سوچ کی مالک تھیں۔بچے بھی انہی پر گئے تھے۔ماں ہی گھر کا ماحول بناتی ہے۔تو وہاں اس ٹینشن والے گھر میں رہ کر ہاجرہ بی بی نے اپنے بچوں کو اپنے کمرے میں رہ کر بہت اچھے سے پالا تھا۔ورنہ انکے ہاں کا ماحول ایسا نہیں تھا۔انکی دونوں سوتنوں کے بچے اتنے کھلے دل وذہن کے مالک نہیں تھے۔

کیوں کہ انکی ماؤں نے ان کے لیے ایسا ماحول نہیں بنایا تھا۔وہ سب ایک ٹیپیکل سے ماحول کے عادی تھے۔بیٹے زور آور اور بیٹیاں ڈر کر جینے والی۔نازکی ماں کا گھر پر ہولڈ ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ تر کمرے تک رہتیں۔آفرین تھی ہاجرہ بی بی کی کہ ان کے بچے گھر میں اتنا کھلے عام نہیں پھرتے تھے۔لیکن کبھی بھی اپنی ٹینشن اور ڈپریشن کا سایہ بھی اتنی اولاد تک نہیں آنے دیا تھا۔

وہ ان کے لیے زندہ دل ماں تھیں۔اور پھر جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے گئے تو دنیا کو پتہ چلا تھا ہاجرہ بی بی نے بند کمرے میں شیر پالے تھے۔جو باپ کی طرح ضدی اور نڈر تھے۔بیٹے تو ایک طرف نیناں بھی نازکی ماں سے نہیں ڈرتی تھی۔ان کے حکم سن کر اپنی کر کے ایک طرف ہو جاتی جب وہ ہنگامہ کرتیں۔تو میر حاشر آگے آ کھڑا

ہوتا اور وہ پاگل بالکل نہیں تھیں۔ کہ مستقبل کے سردار سے پنگا لیتیں اور لے بھی لیتیں تو میر سراج ہر شے کا لحاظ ایک طرف کر کے انہیں اوقات یاد دلا دیتے۔

تو وہ تینوں بہن بھائی، اپنے سب بہن بھائیوں کی نسبت اپنے ماں باپ کے زیادہ قریب تھے۔ ان کے ایک طرح سے دوستوں کے جیسے تعلقات تھے۔

" حاشر نے اور کیا کیا کہا تھا کہ کیوں اس لڑکی کو نہیں بتانا؟" اماں نے اپنے انداز کی سرگوشی میں پوچھا یعنی سامنے بیٹھے بندے کو صاف سنائی دے جانے والی سرگوشی۔۔ "بس یہی کہ وہ شکل سے ہی شریف لگتی ہے اور شریف لڑکیوں کے فیصلے ان کے ماں باپ کرتے ہیں۔ خوامخواہ لڑکی کو اپروچ کر کے کوئی ڈرامہ نہیں چلانا۔ جب اس سے شادی کرنی ہے تو بس کرنی ہے۔" جاذب نے آدھی بات بتائی تھی۔ پوری بات میں تو اسکی اپنی بے عزتی چھپی تھی۔ کہ اس بات سے ہی تو دراصل اس دن ساری بحث شروع ہوئی تھی۔

اماں کچھ لمحے اسے مشکوک نظروں سے گھورتی رہیں۔ جاذب فوراً سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اماں مجھے لگتا ہے اڈا نے اور بھی بہت کچھ کہا ہوگا۔" نیناں بھی جاذب کو جاتا دیکھتی رہی۔ "لگ تو یہی رہا ہے۔ اچھا اب اس بات کو چھوڑو اور اب اسے بلاؤ۔ دعوت دے دو یا کہو اماں ملنا چاہتی ہیں۔ اور سنو اس بات کی بھنک بھی ناز کو نہیں لگنی چاہیئے۔"

"اماں وہ بہن ہے میری۔۔" اماں نے گھورا۔

" کر رہی ہوں کال۔۔" اماں کی گھوری سے وہ گڑبڑا گئی تھی۔ "بڑی آئی بہن کی پیاسی۔۔" اماں بڑبڑائی تھیں۔ مریم سے اب اتنی دوستی نہیں تھی کہ وہ گھر بلاتی تو وہ آجاتی۔ انکی سنئیر تھی۔ اور جب بھی بات ہوئی تھی بہت اچھے طریقے سے وہ بات کرتی تھی۔ نیناں نے موبائل سے مریم کا نمبر ڈھونڈا۔ اور پھر چند سیکنڈز بعد دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔ مریم اس وقت ردا کے ساتھ ہاسٹل سے نکل رہی تھی۔ آج کل علی کے لیے شاپنگ کرنا اس کی پہلی ترجیح تھی۔ وہ کل گھر جا رہی تھی۔ اور کام بہت سے تھے۔ ہاسٹل کا گیٹ پار کرتے اس نے بیگ سے بجتے موبائل کو باہر نکالا۔ نیناں کی کال تھی۔ "ہیلو۔" اس نے حیرت سے کہا تھا۔ نیناں نے کبھی اسے کال نہیں کی تھی۔ بس ایک دو بار مسیج پر ہی بات ہوئی تھی۔ سلام دعا کے بعد وہ اصل مدعے پر آچکی تھی۔

"وہ دراصل میں تمہیں اپنے گھر بلانا چاہ رہی تھی۔ اپنی اماں سے تمہاری اتنی تعریفیں کرتی ہوں کہ انہوں نے کہا کہ آج تو مجھے مریم سے ملوا دو۔" نیناں کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ مریم نے فون کان سے ہٹا کر حیرت سے فون کو دیکھا۔ جیسے نیناں اس میں سے نظر آرہی ہو۔

"تعریفوں کے لیے شکریہ۔۔ لیکن میں دوستوں کے گھر نہیں جاتی تم جانتی ہو مجھے پرمیشن نہیں ہے۔" مریم صاف انکار کر کے اسکا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔ اس لیے پرمیشن کا کہا تھا۔

"پلیز مریم۔۔ اماں کا بہت دل ہے تم سے ملنے کا۔" اب مریم یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ اماں کا دل ہے تو خود آجائیں۔ بڑی تھیں ان کے بارے میں وہ کیا کہہ سکتی تھی۔ ردا اسکے ساتھ کھڑی پوری بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اشاروں میں پوچھا تو مریم نے صبر کرنے کو کہا۔ اور پھر نیناں کے بہت اصرار پر اس نے حامی بھر لی تھی۔ کال کاٹ کر اس نے ردا کی طرف رخ کیا۔ "اپنے گھر آنے کے لیے اصرار کر رہی تھی۔ تو میں نے کہا آرہی ہوں۔"

کیوں خیریت۔۔" ردا نے ابرو اچکایا۔ "ویسے ہی۔۔" پھر میسج ٹیون بجنے پر موبائل کو دیکھا۔ نیناں نے گھر کا ایڈریس سینڈ کیا تھا۔ "بس تھوڑی دیر بیٹھیں گے۔ پھر شاپنگ کرنی ہے کل تین بجے جانا ہے۔" مریم کے پاس وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ وہ ٹیکسی کر کے مطلوبہ ایڈریس پر پہنچ گئی تھیں۔ وہ ایک شاندار گھر تھا محل جیسا۔

"واؤ۔۔" دونوں نے بے ساختہ گھر کے ڈیزائن کو سراہا تھا۔ "بھئی میرا تو خیال ہے کہ خوبصورت گھروں کا اتنا حق ضرور ہوتا ہے کہ انہیں رک کر ایک تعریفی نگاہ سے نوازا جائے۔" ردا نے بلا جھجک کہا۔

"میرا بھی اس معاملے میں کچھ ایسا ہی خیال ہے۔" مریم نے بھی ہنستے ہوئے تائید کی۔ "نیناں میر سے ملنا ہے۔" گیٹ کیپر کے قریب جا کر وہ بولی۔ اس نے سر ہلایا۔ پھر انٹرکام اٹھا کر اندر بات کی تھی۔ چند لمحوں بعد انکے لیے دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ وہ گھر جتنا باہر سے شاندار تھا اندر اس سے بڑھ کر تھا۔

"کاش کہ میں کوئی آرکیٹیکٹ ہوتی ایسے خوبصورت گھر بناتی۔۔" ردا نے اسکے ساتھ چلتے ہولے سے کہا۔ یہ نہیں تھا کہ دونوں نے کبھی خوبصورت گھر نہیں دیکھے تھے معاملہ یہ تھا کہ وہ جب بھی کوئی خوبصورت عمارت دیکھتیں یوں ہی فدا ہو جاتیں۔ جب کہ اندر نیناں اماں سے اب تک اس کی ڈھیروں

تعریفیں کر چکی تھی۔

"اماں اتنی نرم دل ہیں وہ کہ کیا بتاؤں۔۔" ہر دوسری بات کے بعد وہ کہہ اٹھتی بہت نرم دل ہیں کوئی جتنا بھی دل دکھائے چپ کر جاتی ہیں۔۔۔وہ ایسی نہ بھی ہوتی تب بھی اماں نے قبول کر لینا تھا کیونکہ وہ پلوشہ نہیں تھی۔ نیناں نے انہیں انٹرنس ڈور پر ریسیو کیا تھا۔ پھر ان دونوں کو ایک ہال کمرے میں لے گئی تھی۔ وہ روایتی بلوچی بیٹھک کی طرح سجی ہوئی تھی۔ فرشی نشست تھی۔ اور ایک جانب اماں بیٹھی تھیں۔ انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ اٹھیں اور محبت سے دونوں کو گلے لگایا۔ "اماں یہ مریم اور یہ انکی دوست ردا۔۔" بڑی مشکل سے اس نے خود کو مریم بھابھی کہنے سے روکا تھا۔ وہ دونوں سلام دعا کے بعد اب ان کے ساتھ نیچے بیٹھ چکی تھیں۔

اماں نے تو مریم کو اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔ وہ محبت سے اسکا ہاتھ تھامے بیٹھی تھیں۔ جب کہ وہ اتنی محبت پر جزبز ہوئے جا رہی تھی۔ ان دونوں ماں بیٹی نے تو اسے کسی شہزادی کے جیسا پروٹوکول دے دیا تھا۔ وہ یہ سوچتی کہ وہ روایتی بلوچ تھے اور ان کے مہمانوں کی عزت و تکریم ایسے ہی کی جاتی ہے ٹھیک تھا مگر ردا بھی تو تھی۔

دراصل ہاجرہ بی بی تو اس پر وارے صدقے ہو رہی تھیں۔ اور مریم بے چاری بہت خوش اخلاق ہونے کے باوجود بھی اس سب کو ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔ مشکوک تو ردا بھی ہو رہی تھی لیکن دونوں ابھی تو یہ بات نہیں کر سکتی تھیں۔ پھر کچھ دیر بعد ایک جانب دسترخوان سجا دیا گیا تھا۔ اور اسے دیکھ کہ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ جیسے کسی دعوت میں آئی ہوں۔

"نیناں اتنا سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو تھوڑی دیر کے لیے آئی ہوں۔ بتایا تو تھا کل جا رہی ہوں اور آج کا دن ہے کام بہت۔۔" مریم ان کے اخلاق سے متاثر ہو رہی تھی۔

پھر نا چاہتے ہوئے بھی وہ لوگ دسترخوان کے گرد جا بیٹھی تھیں۔ اماں اور نیناں بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھی تھیں۔ جیسے ہی انکی پلیٹ خالی ہوتی یا پانی کا گلاس ، نیناں پھر سے اسے بھر دیتی۔ اور ردا نے اب جوس ڈال لیا تھا۔ وہ پانی پی کر تنگ آ چکی تھی۔

مریم نے اب کی بار اپنا گلاس خالی ہونے پر اپنی خالی پلیٹ پر الٹا کر رکھ دیا تھا۔ اور ذرا سا پیچھے ہو گئی تھی۔ ردا کا اب جوس پی پی کر برا حال ہو رہا تھا۔ وہ مرتی تھی۔ وہ انکار کرتی اور نیناں پھر بھی گلاس میں اور

پانی ڈال دیتی اور پلیٹ میں کبھی کچھ تو کبھی کچھ۔ ردا نے مدد طلب نظروں سے اسے دیکھا۔ مریم نے آنکھوں اور آئی بروز کو حرکت دے کر کہا کہ گلاس خالی ہونے کے بعد سیدھا نہ رکھے بلکہ الٹا کر رکھے۔ یہ تو بلوچوں کی روایت تھی جب تک مہمان گلاس الٹا کے نہ رکھتے وہ گلاس بھرتے رہتے۔ مریم تو اپنی طلب کے مطابق کھا کر اس طرح فارغ ہو گئی تھی۔

لیکن بے چاری ردا کو کہاں معلوم تھا۔ کہ بلوچوں میں یہ بے عزتی کے مترادف تھا کہ انکے مہمان کا کھاتے ہوئے برتن خالی ہو جائے تو قت یہ کہ ،وہ انکار نہ کر دے۔ مطلب برتن سیدھا رکھنے کا مطلب وہ مہمان کی طلب سمجھتے تھے۔ اس لیے زبانی انکار کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔

پھر ردا نے اب گلاس خالی ہوتے ہی جلدی سے اسے الٹا کر دیا تھا۔ اور پلیٹ بھی فارغ کر چکی تھی۔ اسکی حالت پر وہاں موجود تینوں خواتین کو ہنسی آ رہی تھی۔ لیکن وہ سب ایک دوسرے سے چھپا رہی تھیں۔ پھر وہ ان دونوں سے اجازت لیتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ دونوں انہیں انٹرنس ڈور تک چھوڑنے جا رہی تھیں۔ بیچ میں اماں نے نیناں کو ہولے سے کچھ کہا تو وہ اندر کہیں چلی گئی۔ اور وہ اماں کے ساتھ آگے بڑھتی رہیں۔ "یار مرتی ہوں مجھے واش روم جانا ہے۔ زندگی میں کبھی اتنا جوس نہیں پیا جتنا آج نیناں نے پلا دیا۔" مریم نے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹا۔ " کبھی کسی روایتی بلوچوں کے ہاں مہمان نہیں بنی تم کہ اندازہ ہوتا وہاں کیسے ہوتا سب۔۔" مریم نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ " مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ اتنا کھلاتے ہیں میں کم از کم دو دن بھوک ہڑتال کر کے آتی۔۔" مریم کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن سر توڑ کوششوں کے بعد وہ اس ہنسی کو مسکراہٹ میں بدل پائی تھی۔

" آنٹی واش روم کس طرف ہے۔ میری دوست نے جانا ہے۔" ردا نے گھور کر اسے دیکھا۔

" خبیث دوست۔۔ کیا ضرورت تھی بتانے کی کہ دوست نے جانا ہے۔۔"

" یہ یہاں سے دائیں ہاتھ مڑ جانا۔ پہلا دروازہ ہے۔" اماں نے ردا کو ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ردا چلی گئی تھی۔ اماں ایک بار پھر اسکی طرف متوجہ تھیں۔

وہ دونوں جب اندر اماں اور نیناں کے ساتھ باتوں میں مگن تھیں۔ تب میر حاشر کو بابا جان نے ایمرجنسی

کا کہہ کر گھر بلوالیا تھا۔اڈی زہرہ کی ناراضگی کو وہی ختم کرسکتا تھا۔وہ بھائی کے سامنے بیٹھے اب روئے جارہی تھیں۔وہ روکھے انداز میں بات کر کے پچھتا رہے تھے کہ بڑی بہن تھیں ۔ایسے لہجے کو سن کر رونے لگ گئی تھیں۔انہیں نہیں پتہ تھا کہ حاشر نے آکر ان کی بہن کو مزید ناراض کرنا تھا۔لیکن یہ تو ہونے کے بعد ہی معلوم ہونا تھا۔جب اماں اپنی بہو پر وارے صدقے جارہی تھیں۔

عین اسی وقت ان کا بیٹا انکی برسوں پرانی خواہش کو سرانجام دے رہا تھا۔یعنی پھپو کے منہ پر انکار کرنے لگا تھا۔وہ اڈی زہرہ کے سامنے بھی اسی طرح بیٹھا تھا بے لچک۔۔اور تھوڑی دیر پہلے بابا جان نے کہا تھا اڈی کیسے قسم دوں، یا حکم وہ تو کھڑی چٹان کی مانند ہے۔جھکے تو بوجھ ڈالوں نا۔۔اور اڈی زہرہ دیکھ رہی تھیں۔ان کا بھائی ٹھیک کہہ رہا تھا۔وہ کھڑی چٹان تھا۔کوئی بھی قسم، دھمکی اس پر اثر نہیں کرنی تھی۔لیکن یہ بازی انہیں جیتنی تھی۔

"تمہارے باپ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے سردار بیٹے سے میری شادی کرے گا۔باپ کی زبان کا پاس نہیں ہے تمہیں۔"

"میرے لیے بابا جان قابل عزت واحترام ہیں۔وہ میرے باپ ہیں میرے لیے سب سے قیمتی۔اور بالکل ایسی محبت یا شاید اس سے بڑھ کر محبت کرتے ہیں وہ مجھ سے۔میری خوشی دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر ہے ان کے لیے۔اور میں جانتا ہوں اگر انکی یہ بات مان لی تو میں کبھی خوش نہیں رہونگا۔جب میں خوش نہیں رہونگا تو میرے بابا بھی خوش نہیں ہونگے۔اس شادی کے لیے اقرار بابا کو وقتی خوشی دے گا۔لیکن یہ اقرار ان سے ہمیشہ کی خوشی چھین لے گا۔میں نے ہر بات بابا جان پر واضح کردی ہے۔ٹھیک ہے ابھی وہ ناخوش ہیں، اداس ہیں لیکن یہ وقتی ہے۔میرے اس انکار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپکی بیٹی میں کوئی کمی ہے۔بس اس لیے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اچھے ساتھی نہیں بن سکتے میں نے انکار کردیا ہے۔"

"تو تم کہہ رہے ہو تمہارے بڑوں کا فیصلہ غلط ہے تمہارے لیے۔۔تم انکی بات کے آگے اپنی بات رکھ رہے ہو؟"اڈی زہرہ چبھتی نگاہوں سے بھتیجے کو دیکھ رہی تھیں۔

"میرا مطلب یہ نہیں ہے لیکن آپ کو یہی مطلب سمجھ آرہا ہے تو پھر ایسے ہی سہی۔۔پھپو بڑے خدا نہیں

ہوتے کہ بچوں کی زندگیوں پر مہریں لگائیں تو پھر وہ بدل نہیں سکتا۔وہ بھی انسان ہوتے ہیں۔یہ بات بڑوں کو خودسوچنی چاہیئے کہ جوحق اوپر سے مقرر کیے گئے ہوں اس پر اپنی مہریں نا لگائیں۔"اب کی بابا جان نے بے یقینی سے بیٹے کو دیکھا تھا۔

"تم یہ کہہ رہے ہوتمہارے باپ کا فیصلہ غلط ہے؟"باباجان توچپ بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔"میرے بابا جان نعوذ باللہ خدا تو نہیں لگ گئے کہ انکے منہ سے نکلی ہر بات ٹھیک ہوگی۔اور پلیز بڑوں کے ادب کے ساتھ اندھادھند تقلید کونا باندھیں۔یہ انکار کر کے میں بے ادب نہیں ہورہا بلکہ اپنے حق کے لیے کھڑا ہوں میری شادی میری پسند سے ہونی چاہیئے ۔اور یہ حق اللہ اپنے بندے کو دیتا ہے۔"

"جس لڑکی کے لیے باپ کی نافرمانی کر رہے ہو۔اگر اس نے ہی تمہیں دکھ دیا اس کے ساتھ خوش نہیں رہے تو۔۔"باباجان تو بس بیٹے کے منہ کو تکے جارہے تھے۔انھوں نے جو سکھایا تھا وہ ویسا ہی تو تھا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ بہادری کے اس مقام پر ہوگا کہ بنا ہچکچائے اپنی بات رکھے گا اور اسے صحیح ثابت کرے گا۔اور انہیں تکلیف ہوگی۔

"یہ میرا نصیب ہے۔ہوسکتا ہے جس سے باباجان شادی کرارہے ہیں وہ بھی دکھ دے۔شادی تو جوا ہے۔تو اپنی مرضی سے کیوں نہیں۔۔اور ہاں اگر آپ یہ سوچ رہی ہیں کہ میں ان مردوں میں سے ہوں جو پسند کی شادی ناکام ہونے پر روتے ہوئے کہتے ہیں کاش ماں باپ کی مرضی سے کر لیتے کہ شادی ناکام ہونے پر ان کے کندھے پر بندوق رکھتے۔تو یادرکھیں میں وہ نہیں ہوں۔میں میر جاشر ہوں۔میری شادی ناکام ہوتی ہے کہ کامیاب، میں اس کا الزام سراسر اپنے سر رکھنا چاہتا ہوں۔میری زندگی میں ایک ہی عورت آئی ہے۔اور وہی میری بیوی بنے گی۔آپ کو اچھا لگے کہ برا۔۔لیکن میں مریم عالم سے ہی شادی کرونگا۔"اب اس بات کے آگے کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔وہ بھائی کی طرف مڑیں۔"تو سرداری کس بیٹے کو دوگے؟"یعنی انکا اصل مسئلہ سردار سے بیٹی بیاہنا تھا۔"بس اڈی بہت ہوا۔۔یہ مردوں کے معاملے ہیں ایک آپکی بیٹی کے لیے میں اپنا سردار نہیں بدل سکتا۔"میر سراج تو آگ بگولا ہوگئے تھے۔پہلے بیٹے کی باتیں اور پھر بہن کی بے تکی بات۔۔

"سنا نہیں میرے بیٹے سے خدا تو نہیں ہوں جو کہوں تو ہمیشہ وہی ہو۔انسان ہوں اللہ ایسے سبب بنا دیتا

ہے کہ اپنی بات سے پھرنا پڑ جاتا ہے۔" بیٹے کو دیکھتے وہ چبا چبا کر بولے تھے۔میر حاشر نے یوں کندھے اچکا دیے جیسے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" آپ بہن بھائی آپس میں باتیں کریں۔آفس میں ڈھیروں کام چھوڑ آیا ہوں۔مجھے جانا ہے۔" وہ بولتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔اور یوں بے نیازی سے باہر چل دیا جیسے اندر بس عام سی باتیں ہوئی تھیں۔وہ پھپھو کے تاثرات کو یاد کرتا ہولے سے مسکایا تھا۔جاذب گھر تھا۔حاشر اسکی کلاس لینے اسکے کمرے میں گیا۔وہ تو بھائی کو دیکھتے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔" میں بس ابھی نکل رہا تھا۔چلیں اکٹھے چلتے ہیں۔" میر حاشر نے سر جھٹکا۔جاذب جیسا بھائی بھی کسی سر درد سے کم نہیں تھا۔

اور جب وہ سیڑھیوں سے اتر رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ پھپھو زہرہ جو غصے میں گھر چھوڑ کر جا رہی تھیں۔مریم کا نام سن کر ٹھٹھک کر پلٹی تھیں۔ابھی اوپر حاشر نے یہی نام لیا تھا۔" کیا کہا مریم؟ تمہارا نام مریم ہے۔مریم عالم۔" وہ چند قدم پیچھے کو ہو کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔مریم ان کے انداز پر کسی قدر حیران ہوئی۔ابھی تو بالکل قریب سے گزری تھیں اور دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔نیناں نے اسے گفٹ دیتے ہوئے اسکا نام لیا تو یوں پلٹی تھیں۔جیسے جھٹکا لگا ہو۔

" جی میں ہی مریم ہوں۔مریم عالم۔۔" وہ زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ان کو جاتا دیکھ اماں کا دل تو بہت خوش ہوا تھا۔ایک تو نند سے جان چھوٹی تھی۔یعنی ناراض ہو کر جا رہی تھیں تو اب بہت عرصے تک شاید نظر نہ آتیں۔دوسرا اپنی بہو بہت پسند آ گئی تھی۔نیناں سے کہہ کر اسکی دوست کے لیے چادر لانے کو کہا تھا اور اسکے لیے سونے کی بریسلیٹ تھی۔ان کی بہو پہلی بار ان کے گھر آئی تھی۔جب کہ روا اور مریم بہت آکورڈ محسوس کر رہی تھیں۔پھر چادر کی تو خیر تھی۔چھوٹے سے شاپنگ بیگ کے اندر سے نظر آتے ڈبے کو دیکھ کر پتہ چل گیا تھا کہ سونے کی کوئی چیز ہے۔پھر مریم کے پوچھنے پر کہنے لگیں۔" مہمان ہیں خالی ہاتھ تو واپس نہیں جانے دوں گی۔"

" لیکن گولڈ نہیں پلیز۔۔" مریم کو زندگی میں شاید ہی کوئی بات اتنی تعجب خیز لگی ہو جتنا کہ یہ۔۔کوئی گھر آئے مہمان کو واپسی پر سونے کے زیورات دیتا ہے؟؟ وہ بھی تب جب آپ ان کو جانتے بھی نہ ہوں۔وہ دینے پر بضد تھیں۔اور مریم لینے سے انکاری۔نیناں بھی اصرار کرنے لگی۔" پلیز مریم رکھ لو۔اماں اپنی خوشی سے دے

رہی ہیں۔اور ہماری تو روایت ہے مہمان کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔"

"مجھے دیں میں اسے ہاسٹل جا کے دے دوں گی۔" ردا نے آگے بڑھ کر اس تحفے کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔" ٹھیک ہے نا مریم۔۔" ردا نے اسے گھورا۔مریم نے بے بسی سے اماں کو دیکھا تھا۔تبھی وہاں سے گزرتے ہوئے اڈی زہرہ نے اسکا نام سن لیا تھا۔ادی زہرہ آہستگی سے چلتی ہوئی اس سے چند قدم کے فاصلے پر آ کھڑی ہوئیں۔"مریم عالم۔۔شکل سے دو ٹکے کی لڑکی لگ رہی ہو۔اوقات کیا ہے تمہاری کہ تم میری بیٹی کے مقابل آؤ۔۔ہاں۔۔گندے خاندان کی گھٹیا اولاد۔۔باہر اس لیے نکلتی ہو گھر سے، کہ شریف لڑکے پھنسا سکو۔۔" وہاں کھڑا ہر شخص حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔مریم کو لگا جیسے کسی نے گند کا ڈھیر اٹھا کر اس پر الٹا دیا ہو۔وہ عورت کیا بول رہی تھی۔اور کیوں گالیاں دے رہی تھی۔

"ادی کیا کر رہی ہیں آپ۔۔" اماں ہاجرہ غصے سے بولیں۔ادی زہرہ نے ذرا بھی ان پر توجہ نہیں کی۔وہ شعلہ بار نگاہوں سے مریم کو گھورتی رہیں۔" مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہی آپ کیا بول رہی ہیں اور کیوں۔۔" مریم کی آواز میں دبا دبا غصہ تھا۔

"بھائی دیکھ کیا رہے ہیں۔جائیں پھپھو کو روکیں۔" جاذب نے حیرت سے بھائی کو دیکھا جو ماتھے پر بل ڈالے نیچے دیکھ رہا تھا۔

" نہیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا مریم عالم اتنی قیمتی ہے کہ اسکے لیے لڑا جائے۔۔" جاذب کو بھائی کی بات سمجھ نہیں آئی۔لیکن وہ پھر خاموشی سے نیچے دیکھنے لگا۔

" مجھے لگتا ہے آپ کسی اور کی غلط فہمی میں مجھے سنا رہی ہیں۔۔"

"ادی آپ نے جانا ہے تو جائیں۔۔" اماں نند کو غصے سے گھور رہی تھیں۔

" تم سے تو میں بعد میں نمٹوں گی۔پہلے اس گندی نسل ،اور گھٹیا خاندان کی عورت سے تو نپٹ لوں۔جو ادائیں دکھا کر مردوں کو رجھاتی ہیں۔کہ وہ بچپن کے رشتے توڑ کر ان کے لیے اپنے بڑوں کا ادب بھول جاتے ہیں۔"

" آپ یقیناً کسی اور کی غلط فہمی میں اتنا فضول بول رہی ہیں ورنہ ہوش سلامت ہوتے تو آپ کو معلوم ہوتا

کہ آپ کس سے کیا بات کر رہی ہیں۔" مریم کی رنگت سرخ ہوگئی تھی۔ ردا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا کیا یہ اسکی وہی دوست تھی جو بہت نرم دل اور ہر بات کو اگنور کر دینے والی تھی۔ اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ مریم یوں بول اٹھے گی۔ "میں نہیں جانتی آپ کس کی غلط فہمی میں مجھے سنا رہی ہیں لیکن پھر بھی بولتے ہوئے اپنے الفاظ پر غور کر لیں۔ بڑے ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو دل چاہا بولتی جائیں اور سامنے والے کو بے عزت کر دیں۔"

"اتنی تم معصوم۔۔ جسے پتہ ہی نہیں کہ میں کیا بول رہی ہوں۔ میر حاشر کی بات کر رہی ہوں جسے اپنی معصومیت کے جال میں ایسا پھنسایا کہ اس نے اپنے بچپن کے طے کیے رشتے کو توڑ دیا۔ میری بیٹی سے بچپن سے اسکا رشتہ طے تھا لیکن تمہاری وجہ سے اسے سب بھول گیا۔"

"جی۔۔۔؟؟" مریم نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔" آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا میر حاشر سے کیا تعلق؟؟۔۔ اور فرض کریں اگر اسطرح کا کوئی معاملہ ہے تو بھی مجھے، کچھ بھی کہنے کا حق نہیں ہے آپ کو۔ اپنے بھتیجے کی ایسی تربیت کر لیتیں نا کہ وہ بچپن کے طے کیے رشتے کو نا توڑتا۔ آپ کے خاندان میں بچوں کو فرمانبرداری سکھائی گئی ہوتی تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ اور یقیناً آپکی بیٹی اس قابل نہیں ہوگی کہ بچپن کے رشتے کے باوجود بھی آپکا بھتیجا اسے اپناتا تو مجھے سنانے سے بہتر ہے بیٹی کو درست کر لیں۔"

" آئی واا۔" میر حاشر کے لب ہلے۔ یہ واہ کے جیسا لفظ تھا۔ جاذب نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ اماں اور نیناں کو اسکی آخری بات پر زور سے ہنسی آئی تھی۔

" تمہاری یہ جرأت کے میری بیٹی کے بارے میں ایسے الفاظ کہو۔" وہ غصے میں اسکی طرف لپکیں۔ اماں اور نیناں جلدی سے اسکے آگے آ کھڑی ہوئیں۔

" بس کر دیں ادی بہت ہوا۔" مریم اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلی تھی۔ ردا تو حیرت کا شکار تھی۔ اور اوپر کھڑے میر حاشر نے قدرے دلچسپی سے اسکی باتوں کو سنا تھا۔ اس لڑکی کو خود بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ چیز کیا تھی۔

" جرأت صرف آپ جیسوں کے لیے ہوتی ہے کیا؟ یا خاندانی زعم میں جس کو جو دل چاہا سنا دیا۔ شاید ایسے ہی قصے ہوتے ہونگے دنیا میں۔۔ امیر لڑکے نے اپنے سے کمتر لڑکی پسند کر لی اور پھر اس کے سب رشتے داروں

کو اسے ذلیل کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔لیکن اس قصے میں آپ کے صدمے کے لیے ایک بات بتاتی چلوں۔کہ میں الحمداللہ خاندانی لڑکی ہوں۔اور ہمارے ہاں بیٹیوں کی تربیت ایسے انداز میں نہیں کی جاتی کہ اگر وہ گھر سے دور ہوں، یا باپ بھائی کی نظر سے دور ہوں تو معاشقے چلا لیں۔شرافت ہمارے خون کا حصہ ہے۔

ہماری پشتوں میں آج تک کبھی کوئی غیر بلوچ نہیں آیا۔حسب نسب میں تو میں آپکے خاندان سے بہت آگے ہوں۔آپ جس بلوچ قبیلے سے ہیں۔میں اس سے بھی اعلی بلوچ قبیلے سے تعلق رکھتی ہوں۔بلوچوں کا سب سے برتر قبیلہ۔۔اور میرے خاندان کو دو ٹکے کا اور گندا کہہ رہی ہیں آپ۔۔خدا کی قسم میں اگر آپ جیسی سطحی مزاج کی مالک ہوتی تو آپ کے جتنا گر کر آپکو اسکا جواب دیتی۔آپ نے مجھے نہیں میرے خاندان میرے آباؤاجداد کو گالی دی ہے۔دو ٹکے کی آپ خود ہیں۔جسے گھر آئے مہمان کی عزت کا خیال نہیں ہے۔جو خود کو بلوچ کہتی ہیں مگر بولتے ہوئے الفاظ کا خیال نہیں کرتیں کہ ایسے لفظ منہ پر جچتے بھی ہیں؟۔جس اونچے نسب کا غرور ہے کاش اتنا ہی بلند اخلاق بھی ہوتا۔حسب نسب کی پہچان رگوں میں بہتے خون سے نہیں بلکہ آپکی اخلاقیات سے ہوتی ہے۔لیکن آپکے نزدیک رگوں میں بہتے خون سے ہی ہوتی ہے تو یہاں بھی میں آپ سے برتر ہوں۔میرا حسب نسب، میرا قبیلہ، میرا خاندان آپکے خاندان سے بہت بڑھ کر ہے۔اگلی بار جب کسی کو اپنے خاندانی زعم میں کچھ سنانے لگیں تو ذرا یہ ضرور دیکھ لیجیئے گا کہ سامنے والا آپکے خاندان سے برتر تو نہیں ،تا کہ تھوکا منہ پر نہ آئے۔اور خدا کی قسم۔۔اگر میں اس گھر کی مہمان نہ ہوتی تو اپنے بڑوں کی اس بے عزتی پر آپکو ضرور مزا چکھا کر جاتی۔لیکن کیونکہ میری رگوں میں اعلی خاندان کا خون ہے اور ہماری تربیت بھی اعلی اصولوں پر کی جاتی ہے اس لیے میں آپ کو بخشے جا رہی ہوں۔آپکی عمر کا لحاظ اور آپ کے گھر مہمان ہونے کا لحاظ۔۔ورنہ جو میرے باپ دادا کو گالی دے میرے لیے اس سے بڑا دشمن کوئی نہیں ہے۔"

مریم اماں اور نیناں کے آگے ہونے کے باوجود بھی اپنا غصہ نکالنے لگی تھی۔اور پھر اسے بولتا سن کر وہ دونوں آگے سے ہٹ گئی تھیں۔وہ ادی زہرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے انہیں آئینہ دکھا گئی تھی۔اسکا لہجہ سرد اور تپش لیے ہوئے تھا۔

اسکی آنکھوں کے تاثرات سے ادی زہرہ جیسی خاتون بھی لمحے بھر کو ڈر گئی تھیں۔جتنا غصہ اور نفرت اسکے لہجے

اور آنکھوں سے نظر آرہی تھی جانے کیسے وہ خود کو روکے ہوئے تھی کہ اس نے ادی زہرہ کا منہ نہیں نوچا تھا۔ ورنہ اسکی آنکھیں تو یہی بتا رہی تھیں کہ ابھی جھپٹے گی۔ مگر وہ صحیح کہہ رہی تھی کہ اسے پھر بھی ان کا لحاظ تھا۔

پھر بنا کسی کی طرف دیکھے وہ انٹرنس ڈور کراس کر گئی تھی۔ اسکے باہر جاتے ہی ردا ہوش میں آئی اور اسکے پیچھے بھاگی۔ "یار ادا۔۔ یہ تو جون جولائی کی دھوپ نکلی۔۔" اوپر کھڑے جاذب نے ٹرانس کی کیفیت میں بھائی کو کہا۔ میر حاشر کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ "اب تو تمہیں پتہ چل گیا نا کہ وہ مجھے کیوں پسند ہے؟"

"ادا پہلی ملاقات میں تو ایسا لگا ہی نہیں تھا کہ اتنی کڑی دھوپ کی طرح نکلے گی۔"

"اور مجھے پہلی ملاقات میں ہی اسکا اندازہ ہو گیا تھا۔ ناپسند بھی اس لیے آئی تھی۔"

وہ ہنسا۔ نیچے باباجان اماں کے پیچھے کھڑے خاموش سے تھے۔ وہ مریم کی آخری باتوں کے درمیان وہاں آئے تھے۔ ادی زہرہ کی شکل تو صدمے والی ہو رہی تھی وہ کل کی لڑکی انہیں اتنا سنا کر گئی تھی۔ اور پھر اسے کسی نے کچھ بھی نہیں کہا تھا سب نے چپ کر کے سنا تھا۔

"حاشر سے کہو دو دن بعد لڑکی کے گھر چلنے کی تیاری کرے۔" مریم کے جانے کے بعد اب باباجان کی آواز ابھری تھی۔ اماں اور نیناں نے ایک دم سے مڑ کر باباجان کو دیکھا۔ ادی زہرہ نے بے یقینی سے۔ حاشر کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ وہ اطمینان بھرے قدم اٹھاتا سیڑھیوں سے اترنے لگا۔

"حاشر یہ تو شیرنی ہے۔۔" اماں نے اسے دیکھ کر کہا۔

"شیر کے ساتھ شیرنی ہی جچتی ہے۔" جواب باباجان نے دیا تھا۔

"وہ لڑکی تمہارے گھر آکر تمہاری بہن کی بے عزتی کر کے گئی ہے۔ اور تم ہو کہ اسکا احساس بھی نہیں ہے۔۔"

"ادی غلطی آپکی ہے۔ اور بے عزتی اسکی ہوئی کہ وہ ہماری مہمان تھی۔ گھر دشمن بھی آئے تو اسکی بھی لاکھ قدر کی جاتی ہے اور آپ نے کیا کیا۔۔" نیناں کو جیسے باباجان کی اس بات سے اب ہوش آیا تھا۔ مریم اسکے بلانے پر آئی تھی اور اسکے گھر سے بے عزت ہو کر گئی تھی۔ وہ تیزی سے باہر بھاگی۔ مریم اور ردا ان کے مین گیٹ سے ابھی بہت دور تھیں۔ اتنا بڑا تو لان تھا۔ مریم تیز قدموں سے آگے تھی اور ردا اسکے قدموں کا ساتھ

دینے کی کوشش کررہی تھی۔ نیناں ان سے زیادہ سپیڈ سے انکی جانب بھاگی۔اور مریم کے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ان تک جا پہنچی۔"

رکیں مریم۔۔" اسکی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ مریم نے اسے دیکھ کر لب بھینچ لیے۔ "اپنی پھپھو کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں۔ پلیز۔۔"

" میں یہ کبھی نہیں بھولونگی کہ تم نے بہت اصرار کر کے مجھے گھر بلایا تھا۔اور معافی کیوں؟ اگر تمہارے گھر میں ایسی بات چل رہی تھی تو مجھے کیوں بلایا تھا؟ تمہاری پھپھو تمہارے لیے تو انجان نہیں تھیں۔۔ تمہیں پتہ تو ہوگا نا کہ کیسے مزاج کی ہیں۔۔ میرے فرشتوں کو بھی جس معاملے کی خبر نہیں اس کے لیے مجھے لوگ گھر بلا کر بے عزت کرتے ہیں۔اور تمہیں لگتا ہے یہ چھوٹی بات ہے۔۔"

نیناں کی سانسیں اٹک گئی تھیں۔ جن کو ہمیشہ نرم دیکھا ہو انکی سختی دل پر گہرے زخم لگاتی ہے۔ نیناں نے کبھی اس کے ایسے سخت الفاظ کسی کے لیے بھی نہیں سنے تھے۔وہ اور ناز ہمیشہ یہ کہتی تھیں پتہ نہیں کبھی یہ غصہ بھی کرتی ہونگی۔۔ پتہ نہیں کس بات پر غصہ آتا ہوگا۔۔اچھا غصے میں کیسی لگتی ہونگی۔۔آج نیناں کو دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔

" آئی ایم سوری۔۔ مجھے واقعی اندازہ نہیں تھا کہ ایسی سچویشن ہو جائے گی۔" نیناں روہانسی ہوئی۔

" کوشش کرنا مجھ سے دور رہو۔" مریم اسی سخت لہجے میں بولتی مین گیٹ پار کر گئی تھی۔

☆......☆......☆

نیناں روئے جارہی تھی۔ "پھپھو نے ذرا بھی احساس نہیں کیا۔وہ ہماری مہمان تھیں۔ میں نے انہیں بلایا تھا۔۔" اماں اسکے ساتھ بیٹھی اسے سمجھائے جارہی تھیں۔ " کل صبح جا کر اسے منا لینا۔" حاشر نے بہن کو روتے دیکھ کر مشورہ دیا۔ادی زہرہ تو غصے اور بے یقینی کی سی کیفیت میں وہاں سے گئی تھیں۔افسوس تو سب کو ہو رہا تھا۔وہ ان کی بڑی تھیں۔لیکن ضروری نہیں ہر کوئی باپ دادا کو دی جانے والی گالی برداشت کرلے۔۔

بلکہ ضروری نہیں کہ ہر عورت خود کو اعلی اخلاق کا ثابت کرنے کے لیے اپنے خاندان کو دی جانے والی گالی سہہ جائے۔ بہت سی عورتوں کے پاس بہت سی وجوہات ہوتی ہیں اس گالی کو سہنے اور چپ رہنے کی۔لیکن

مریم عالم، کہ جس سے توقع ہی نہیں تھی کہ اسے ہمیشہ نرم اور ہر بات پر چپ کر کے مسکراتا دیکھا تھا۔وہ اس گالی پر کسی بھی دوسری عورت کی طرح چپ نہیں رہی تھی۔کیونکہ گالی پر چپ رہنے سے آپ تو اچھی تمیز والے ثابت ہوجاتے ہیں مگر خاندان کو بے عزت کروادیتے ہیں۔

"وہ کہہ کر گئی ہیں کہ کوشش کرنا اب مجھ سے دور رہو۔بات نہ کرو۔انھوں نے کہا کہ میں نے جان بوجھ کر انہیں بلاکر بے عزت کروایا۔۔"وہ روئے جارہی تھی۔

"اچھا کل میں بھی چلونگی۔اور اسے منا کر ہی آئیں گے۔پھر اسکے گھر بھی تو جانا ہے۔۔"اماں نے اسے تسلی دی۔

"لڑکی کے گھر کا پتہ دیکھو۔اور چلنے کی تیاری کرو۔۔"بابا جان نے پھر اپنی بات دہرائی تھی۔انہیں یقیناً ہونے والی بہو بہت پسند آئی تھی۔

حاشر نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔"سب پتہ کروالیا ہے۔جس دن آپ جانا چاہیں۔۔"

☆......☆......☆

مریم کا غصہ ہاسٹل پہنچ کر بھی نہیں اترا تھا۔وہ اتنے غصے میں تھی کہ ردا کے ایک دو بار چھیڑنے پر اسے بھی جھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ردا چپ ہوگئی تھی۔پھر کہاں کی شاپنگ اور کیسی شاپنگ۔۔وہ ہاسٹل میں لان میں یہاں سے وہاں چکر کاٹے جارہی تھی۔

ان کا ہاسٹل پرائیویٹ تھا۔لیکن پھر بھی خاصا بڑا تھا۔اور اسکا لان بھی اچھا خاصا تھا۔شام سے رات ہوگئی تھی۔لیکن مریم اسی طرح مارچ پاسٹ کیے جارہی تھی۔ردا کو پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ وہ شدید غصے میں واک کرتی ہے۔اور جب اس کا غصہ اترنے لگا تو آہستہ آہستہ اسے احساس ہونے لگا کہ اسکی ٹانگوں میں اتنا چلنے کی وجہ سے درد ہورہا ہے۔تھکن کا احساس ہوتے ہی وہ ایک جانب جا بیٹھی۔اب غصہ ختم ہونے کے بعد ان باتوں پر اسے رونا آنے لگا تھا۔

ہوتی کون تھیں وہ اسے گالی دینے والی۔۔افف۔۔مریم نے دونوں ہاتھوں میں سر تھاما۔پھر چند گہرے سانس لیتی آہستہ قدموں سے چلتی وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ردا اسکے لیپ ٹاپ پر لگی ہوئی تھی۔اسے

آتے دیکھ کر جلدی سے اسے آف کرتی اٹھ کر مریم کے پاس آئی۔ جو اپنے بیڈ پر رکھا کچھ سامان ہٹا رہی تھی۔ سامان ہٹا کر مریم بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ ردا بھی ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ "غصہ اترا؟؟"

"ہاں۔۔" وہ یک لفظی بولی۔ "ویسے بلوچ صاحب آج تو آپ نے مجھے حیران کر دیا۔ آپ بھی اتنا بول سکتی ہیں۔۔" ردا تو واقعی اب تک حیرت میں تھی۔ وہ ایم ایس سی کے شروع سے ساتھ تھیں۔ اور ڈیڑھ سال میں پہلی بار اس نے مریم کو ایسے بولتے دیکھا تھا۔ مریم نے ردا کو دیکھا۔ "میرا گناہ معاف میں مذاق کر رہی تھی۔۔" ردا نے اسکے دیکھنے پر جلدی سے ہاتھ کھڑے کیے۔ مریم ہولے سے ہنس دی۔

"تم پر غصہ کیوں کرونگی۔۔۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے مجھے نیناں کے گھر نہیں جانا چاہیئے تھا۔۔"

"نیناں اور اسکی اماں تو اتنے اچھے سے ملیں۔۔" مریم نے اسکی بات پر سر ہلایا۔

"ہاں۔ لیکن پھر بھی مجھے نہیں جانا چاہیئے تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ایسی گالی سنی ہے۔ اور افسوس صرف یہی ہے کہ خود چل کر گئی تھی میں۔۔ کاش کہ نہ جاتی۔۔ نہ ہی سنتی۔۔" مریم نے افسوس سے سر ہلایا۔

"ویسے اسکے بھائی سے تمہارا کیا چکر ہے؟؟" ردا نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

مریم نے گھور کر دیکھا۔ "میں تمہیں چکروں والی لگتی ہوں؟"

"یار مذاق کر رہی ہوں۔۔"

"تو ذہن میں بٹھا لو مجھے گھٹیا مذاق نہیں پسند۔۔ یہ لڑکوں سے چکر وغیرہ جیسے الفاظ ہمارے ہاں مذاق میں بھی نہیں بولے جاتے۔ ہمارے خاندان کی عورتیں نہ ایسی ہیں۔ اور نہ ان خطوط پر ہماری تربیت کی جاتی ہے۔ مذاق کے لیے بہت سے موضوع ہیں۔ ضروری نہیں ایسے موضوع کا انتخاب کیا جائے جو فضول گوئی پر مبنی ہو۔"

ردا کا تو اتنا سا منہ نکل آیا تھا۔ "سوری یار۔۔ مجھے پتہ نہیں تھا یہ بات تمہیں غصہ دلائے گی۔

" مریم نے بنا کچھ کہے اسکے کندھوں پر بازو پھیلایا۔ وہ دوست تھی۔ اور دوستوں کی باتوں کا برا لگنے کے باوجود بھی ان سے زیادہ دیر ناراض نہیں ہوا جا سکتا۔

"رکو ایک چیز دکھاتی ہوں۔" ردا اٹھ کر اپنی الماری تک گئی۔ اور پھر نیناں کے دیے گئے گفٹس نکال کر لے

آئی۔"یار کڑھائی دیکھو کتنی پیاری ہے۔۔ اور تمہاری بریسلیٹ کا ڈیزائن۔۔ بہت خوبصورت ہے دیکھو۔۔"اس نے چادر اسکے پاس رکھ کر بریسلٹ اسکے ہاتھ میں دیا۔

"انہیں تو بھول گئی تھی۔تم نے واپس کیوں نہیں کیے۔"

"دفع ہو جاؤ مریم۔۔ نیناں کی اماں نے اتنے پیار سے تحفہ دیا۔اور ویسے بھی وہاں کھڑے کسی بندے کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ تم یوں انکی پھپو کی کلاس لوگی میں تو سمجھی ابھی مریم رونے لگ جائے گی۔ میں تمہیں سہارا دینے کا سوچ رہی تھی اور روتے وقت چپ کرانے کی پلاننگ کر رہی تھی۔"

مریم زور سے ہنس دی۔"پاگل ہو تم۔۔نرم مزاجی اور اچھے اخلاق کا مطلب یہ تو نہیں کہ کوئی انجان آپ پر گندے الزام لگائے۔اور آپ کے خاندان کو رگید ڈالے اور آپ بزدلوں کی طرح رونے لگ جائیں۔نرم مزاجی اور چیز ہے مرے ہوئے اجداد کی گالی سہنا اور۔۔خاندان میں اکیلی میں تو نہیں آتی۔۔خاندان میں میرے باپ دادا بھی آتے ہیں۔نسل کی بات کہی تھی انھوں نے اور نسلیں ایک دو پشتوں میں نہیں بنتیں۔میں اس عورت کے بڑے ہونے کا لحاظ کر جاتی۔لیکن میرے باپ ،داد اور اجداد اس سے بھی عمر میں بڑے تھے۔اور کچھ لوگوں کو بے لحاظی کا مطلب تب تک سمجھ نہیں آتا جب تک کہ خود ان کے ساتھ نہ کی جائے۔اس عورت نے صرف مجھے نہیں میرے خون کو گالی دی تھی۔ایسے وقت پر رونا؟؟ میں اپنے خاندان کو گالی دینے والے کا منہ نہ نوچ لوں۔رویا تو بعد میں جا سکتا ہے۔لیکن ایسے لوگوں کو انکی اوقات یاد دلانا بہت ضروری ہوتا ہے۔"مریم تنفر بھرے انداز میں بولی۔پھر ردا کے چہرے کو دیکھتے گہری سانس لی۔

"چلو اب ان باتوں کو رہنے دو۔سارا دن بھی خراب ہوا اب رات تو خراب نہ ہو۔میں نماز پڑھ کے سونے لگی۔شاپنگ کل کریں گے۔"مریم یہ کہتی وضو کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ردا نے سر ہلایا۔"اچھا اپنا موبائل دکھانا ذرا۔میرا کریڈٹ ختم ہو رہا ہے۔"مریم نے پرس میں ہاتھ ڈال کو موبائل نکال کر اس کے حوالے کیا۔

ردا موبائل لیتی اپنے بیڈ پر جا بیٹھی تھی۔اسکی سائیڈ پر مریم کا لیپ ٹاپ رکھا تھا جو وہ اسکے سونے کے بعد پھر استعمال کرنے والی تھی۔اور اسکے ہاتھ میں مریم کا موبائل تھا۔جس پر تیزی سے اسکی انگلیاں حرکت کر رہی تھیں۔وہ اپنے لیپ ٹاپ اور موبائل کی بجائے مریم کے لیپ ٹاپ اور موبائل کو استعمال کرنے کو زیادہ ترجیح

دیتی تھی۔اور مریم دے کر ایسے ہو جاتی کہ جیسے وہ چیزیں ردا کی ہی ہوں۔اس لیے تو ردا بڑے دھڑلے سے استعمال کرتی تھی۔ورنہ آجکل سب کی اپنی ضرورت ہے موبائل لیپ ٹاپ۔لیکن مریم پھر کتابوں میں زیادہ وقت گزارتی تھی اس لیے اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔

اگلے دن گیارہ بجے وہ شاپنگ پر جانے کا سوچ رہی تھی۔لیکن جب نیناں اور اسکی اماں کے آنے کی اطلاع ملی۔وہ پرس رکھتی ویٹنگ روم میں آگئی تھی۔نیناں کی اماں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا اور پھر کتنی دیر محبت سے اپنے ساتھ لگائے رکھا۔

نیناں ڈرتے ڈرتے آگے آئی۔مریم نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی۔اور اسے بھی گلے لگایا۔وہ ان دونوں کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔یہ سب مریم کے نزدیک بہت عجیب تھا۔

"کل ان کی پھپھو کی باتوں نے آپ کا دل دکھایا اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔"

"نہیں پلیز۔۔آپ مجھ سے بڑی ہیں پھر آپ کا قصور نہیں ہے۔"وہ جلدی سے بولی۔

"بس رشتے کے انکار کے بعد ان کی پھپھو ذرا پریشان ہو گئی تھیں۔اسی پریشانی میں نامناسب الفاظ کہہ گئیں۔"مریم خاموش رہی تھی۔

"آنٹی میرا آپکے بیٹے سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔مجھے سمجھ نہیں آرہی آپ کے بیٹے کے انکار کو انہوں نے میرے سر کیوں ڈالا۔۔"مریم نے کل سے ذہن میں گردش کرتے سوال کو پوچھ ہی لیا تھا۔

"بیٹا میں جانتی ہوں۔دراصل میرا اور نیناں کا ارادہ آپکی طرف رشتہ کرنے کا ہے۔تو میں نے یہی کہہ کر انکار کیا تھا۔میرے بیٹے کا بھی اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"وہ سمجھدار خاتون تھیں۔اور انہیں دوسروں کی عزت کا احساس بھی تھا اس لیے بیٹے کی پسند کہنے کی بجائے انہوں نے اپنا کہا تھا۔مریم نے سمجھ کر سر ہلایا۔"کل ہم اچھی میزبانی نہیں نبھا سکے۔اس لیے تلافی کے طور پر آپ کے لیے کچھ گفٹس لائی ہوں۔"

وہ ماں بیٹا گفٹس دینے کے بہت شوقین لگتے تھے۔اور جب ان کے لائے گفٹس پر مریم نے نظر دوڑائی۔اس کا منہ کھلا۔"آنٹی یہ کیا ہے؟"اس نے دوسرے صوفے پر رکھے شاپنگ بیگز کی طرف دیکھ کر کہا۔وہ تو جیسے پوری دکان خرید کر لائی تھیں۔مریم بوکھلا گئی تھی۔اور وہی کل والا حال تھا۔وہ دینے پر بضد اور

مریم کی لیتے ہوئے سانسیں اٹک رہی تھیں۔اسے کب عادت تھی یوں اسطرح ڈھیروں تحفے وصول کرنے کی۔ایک آدھ تحفہ لیتے وہ متامل تھی اور آج وہ جیسے آدھا بازار خرید لائی تھیں۔ناراضگی دور کرنے کے بدلے اتنے گفٹس۔۔آہ۔۔مریم کراہی۔

"پلیز میں نہیں لے سکتی آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔"اور پھر انکے اتنے اصرار پر اس نے حامی بھر لی تھی۔مسلسل انکار سے بھی اتنا برا لگ رہا تھا اور گفٹس رکھ کر بھی۔وہ ان کو رخصت کرتے بدقت مسکرائی تھی۔اور پھر ردا وہ سب چیزیں دیکھ دیکھ پاگل ہوئی جارہی تھی۔کپڑے۔جیولری،میک اپ اور پرفیومز۔۔یااللہ صرف تحفے تھے کہ برّی۔۔مریم تو سر تھامے بیٹھی تھی۔ردا ہنسے جارہی تھی۔"یہ گفٹس وہ اپنی ہونے والی بہو کو دے کر گئی ہیں۔مانو نہ مانو یہ تمہیں لے ہی جائیں گے۔"

"بکواس نہ کرو۔۔"مریم چڑ گئی تھی۔نیناں کی اماں خود کہہ کر گئی تھیں کہ وہ اس کا رشتہ لینا چاہتی ہیں۔اور پھر اس سے اس کے گھر والوں یا اسکی ذات کے متعلق بھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔نہ امی،ابو کا نمبر مانگا تھا۔یہ ہو کیا رہا تھا؟اسکی تو سمجھ سے باہر تھا۔اور بغیر اسکی ذات کے متعلق کوئی تجسس کیے وہ اسے ہر حال میں قبول کرنے والی تھیں کیا؟بھئی یہ کیا چل رہا تھا کوئی مریم کو سمجھاتا۔یہ اسکی سمجھ سے بہت آگے کی باتیں تھیں۔

☆......☆......☆

اپنے گھر سے زیادہ سکون دنیا کے کسی حصے میں نہیں ملتا۔مریم اس وقت امی کے آگے بیٹھی سر میں تیل ڈلوا رہی تھی۔امی جو زور زور سے سر پر ہاتھ مارتی تھیں۔مزا آجاتا تھا۔سارا درد کہیں دور بھاگ جاتا۔"پچھلی بار کہتی رہی تیل ڈلوالو۔لیکن نہیں اب حالت دیکھو بالوں کی۔"

"امی۔۔"مریم نے منہ بنایا۔ہر بار تیل ڈلواتی ہوں اگر ایک بار چوک گئی تو مطلب بال ہی خراب ہو گئے واہ۔۔"

"بی بی احساس ہے تمہاری ان جھاڑیوں کو اتنا خوبصورت بنانے میں کتنی محنت کی ہے میں نے۔۔"امی نے فٹ طعنہ دیا۔علی نے اسے چڑانے کو زور سے قہقہہ لگایا۔مریم نے بے نیازی سے گردن اکڑائی۔کیا ہوا جو امی نے بے عزتی کر دی سب کی امیاں کرتی ہیں۔

"امی یہ تو جب بھی بال کھول لے تو چڑیل لگنے لگتی ہے۔۔" علی نے موبائل ایک طرف رکھ دیا تھا۔وہ فرصت سے اسے ستانے کے موڈ میں تھا۔اسکے بال گھنگریالے تھے۔اور پھٹے ہوئے بم جیسے لگتے اگر جو امی اتنی محنت نہ کرتیں۔امی کی محنت تھی کہ نہ بڑھنے والے بال کمر سے نیچے تک تھے۔گھنے اور خوبصورت۔

علی اسکے گھنگریالے بالوں کی وجہ سے اسے چڑیل بولتا تھا۔"تم بنا کسی وجہ کے بندر لگتے ہو۔۔"وہ ہمیشہ کی طرح چڑ گئی تھی۔بھئی وہ اپنے بالوں کے معاملے میں بہت حساس تھی۔

" کتنی دفع کہا ہے امی سے بال سیدھے کروا لینے دیں۔۔نہیں تو کٹوانے دیں۔"

"میں تمہیں سیدھا کر کے رکھ دوں گی خبردار ان بالوں کو ہاتھ بھی لگایا تو۔۔اتنے پیارے ہیں۔ریشم کے لچھے ہوں جیسے۔۔" امی کی تشبیہات پر علی پھر ہنسا تھا۔اور اسکی ہنسی مریم کو اور غصہ دلا گئی۔"او،ریشم کے لچھوں والی جاؤ میرے لیے ایک گلاس پانی بھر لاؤ۔" علی نے اسی کے انداز میں آنکھیں گھمائیں۔مریم نے اس حکم پر اسے گھور کر دیکھا۔امی اسے فارغ کر چکی تھیں۔اب وہ اپنے بالوں کا جوڑا بنا رہی تھی۔

"نوکر نہیں لگی تمہاری۔جاؤ خود بھی پیو اور میرے لیے بھی بھر کر لاؤ۔" بولتے ہوئے اسی کے صوفے پر آ بیٹھی۔ادھر امی نے بھابھی کو آواز لگائی تھی۔چند لمحوں بعد وہ حاضر تھیں۔امی اب ان کے سر میں تیل ڈال رہی تھیں۔امی کی زندگی کا مقصد تو جیسے اپنی اولاد کے لاڈ اٹھانا تھا۔

"شرم نہیں آتی بھائی سے ایسے لہجے میں بات کرتی ہو گستاخ۔" علی نے آنکھیں دکھائیں۔لہجہ سراسر شرارتی تھا۔"شرم بھائی کو آنی چاہیئے مجھ سے ایک سال چھوٹا ہے۔"وہ اطمینان سے بولی۔امی اور بھابھی ان کی باتوں کو سننے کی بجائے آپس میں باتیں کرنے لگیں۔" تمہیں پتہ ہے لوگوں کے بھائیوں کے گھر میں کیسے رعب ہوتے ہیں۔بہنیں تھر تھر کانپتی ہیں۔شکر کرو اتنا اچھا بھائی ملا۔۔"

"تم شکر کرو اتنی اچھی بہن ملی۔اتنی خوبصورت۔۔"

"ہاں چڑیل کے بالوں والی۔۔"

"بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔۔"

شکر کرو میں تم پر رعب نہیں رکھتا۔۔"

"او مائی گاڈ۔۔میں ڈر گئی۔۔شکل دیکھی ہے اپنی۔۔بڑے آئے رعب والے۔ایک تو گھر میں سب سے چھوٹے ہو۔اوپر سے خواہشیں چیک کرو بچے کی۔۔"مریم نے خوب رگیدا۔علی نے اسے گھورا۔

"میرا دوست اپنی بہنوں سے چھوٹا ہے لیکن اسکی بہنیں اسکا حکم مانتی ہیں۔اس سے ڈرتی ہیں۔رعب ہے اس کا گھر میں۔۔"

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی تمہاری کمپنی اچھی نہیں ہے۔تو جس کا اتنے شوق سے ذکر کر رہے ہو ایسے لوگ قابل عزت نہیں ہوتے۔اور پھر بھی تمہیں ظالم بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو یاد رکھو ہر فرعون کے لیے کوئی موسی آتا ہے۔"

"اب بھائی فرعون بن گیا۔"مذاق میں شروع ہونے والی گفتگو سریس ہو چکی تھی۔اور اکثر بہن بھائیوں کی طرح دونوں ہی خراب موڈ کے باعث ایک دوسرے پر چڑھائی کرنے کو تھے۔

"امی سنا اپنی بیٹی سے۔۔مجھے کہتی ہے میں فرعون ہوں۔"علی نے بدلہ لینے کے انداز میں امی کو پکارا تھا۔مریم نے دانت پیسے۔"مریم۔۔"امی نے سرزنش کی۔

"میں نے اسے تو نہیں کہا۔میں نے کہا جو ظالم ہوتے ہیں وہ فرعون ہوتے ہیں اور ہر فرعون کے لیے موسی آتا ہے۔"اس نے معصومیت سے پلکیں جھپکا کر امی کو دیکھا۔بھابھی نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا تھا۔"شرم کرو دونوں اتنے دنوں بعد ملتے ہو پھر بھی لڑائی کا کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈ نکالتے ہو۔"

"میں نہیں امی یہ خود۔۔کہا بھی ہے اسے مصروف تھی شاپنگ نہیں کر سکی۔کہتا جان بوجھ کر نہیں کی تم نے۔۔"

امی نے انکی بحث پھر سے شروع ہوتے دیکھ کر پھر سے بھابھی سے بات شروع کر دی تھی۔انکی لڑائی ہوتی تو ایک دوسرے کو ہرانے کو ایسی ایسی دلیلیں نکال لاتے کہ کیا کوئی وکیل نکالتا ہوگا۔مقصد صرف ایک ہوتا کہ اس زبانی لڑائی میں مخالف پارٹی سے کسی صورت نہ ہارا جائے۔

اور جب صلح ہوتی تو کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے بحث میں سارا سارا دن گزار دیتے تھے۔اکثر جیت مریم کی ہوتی آج بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔"مریم تمہارے پاؤں کے نیچے چھپکلی۔۔"علی زور سے چلایا۔مریم نے چیخ مار کر پاؤں اوپر کر لیے تھے۔اسکی چیخوں نے امی اور بھابھی کو ڈرا دیا تھا۔

" کیا ہو گیا ہے۔"

"امی میرے پاؤں کے ساتھ چھپکلی تھی۔۔" مریم کے حواس اڑے ہوئے تھے۔وہ قدرے سکڑ کر صوفے پر بیٹھی تھی۔علی نے مسکراہٹ ضبط کی۔ ہنستا تو مریم نے چھوڑنا نہیں تھا۔

"اب صوفے کے نیچے چلی گئی۔تم بیٹھو میں اسے نکال کر آج گندی موت ماروں گا۔" یہ دراصل مریم سے بحث میں جیتنے کے کوئی آثار نہ دیکھ کر علی نے صورت حال کو نارمل روٹین پر کیا تھا۔اب مریم نے اسکی منتیں کرنی تھیں کہ چھپکلی مار دے۔تب ہی وہ صوفے سے نیچے اترے گی۔پھر وہ اسے کہے گا مجھے اچھا بھائی کہو۔میری تعریفیں کرو۔۔امی اور بھابی تو صورت حال کو سمجھ گئی تھیں۔لیکن مریم نے ابھی تک علی کے چہرے کی مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔" پلیز علی اچھے بھائی ہو۔۔اسے مار دو۔۔"

" پہلے میری تعریف میں دس جملے کہو۔۔" علی نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی۔مریم نے اسے گھورنا چاہا مگر مسئلہ یہ تھا کہ گھر میں چھپکلیاں، کاکروچ اور ہر قسم کی بلا صرف وہی مارتا تھا۔

" تم میرے اچھے بھائی ہو۔ہینڈسم ہو۔پیارے ہو،خوبصورت ہو۔"

" یہ ساری ایک ہی باتیں ہیں۔ان میں سے صرف ہینڈسم والا جملہ گنا جائے گا۔چلو اور سوچو۔۔"

" کچھ ہو تم میں تو سوچوں۔۔"

" ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں باہر۔ایک دوست کو ملنا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولتا اٹھنے لگا۔مریم نے لپک کر اسکے بازو سے پکڑا۔وہ ابھی تک صوفے پر تھی۔" علی میرے بھائی۔بیٹھو میں سوچ رہی کچھ نا کچھ تو مل ہی جائے گا۔۔"

" تم خود اٹھ کر مار دو کیوں اسکی منتیں کر رہی ہو۔۔" بھابی نے کہا۔

میں چھپکلی کو دیکھ کے مر جاؤں گی۔۔"

""حاضرین کوئی کہہ سکتا ہے ان خاتون کی زبان جب چلتی ہے تو رکنے کا نام نہیں لیتی۔اور اب کیسے بھائی کی منتیں کی جا رہی ہیں۔دیکھا بھائی کتنے کام کے ہوتے ہیں۔بھائی نہ ہوں تو تمہارے گھروں میں چھپکلیوں کے ڈھیر لگ جائیں۔اور تم مجھے فرعون کہہ رہی تھی۔۔"

"تمہیں نہیں کہہ رہی تھی۔" مریم زچ ہوئی۔

"مجھے تو ایسے ہی لگا۔ تو اسکے بدلے ایک بار سوری اور دس میرے تعریفی جملے۔۔"

"بدتمیز۔۔" مریم نے دل میں اسے سنایا۔ لیکن درحقیقت علی کی شرطیں پوری کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

آپی نے اسے اپنے گھر بلایا تھا۔ ان کے گھر مہمان آنے والے تھے تو وہ انکی مدد کے لیے وہاں چلی گئی تھی۔ جب رات کو گھر لوٹی تو امی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "تمہارے ابو بلا رہے ہیں۔ کمرے میں آؤ۔" امی کی سنجیدگی پر اسے حیرت ہوئی۔ "اچھا چادر اتار کر آتی ہوں۔" امی نے سر ہلا دیا۔ وہ چادر اور پرس رکھنے کے بعد باہر نکل آئی تھی۔ دروازے پر رک کر ہولے سے دستک دی تھی۔ "آجاؤ۔" ابو کی سنجیدہ سی آواز آئی۔

"السلام علیکم ابو جی۔" وہ چہرے پر مسکراہٹ لاتے اندر داخل ہوئی۔ امی بیڈ کی دوسری جانب بیٹھی تھیں۔ "وعلیکم السلام۔ آؤ بیٹھو۔" ابو نے بیڈ پر اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اللہ خیر کرے کیا معاملہ ہے۔" وہ ماحول کی سنجیدگی کو دیکھتے دل میں سوچنے لگی۔ پھر چل کر ابو کے سامنے جا کر بیٹھ گئی تھی۔ ابو آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ مریم پاؤں والی سائیڈ سے دونوں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی تھی۔ "جی ابو آپ نے بلایا تھا۔" ماحول پر چھائی سنجیدگی اسے ڈرانے لگی تھی۔

"میر حاشر کون ہے؟" ابو کی آواز آئی۔

"جی۔۔" وہ ابو کے تاثرات دیکھ کر سن ہوئی۔ "نام سے جانتی ہوں۔ میری ہاسٹل فیلو کا بھائی ہے۔ باقی نہیں پتہ۔۔۔" یہ زندگی میں پہلی بار تھا کہ اسکے ابو نے اس سے کسی لڑکے کی بابت سوال کیا تھا۔

"آج اس کا رشتہ لے کر اس کے والدین آئے تھے۔" مریم خاموشی سے ابو کو دیکھنے لگی۔ جب کہ ابو اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ "تم میر حاشر کو کتنا جانتی ہو؟ یہ کیا معاملہ ہے؟"

مریم کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ وہ بھلے بے قصور تھی لیکن جب ابو نے سخت لہجہ اختیار کیا تھا تو اسے لگا۔ وہ یہیں گر پڑے گی۔ زندگی میں سب سے زیادہ محنت تو اپنی عزت اور اعتبار بنانے میں کی تھی۔ تو کیا وہ ناکام رہی تھی؟ مریم نے لمحہ بھر کو ابو کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں صرف سختی نظر آئی تھی۔ "جب میں بے قصور ہوں تو ڈر

کیوں رہی ہوں۔" اس نے خود کو ہمت دی۔پھر اس نے ابو کو ہوٹل والے واقعے سے لے کر ہاجرہ بی بی کے ہاسٹل آنے تک کی ساری باتیں بتادی تھیں۔اس دوران ابو اور امی کی نظریں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔"اسکی پھپھو نے تمہیں کیوں سنا دیں اتنی۔۔"امی کو یہ سن کر غصہ آیا تھا۔

" کیونکہ ان کے خیال سے ان کے بھتیجے کے انکار کے پیچھے میرا ہاتھ ہے اس لیے۔۔"

"واقعی؟؟"

"امی۔۔کیا ہو گیا ہے۔میں آپ کو ایسی لگتی ہوں۔" وہ روہانسی ہو کر رو دینے کو تھی۔

"اوہوں۔۔"ابو نے امی کو دیکھ کر سرزنش کی۔"بیٹا آپکی امی کی بات کا مطلب یہ نہیں تھا۔

"ابو میں نے ہمیشہ اپنی اور آپ کی عزت کا خیال کیا ہے۔میں کیا آپ کو ایسی لگتی ہوں۔" بولتے ہوئے اسکا لہجہ بھرا گیا تھا۔امی ابو کی اس عدالت نے اس کا دل دکھا دیا تھا۔

"ارے نہیں میرا بچہ۔۔" ابو نے آگے بڑھ کر اس کا سر تھپتھپایا۔مریم نے پلکیں جھپک کو آنکھوں کی دھندلاہٹ کم کرنے کی کوشش کی۔"اس معاملے میں تم سے پوچھنا ضروری تھا اس لیے پوچھا۔اور پوچھنے کا مطلب یہ نہیں کہ تم پر اعتبار نہیں ہے۔ہم صرف اس فیملی کے متعلق جاننا چاہتے تھے جو آج رشتہ لے کر آئے ہیں۔کہ وہ کیسے لوگ ہیں۔اور تم انہیں کتنا جانتی ہو اور تمہاری ان کے بارے میں کیا رائے ہے۔"

"میں زیادہ نہیں جانتی۔چند دن پہلے ہی ان کے گھر گئی تھی۔وہ بھی آخری وقت پر مسئلہ ہو گیا تھا۔اور ان کے بیٹے سے بھی ایک دو بار سرسری ملاقات ہوئی ہے اور وہ مجھے اس میں پسند نہیں آیا۔" وہ نظریں جھکائے رہی۔اب اس کا لہجہ متوازن تھا۔"برا لڑکا ہے؟"ابو نے سوال کیا۔مریم مرجانے کو تھی۔بھلا کب اسکی ابو سے اس طرح کے ٹاپک پر بات ہوئی تھی۔

"اچھا برا تو نہیں پتہ مجھے بہت مغرور لگا۔"

"اس معاملے پر تمہاری کیا رائے ہے؟انہیں دوبارہ بلائیں۔؟" آپی کے رشتے کے وقت امی نے ان سے یہ سوال پوچھے تھے۔اسے نہیں معلوم تھا کہ اس سے ابو پوچھیں گے۔شرم کے مارے اس کی ٹانگیں مزید کانپنے لگی تھیں۔لیکن خود کو پر اعتماد ظاہر کرنے کو اس نے سر اٹھا کر امی،ابو کو دیکھا۔"جو آپ کو مناسب لگے۔ابو جی

آپ کا فیصلہ حرفِ آخر ہے۔میں جاؤں۔۔" وہ بات ختم کر کے بس بھاگنا چاہتی تھی۔

"ہاں جاؤ۔" اجازت ملتے ہی وہ تیزی سے باہر کو آئی تھی۔

دو دن ہی گزرے تھے کہ ابو نے پھر اسے طلب کرلیا تھا۔اور اس بار اسکے کزن کی رشتے کی بابت پوچھا تھا۔اپنے کزن کا نام سنتے ہی اس کے اندر غصے کی لہر اٹھی تھی۔وہ خاموشی سے ابو کی بات سنتی رہی۔جو کہہ رہے تھے کہ اپنے بہت بہتر ہوتے ہیں۔لیکن پھر بھی وہ اسکی رائے جاننا چاہتے ہیں۔اور اس دوران ابو نے لمحے بھر کو بھی اس سے نگاہیں نہیں ہٹائی تھیں۔

اسے سمجھ نہیں آیا یہ بے اعتباری تھی کہ واقعی یہ ضروری تھا۔دو دن پہلے کسی انجان بندے کا رشتہ آتا ہے تو اسے بلا کر پوچھتے ہیں کہیں اس میں اسکا ہاتھ تو نہیں۔اور پھر دو دن بعد ہی ان کے بھتیجے کا رشتہ آتا ہے اور ابو کہتے ہیں کہ وہ اپنا ہے اور بہتر ہے۔تو کیا ابو یہ سمجھ رہے تھے۔کہ پہلا رشتہ وہ لائی تھی یعنی اسکی پسند تھا تو اس سے باز رکھنے کو متبادل اس طریقے سے پیش کیا تھا کہ بیٹی یہ بھی نہ سمجھے کہ باپ اعتبار نہیں کرتا۔ اور اس رشتے سے پیچھے ہٹ جائے۔اسے بہت دکھ ہوا تھا یہ سوچ کر کے ابو اس پر شک کر رہے ہیں۔یا شاید سب باپ ایسے ہی بی ہیو کرتے ہونگے۔وہ سر جھکائے سوچے جا رہی تھی۔یا شاید ابو ایسے نہ سوچ رہے ہوں میرا وہم ہو یہ۔۔ابو ویسے ہی مجھ سے رائے مانگ رہے ہوں۔وہ خود کو جواز دے رہی تھی۔اپنی فضول سوچوں کو رد کر رہی تھی۔

" تمہاری کیا رائے ہے؟" ابو نے گیند اسکی کورٹ میں ڈالی۔" ابو مجھے حمزہ نہیں پسند۔اسکے علاوہ آپ جہاں میری شادی کرنا چاہیں۔"

ابو جو کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے ایک دم سے سیدھے ہوئے۔" کیا مطلب۔۔"

" مطلب مجھے حمزہ سے شادی نہیں کرنی۔اس کے علاوہ کہیں بھی۔۔"

"اس سے کیوں نہیں؟ اسکے علاوہ کون؟"

" وہ بہت بار میرا راستہ روک کر مجھے تنگ کر چکا ہے اس لیے۔مجھے نہیں پسند وہ۔"

" تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔پوری بات بتاؤ۔کیا ماجرہ ہے۔"

" جب سے اسلام آباد میں پڑھنا شروع کیا اس نے مجھے تنگ کرنا شروع کیا۔اس کے خیال سے میں

گھر سے دور رہنے لگی ہوں تو میں اچھی لڑکی نہیں رہی۔" وہ یہ نہ کہہ سکی کہ وہ اسے آوارہ کہتا تھا۔" راستہ روک کر فضول جملے کستا تھا۔اور پھر کہتا کہ میں تم سے شادی کر کے تمہارے سارے کس بل نکال دوں گا۔"

اوہ مریم عالم۔۔

ابو کا تو اتنا سا ہی سن کر چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔مریم سر جھکائے بیٹھی تھی۔" تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔"

" مجھے لگا بات بڑھ جائے گی۔اور جب پھیلے گی تو خوامخواہ مجھ پر کیچڑ آئے گی بھلے میرا قصور نہ ہو۔"

" تمہاری امی کو معلوم ہے؟"

" نہیں گھر میں کسی کو نہیں بتایا میں نے۔بس پہلے سے زیادہ احتیاط شروع کر دی۔چاچو کے گھر جانا چھوڑ دیا ہے اور یہاں اکیلے کہیں نہیں جاتی۔ہمیشہ علی چھوڑ آتا ہے اور لے آتا ہے۔اور جب حمزہ گھر آتا ہے تو میں اپنے کمرے میں ہی رہتی ہوں۔"

" پاگل دھی۔۔ایسی باتیں باپ سے بھی کوئی چھپاتا ہے؟تم بتاؤ گی نہیں تو ایسے تو ہم ساری زندگی اس سانپ کو گھر میں آنے دیتے۔اور اپنے گھر میں تم کیوں قید ہو جاتی تھی۔مجھے معلوم ہوتا تو میں اس کا آنا جانا بند کرتا۔اور پاگل بچہ ایسی باتیں چھپائی جاتی ہیں اور وہ بھی ماں باپ سے؟ مجھے نہیں تو اپنی امی کو بتا دیتی کم از کم گھر والوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کون ان کے بچوں کا دشمن ہے۔تا کہ کسی بھی نقصان سے بچ سکیں۔میرا بچہ۔۔"

ابو نے اٹھ کر اسکے سر کو چوما تھا اور کتنی دیر اسکے سر پر ہاتھ رکھے کھڑے رہے۔مریم نے ابو کے پیار کو محسوس کر کے خود کو اپنی تھوڑی دیر پہلی والی سوچوں پر ملامت کی تھی۔وہ اسکے ابو تھے اور ماں ،باپ جب کچھ پوچھتے ہیں تو اسکا مطلب بے اعتباری نہیں ہوتا۔اور اگر ہو بھی تو اپنی ایمانداری سے پھر ان کا دل جیت لینا چاہیئے۔"

میرا پیارا بچہ۔پاگل۔۔" ابو سر کو چومتے اور پھر کہہ اٹھتے۔مریم کو ڈھیروں سکون اپنے اندر اترتا محسوس ہوا تھا۔تحفظ کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ابو ہر سوال کو بھول کر بیٹی کو کمفرٹ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔پھر وہ ہنستے ہوئے ابو کے کمرے سے باہر آئی تھی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ ابو نے کیا فیصلہ کیا تھا۔پھر مریم کے وہاں ہوتے میر حاشر کے گھر والے دو بار آئے تھے۔ابو نے اپنے بھتیجے کو انکار کہہ کر میر حاشر کے خاندان کو ہاں کہہ دی تھی۔یہ بالکل غیر متوقع بات

تھی۔اس کے چاچو ناراض ہونے لگے تھے۔حتیٰ کہ امی تک اس فیصلے سے راضی نہیں تھیں۔ان کے خیال سے اپنے شہر میں ہی بیٹی کی شادی کرنی چاہیئے تھی۔اتنی دور بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔اگر بھتیجے کا رشتہ پسند نہیں تھا تو کوئی اور اچھا رشتہ آجاتا۔

ابھی مریم کی عمر ہی کیا تھی۔لیکن ابو نے امی کے سارے اعتراضات کو رد کر دیا تھا۔ویسے بھی وہ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس کی دوسرے شہر شادی ہو رہی تھی۔ان کے ہاں ایسا نہیں ہوتا تھا اپنے غیر جہاں بھی ہوتا لیکن اپنے ہی شہر میں بیٹی دی جاتی تھی۔اس لیے اس کے گھر میں تقریباً سبھی خوشی کے اس موقع پر عجیب ہی محسوس کر رہے تھے۔

"اب کیا تم اتنی دور چلی جاؤ گی۔۔" آپی اور علی دونوں اداس لگ رہے تھے۔اس نے کندھے اچکا دیے۔وہ کیا کہہ سکتی تھی ابو کا فیصلہ تھا۔"اچھی فیملی ہے۔گھر بھی دیکھ آیا ہوں۔لڑکا بہت ہی اچھا ہے۔اور یہ بھی کہہ دیا ہے کہ مریم ان کے آبائی شہر کی بجائے اسلام آباد رہے گی۔تم سمجھو کہ جیسے وہ پڑھنے گئی ہوئی ہے۔ہر ماہ ملنے آتی رہے گی۔جیسے اب تک آتی رہی ہے۔" ابو ، امی کو دھیمی آواز میں سمجھا رہے تھے۔وہ جو امی کے پاس آرہی تھی انھیں باتیں دیکھ کر پلٹ گئی تھی۔

"میں تو اس انتظار میں تھی کہ دو سال بعد لوٹ آئے گی۔آپ تو ہمیشہ کے لیے اسے پردیسی کر رہے ہیں۔"

"لڑکا بہت اچھا ہے۔مجھے بہت پسند آیا ہے۔وہ خوش رہے گی وہاں۔بھلے دور ہو گی مگر خوش ہو گی۔اتنے اچھے رشتے کو دوری کی وجہ سے تو رد نہیں کر سکتے۔آج کے دور میں پھر فاصلے اتنے نہیں کہ ملنے میں سالوں لگ جائیں۔" امی ابو کی میٹنگ جاری تھی۔

ابو کے ہاں کرتے ہی اگلے دن وہ لوگ رسم کرنے آگئے تھے۔اور جب باقاعدہ رسم کرنے آئے تو اتنا ڈھیروں سامان۔مریم کے گھر والوں کے لیے بھی تحفے تھے۔جسے اسکی امی نے بہت اصرار کے باوجود بھی قبول نہیں کیا تھا۔"ہاجرہ بہن ہمارے ہاں بیٹی کے سسرال سے صرف بیٹی کے لیے چیزیں آتی ہیں۔ہم سب کے لیے ان کو قبول کرنا عیب ہے۔آپ برا نہ مانیں۔لیکن ہماری ریت ہے۔" ہاجرہ بی بی کیا کہتیں وہ خود بھی جانتی تھیں ان کے ہاں بھی تو ایسا ہوتا تھا لیکن وہ بیٹے کی خوشی میں اپنے سمدھیوں کو بھی تحفے دینے چاہتی تھیں۔جو

حسب توقع قبول نہیں کیے گئے تھے۔

"مریم تمہاری ساس تو لگتا ہے پورا اسلام آباد لوٹ لائی ہیں یار۔۔بھئی میری شادی بھی بہت اچھی ہوئی تھی لیکن تمہاری ساس تو پہلی رسم پر اتنا کچھ لے آئی ہیں۔"

"ابھی آگے دیکھیے گا۔یہ لوگ تحفے دینے کا بہت شوق رکھتے ہیں۔" مریم ہنسی۔ان تحفوں سے اسکا بیڈ بھر چکا تھا اور اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کہاں سے سمیٹے۔اف ہاجرہ اماں۔۔رشتہ طے ہونے کے بعد وہ ہاسٹل آگئی تھی۔نیا سمسٹر شروع نہیں ہوا تھا ابھی۔لیکن اسکی ریسرچ کی وجہ سے اسکے پاس بہت کام تھا۔بہت کام اس لیے کہ وہ آخری وقت پر ریلیکس کرنا پسند کرتی تھی۔

سو پہلے بھرپور محنت جاری تھی۔امی سے پتہ چلا تھا کہ اب وہ لوگ شادی کی تاریخ مانگ رہے تھے۔مریم کراہ کر رہ گئی تھی۔اس نے ڈیڑھ سال دل لگا کر اس لیے نہیں پڑھا تھا کہ آخری سمسٹر میں اسکی شادی کر دی جاتی۔پھر پتہ نہیں وہ اس طرح پڑھ پاتی کہ نہیں۔امی سے کہا تھا کہ مہلت مانگیں۔لیکن پھر بھی اسے ڈر تھا ابو تاریخ دے ہی نا دیں۔اب وہ کس سے کہتی کہ شادی فائنل کے بعد کی جائے۔

نیناں سے کہتی ہوں۔۔نہیں پتہ نہیں کیا سوچے پہلے کی بات اور تھی نند بن جائے گی اب تو۔۔اس نے خود ہی اپنی سوچ رد کی تھی۔یا اللہ کیا کروں۔۔کیا میر حاشر کو فون کروں؟ مر کر بھی نہیں۔۔پتہ نہیں کیا سوچے۔۔وہ سوچتی ہی رہی۔پھر وہ لیب جانے کے لیے ہاسٹل سے نکلنے لگی،تو سامنے میر حاشر اپنی فور بائے فور کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔مریم نے شکر کا سانس لیا۔اللہ نے بن کہے سن لی تھی۔نیناں اور ناز کی چھٹیاں تھیں۔اسے نہیں معلوم تھا کہ ناز ہاسٹل تھی اور وہ اسے لینے آیا ہوا تھا۔مریم کو دیکھ کر اس نے کوئی رسپانس نہیں کیا تھا۔جیسے کھڑا تھا،کھڑا رہا۔مریم نے ہولے سے قدم اٹھائے۔اب جو بندہ آپکو دیکھ کر کوئی رسپانس نہ دے اس تک خود چل کر جانا بھی اسے بے عزتی کے مترادف لگ رہا تھا۔مریم اس سے نگاہ ہٹاتی دائیں سمت چل پڑی تھی۔اسکے قدم سست تھے۔تھوڑی دیر پہلی والی سوچ پر ہنسی آئی کہ اسے کہوں گی تو مان جائے گا۔پھر چند لمحوں بعد اسے اپنے قریب کسی کی موجوگی کا احساس ہوا۔ایک خوبصورت خوشبو کی مہک سانسوں تک آئی تھی۔مریم نے چلتے ہوئے رک کر گردن موڑی۔میر حاشر تھا۔مریم نے سوالیہ اسکے چہرے کو دیکھا۔

" آپ کو کچھ کہنا تھا وہی سننے آیا ہوں۔" مریم کے سوالیہ انداز پر وہ بولا۔" اچھا آپ سے کس نے کہا؟" اب وہ اسے نہیں بتانا چاہتی تھی۔ بڑا آیا مغرور انسان ۔۔" خود آپ نے۔چلیں کہیں۔" کیا ہی کہنے تھے اس بندے کے۔کون کہہ سکتا تھا کہ اس لڑکی سے شادی کرنے کے لیے وہ اپنے خاندان سے ٹکر لے رہا تھا۔" میں نے کب کہا۔؟" مریم کی تیوری چڑھ چکی تھی۔

" کچھ کہنا ہے آپ نے کہ میں جاؤں۔" وہ اسی اطمینان سے بولا۔مریم نے لب بھینچے۔دل چاہا اس دو حرف بھیج کر چل دے مگر نہیں۔اسکی پڑھائی کا سوال تھا۔اسکی محنت تھی۔زرا سی بات پر وہ سالوں کی محنت ضائع کرنا افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔" آپ کے گھر والے شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔میرا ابھی فائنل سمسٹر رہتا ہے۔میں نے اتنی محنت کی ہے سب ضائع ہو جائے گی۔"

" کیوں؟"

" کیونکہ شادی کے بعد زندگی مختلف ہو جاتی ہے۔ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔یہ نہ ہو گھر کی ذمہ داریوں کی وجہ سے پڑھائی سے توجہ ہٹ جائے یا پڑھائی کی وجہ سے گھر کی نہ کر پاؤں۔"

"مطلب آپ مینج نہیں کر پائیں گی۔"

"جی۔میرے لیے مشکل ہے۔میں ایک ساتھ بہت سی ذمہ داریاں نہیں لے سکتی۔ہاں اگر آپ لوگ چاہیں تو منگنی یا نکاح کر لیں۔مگر شادی میرے فائنل کے بعد۔آپ سے اس لیے کہہ رہی ہوں کہ آپ کے گھر والوں کے اصرار پر ابو مان جائیں گے اور میری ماسٹرز کی پوزیشن ختم ہو جائے گی۔" حاشر کو معلوم تھا وہ پوزیشن ہولڈر تھی اور قوی امکان تھا کہ گولڈ میڈل ون کرتی۔

" ٹھیک ہے۔شادی فائنل کے بعد۔" مریم بنا شکریہ کہتی سر ہلاتی پلٹ گئی۔میر حاشر بھی واپس اپنی جگہ پر آ کھڑا ہوا تھا اور اسے تب تک دیکھتا رہا۔جب تک وہ ٹیکسی میں بیٹھ نہ گئی۔نہ میر حاشر نے اسے خود چھوڑ آنے کی آفر کی تھی نہ مریم عالم نے اس سے توقع کی تھی۔بلکہ اگر وہ آفر کرتا تو مریم اسے چھچھورا کہہ دیتی۔وہ دونوں ہی بہت عجیب تھے اور ایک دوسرے کا بیسٹ میچ تھے۔

☆......☆......☆

نکاح کے بعد جب میر حاشر کو اسکے پہلو میں بٹھایا گیا تو مریم کا دل دھڑک اٹھا تھا۔سفید سوٹ، گھیر دار شلوار اور سر پر بندھی پگ۔وہ روایتی انداز میں تیار ہوا تھا۔مریم اسکے سٹیج تک آنے سے پہلے اس پر ایک نگاہ ڈال چکی تھی اور ابھی تک اس نگاہ کے زیر اثر تھی۔وہ کتنا شاندار مرد تھا۔اونچا، لمبا، خوبصورت، رعب دار اور خالص بلوچ۔۔۔اور کیا چاہیئے تھا اسے۔ان کے ہاں دلہا دلہن سٹیج پر بیٹھ کر آپس میں گفتگو نہیں کرتے تھے۔اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔وہ بھی وہاں بیٹھا اپنے قریب کھڑے لوگوں سے بات چیت کر رہا تھا۔بھولے سے بھی مڑ کر اپنی بیوی کو نہیں دیکھا۔اور مریم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسکے ساتھ بیٹھے وہ اپنی بہن سے ہی بات کر سکے۔جو اسکے قریب ہی بیٹھی تھی۔

اسکی چاچی جو یہ پھیلانا چاہ رہی تھیں کہ مریم کی لو میرج تھی کیونکہ انکے بیٹے کے لیے انکار کیا گیا تھا۔ان دونوں کے روایتی سے لیے دیے (دلہن دلہا) انداز کے بعد اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھیں۔

مریم نے پھر اپنی نکاح کی تصویروں کو جی بھر کر دیکھا تھا۔اور میر حاشر نے؟؟ یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی۔اس کا موڈ ہمہ وقت خوشگوار رہتا تھا۔جب خوشگوار نہیں ہوتا تھا وہ مریم کی تصویریں دیکھ لیتا تھا۔

نکاح کے چند دن بعد مریم کے فائنل کی کلاسز شروع ہو گئی تھیں۔نیناں اور ناز روز صبح اسکے کمرے میں ملنے آتیں۔وہ انکی بڑی بھابھی تھی۔اور اب ان کے خاندان کی نئی ملکہ۔۔مریم کے لیے یہ سب نیا تھا لیکن اسے پھر بھی پسند آ رہا تھا۔ردا تو ہر وقت چھیڑتی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔کیونکہ مریم سب کے سامنے تو ڈیسنٹ سی بنی رہتی تھی لیکن کمرے میں آتے ہی اسکے چہرے پر خوشی کے بعد والی مسکراہٹ کھل کر ظاہر ہوتی تھی۔"تم تو کہتی تھی کہ نہیں جانتی اسے۔۔ہم۔۔"

"ہاں تو صحیح کہا تھا۔" مریم ہنسی۔"لڑکی مجھے دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔روز کتنے گھنٹے بات کرتی ہو۔"

"فضول نہ بولو۔شادی سے پہلے بات چیت سختی سے حرام ہے ہمارے ہاں۔" مریم کی ہنسی سے ردا مشکوک ہو رہی تھی۔جب کہ مریم کو ہنسی ردا کے اندازوں پر آ رہی تھی۔

" آج ایک ہی بار بتا دو کہ تمہارے ہاں کیا کیا نہیں ہوتا۔۔" ردا چڑ گئی۔" دیکھو ردا بہن میں ایک روایتی بلوچ فیملی کی لڑکی ہوں۔اور روایتی خاندان کیسے ہوتے ہیں سب کو پتہ ہے۔خوش قسمتی سے میری جہاں

شادی ہو رہی ہے وہ بھی روایتی بلوچ ہیں۔ جہاں شادی سے پہلے لڑکا لڑکی آپس میں نہیں بولتے۔ باقی روایات رہنے دو۔ فی الحال تمہارے لیے اتنا کافی ہے۔"

"تو مریم بہن آپ کا دم نہیں گھٹتا ان روایات سے۔ آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ آزادی سے پھریں۔۔اور۔۔"

"ایک منٹ۔۔ میں کوئی قید نہیں ہوں۔ تم بھی جانتی ہو۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے اکٹھے ہیں۔ زندگی کو بھرپور طریقے سے جیتی ہوں۔ اور گھر والوں کی طرف سے بھی کوئی پابندیاں نہیں ہیں۔ بہت سی باتیں ہمیں باقاعدہ بیٹھ کر نہیں سمجھائی گئی ہیں، جیسے تمہارے خیال سے میرے گھر والوں نے کہا ہوگا کہ کوئی لڑکا نہ آئے تمہاری زندگی میں اینڈ فلاں فلاں۔۔ میرے گھر میں کبھی مجھے ایسا نہیں کہا گیا۔ ہمارے ہاں کہا بھی نہیں جاتا۔ لیکن تم میرے خاندان کی جس لڑکی سے ملو گی اس معاملے میں سب کی سوچ کو ایک جیسا پاؤ گی۔ ہمیں اس طرح پروان چڑھایا گیا ہے کہ ہم اچھائی برائی سمجھائے بغیر جانتی ہیں۔ ہمیں پتہ ہے مرد ایک ہی آتا ہے زندگی میں اور وہ صرف شوہر ہوتا ہے۔ اور سریسلی مجھے تو کبھی اپنی روایات سے مسئلہ نہیں ہوا اور نہ ہی گھٹن کا احساس۔۔ پتہ نہیں لوگوں کی سوچ ایسی کیوں ہوتی ہے کہ اگر روایات کو مانا جائے تو زندگی قید ہو جاتی ہے۔ زندگی جینے کا ہنر آنا چاہیئے ہر شے میں خوشی مل جاتی ہے۔"

مریم نے اسے دیکھ کر کندھے اچکائے۔ ردا نے متاثر ہونے کے انداز میں دیکھا۔ "شاید دنیا کی پہلی عورت ہو جو اپنی روایات سے خوش ہو۔ جو صدیوں سے قائم کردہ حدود میں رہ کر مطمئن ہو۔ نہ انہیں توڑتی ہو نہ توڑنے کی خواہش رکھتی ہو۔ فرسٹریشن کا شکار نہیں ہو۔ جو جتنا مل رہا ہے خوشی سے قبول کرتی ہو۔ جو نہیں مل رہا اسکے لیے محنت نہیں کرتی ہو۔ پتہ ہے میں نے روایات سے باغی دیکھے ہیں۔ انہیں چور راستے تلاش کرتے دیکھا ہے۔ پھر ان راستوں پر چلتے دیکھا ہے۔ اور جو کچھ نہیں کر سکتے تو وہ فرسٹریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ زندگی بیت جاتی ہے مگر خوشیوں کا منہ نہیں دیکھ پاتے۔ یار تم کیا چیز ہو۔ مجھے زندگی میں کبھی کسی انسان نے اتنا حیران نہیں کیا جتنا تم نے کیا ہے۔"

"انسان پر منحصر کرتا ہے وہ کس چیز کو اپنی خوشی بنائے۔ میرے خیال سے اپنی خوشیاں آپ خود مقرر کرتے

ہیں۔باغیوں کے لیے خوشی دوسرے راستوں پر ہوتی ہے۔میرے لیے اسی راستے پر ہے جہاں میں ہوں۔میں عام سی لڑکی ہوں۔میرے اندر اتنا لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔اور لڑوں تو کس لیے۔سب تو مل رہا ہے۔جو نہیں مل رہا یقیناً اس میں بھی بھلائی ہوگی۔" ردا نے بے ساختہ اسے گلے لگا لیا۔

" بعض دفعہ مجھے بہت افسوس ہوتا ہے بلکہ دل دکھتا ہے۔۔" وہ بولتے ہوئے چپ کر گئی۔جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔" کہ تم سے پہلے کیوں نہیں ملی۔۔" ردا نے زبان تک آئی بات کو پھیر کر کچھ اور کہہ دیا تھا۔مریم کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی کہ اسکی بیسٹ فرینڈ کو کس بات کا ملال اکثر مریم سے نگاہیں چرانے پر مجبور کر دیتا تھا۔وہ باتیں کر رہی تھیں کہ مریم کا فون بج اٹھا۔مریم نے اٹھ کر بیڈ کے ایک کونے میں رکھے موبائل کو اٹھایا۔انجان نمبر تھا۔اس نے کال اٹینڈ کی۔" ہیلو۔" سخت لہجہ تھا۔" میر حاشر بات کر رہا ہوں۔کیسی ہو۔"

مریم نے ایک دم سے ردا کو دیکھا۔جو اس سے رخ موڑے اپنے بیڈ کی چادر ٹھیک کر رہی تھی۔" ٹھیک ہوں۔آپ؟"

" میں بھی ٹھیک ہوں۔آج رات کو تمہیں ڈنر پر لے جانا چاہ رہا تھا۔"

" جی۔۔۔۔" مریم کو جھٹکا لگا۔ابھی تو ردا کو اپنی روایات سنا کر اٹھی تھی۔" آٹھ بجے تیار رہنا لینے آؤں گا۔" مریم کے ماتھے پر بل پڑے وہ پوچھ نہیں رہا تھا، بلکہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ ڈنر ساتھ کریں گے۔جیسے بڑے ہی کوئی محبت بھرے قصے رہے ہوں ان کے۔پہلی بار باقاعدہ گفتگو ہو رہی تھی اور کیا ہی خوبصورت انداز میں ہو رہی تھی۔

" میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ابو سے اجازت لے لیں۔وہ اجازت دیں گے تو میں تیار ہو جاؤں گی۔" جب اس نے پوچھا نہیں تھا تو اسکے حکم پر وہ ایسے ہی انکار کر سکتی تھی۔" ٹھیک ہے۔" اس نے کال کاٹ دی تھی۔مریم کتنی دیر فون کو گھورتی رہی۔ابو سے اس نے پوچھنا نہیں تھا۔اتنا تو اسے بھی معلوم تھا۔

لیں جی آپ میں اتنی ہمت ہے کہ آپ روایتی سے خاندان کے ہوں۔اور آگے سسرال بھی آپ ہی کے جیسا روایتی ہو۔اور رومینٹک ڈنر کے لیے اجازت اماں، بہن، بھابھی۔۔ارے نہیں باقاعدہ ابا حضور سے لی جائے۔چلیں چھوڑیں رہنے دیں۔کیا موڈ کو خراب کرنا۔اور دامادی عزت کو داؤ پر لگانا۔گناہ کر دیا کہ سوچا

نکاحی بیوی کے ساتھ رومینٹک ڈنر۔۔چلیں رومینٹک نہ سہی ڈنر ہی کیا جائے۔تو بتائیں کس نے کہا تھا کہ ایسا سوچیں۔جی بالکل آپ کی اپنی سوچ تھی اوراس گناہ کو کسی اور سر نہ تھوپیں۔

مریم ابو کے انکار کے بعد اسکا سرخ چہرہ دیکھنا چاہتی تھی۔بڑا آیا اسے نخرہ دکھانے والا۔اس سوچ کے آتے ہی اسکیچہرے پر مسکراہٹ کھل اٹھی تھی۔ردا نے بیڈ پر بیٹھ کر اسے دیکھا۔جو موبائل کو دیکھے مسکرارہی تھی۔" کیا ہوا کس کی کال تھی۔۔؟" ردا پھر سے مشکوک ہوئی۔مریم کے منہ سے چھوٹا سا قہقہہ نکلا۔" اف یار۔۔کسی کی نہیں تھی ایسے ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔" موبائل بیڈ پر پھینکتی وہ دھم سے بیڈ پر بیٹھی۔" تمہاری ہنسی بتارہی ہے۔کچھ نہیں میر حاشر یاد آ گیا تھا۔" مریم کی مسکراہٹ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔" تم نکاح کے بعد بہت بدل گئی ہو۔" مریم کو اسکے اندازوں پر اور ہنسی آئی۔جب کہ ردا کے خیال سے اسے کسی اور بات پر ہنسی آرہی ہے۔ردا کے تاثرات دیکھ کر مریم مسلسل ہنسے جارہی تھی۔

" بہت خوش ہو۔۔"

" پلیز اب یہ نہ کہنا کہ نکاح کی وجہ سے۔۔" مریم نے ہنسی کی وجہ سے نکلے آنسو صاف کرتے کہا۔ردا کہنا یہی چاہتی تھی لیکن پھر خاموش ہوگئی تھی۔پونے آٹھ بجے مریم کا فون بج اٹھا۔وہ لیپ ٹاپ پر مووی دیکھ رہی تھی۔نمبر دیکھا۔میر حاشر کا تھا۔اسے سوچ کر ہی ہنسی آئی کہ اب اس سے معذرت کرے گا۔خیر یہ بھی بڑی ہمت تھی سسر سے عزت افزائی کے بعد بیوی کو بتانا۔" ہیلو۔" مریم نے مسکراتے لہجے میں کہا۔" باہر آؤ میں آیا ہوا ہوں۔"

" جی۔۔" مریم کی مسکراہٹ گم ہوئی۔وہ بیٹھے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔" کہاں۔۔مطلب۔۔" مریم کی سمجھ نہ آیا کیا کہے۔" کہاں مطلب کیا۔۔ڈنر کے لیے کہا تھا تمہیں۔" حاشر نے حیرت سے اسے جواب دیا۔" میں نے تو کہا تھا ابو سے اجازت لیں۔۔"

" ہاں تو لے لی تھی۔۔"

" ہیں؟؟" مریم کو زندگی میں پہلی بار حقیقتاً کسی بات سے جھٹکا لگا تھا۔" جلدی آؤ۔مجھے انتظار کرنا نہیں پسند۔" وہ کہہ کر کال کاٹ گیا تھا۔مریم تو شاک میں موبائل کان سے لگائے کھڑی تھی۔پھر ہوش آیا وہ باہر انتظار

کر رہا تھا۔وہ جلدی سے آئینے کے آگے آ کھڑی ہوئی۔الجھے بال اور پر شکن لباس۔۔شکل کی تو خیر تھی کہ آج کل بڑی رونق تھی منہ پر۔

وہ بھاگم بھاگ اپنی الماری کی طرف بھاگی۔ردا جو ہاسٹل کے سیر سپاٹوں کے بعد کمرے میں آئی تو اسے جلدی سے اپنے سوٹ بیڈ پر ڈالتے دیکھے۔" کیا ہو گیا ہے۔"

" حاشر ڈنر کے لیے لینے آئے ہیں۔" وہ مڑے بغیر بولی۔پھر باٹل گرین لانگ فراک نکال کر باقی دوبارہ اندر رکھے۔" واہ جی روایتی لوگوں میں بھی ایسا ہوتا ہے۔۔"

دوستوں کی پہچان یقیناً انکی خباثت سے ہی ہوتی ہے۔" وہ ابو سے اجازت لے چکا ہے۔اس لیے میرے پاس انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔" مریم نے جلدی سے سوٹ استری سٹینڈ پر رکھ کر استری کا پلگ لگایا۔" ہٹو تم۔باقی تیاری کرلو۔" ردا نے اسکے ہاتھ سے سوٹ لے لیا تھا۔مریم نے جلدی سے منہ دھو کر بالوں کو آدھا سلجھا کر پھر سے باندھ لیا تھا۔

سوٹ پہن کر ریڈ شیڈ کی لپ اسٹک لگا لی تھی۔ردا تو اسے چھیڑے جا رہی تھی لیکن مریم کے پاس جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔اسکا موبائل پھر بج اٹھا۔" جی۔۔" اس نے جواب دیا۔کانوں میں ٹاپس ڈال رہی تھی۔" میں نے آٹھ بجے کا کہا تھا۔" اس کا لہجہ ناراض سا تھا۔مریم نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔" ابھی دو منٹ رہتے ہیں۔" مریم نے آرام سے جواب دیا۔حاشر نے فون کان سے ہٹا کر گھورا۔اور پھر کال کاٹ دی۔مریم نے ساس کی دی چادروں میں سے ایک نکال کر اپنے انداز سے لی تھی۔

" اوہ ہو۔۔" ردا نے اسے چھیڑا۔اسطرح چادر لینے کے باوجود بھی آج وہ اچھی لگ رہی تھی۔" میں تو سمجھتی تھی تم تو بالکل بونگی ہو گی۔" ردا کی زبان رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔" ہاں چادر لینے کا مطلب یہی ہوتا ہے نا کہ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں کہ شوہر سے ملنے کیسے جاتے ہیں۔"

ردا اس طنز پر کھلے دل سے مسکرائی تھی۔وہ اب بیڈ پر بیٹھی اپنی ہیل کے سٹریپس بند کر رہی تھی۔" لڑکی ہر بار جھٹکے ہی دیتی ہو۔۔آج بتا دو ہو کیا تم۔۔"

مریم پاؤچ میں موبائل ڈالتی اس کی بات کا جواب دیے بنا باہر کر بھاگی تھی۔" دنیا کی سب سے حیرت انگیز

مخلوق مریم عالم ۔۔" رداا سکے پیچھے بولی تھی ۔مریم بنا پلٹے ہاتھ ہلاتی چلی گئی تھی ۔وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی ۔وہ دیر سے جا کر یہ ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ ان پاگلوں میں سے ہے جو دیر سے آنا فخر سمجھتے ہیں ۔

اور ویٹنگ روم تک جاتی لمبی رہداری کو عبور کرتے اسے یاد آیا ۔ابو سے اس نے تو اجازت نہیں لی تھی ۔اففف ابو کیا سوچتے ۔اس نے جلدی سے موبائل نکالا ۔ابو کو میسیج کیا ۔پھر ایک ایک سیکنڈز گن رہی تھی ابو جی جواب دیں ۔۔پھر اس نے کال کر لی تھی ۔دل دھک دھک کر رہا تھا ۔شرم کے مارے عجیب حالت ہو رہی تھی ۔وہ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو شادی سے پہلے شوہر کے ساتھ باہر جا رہی تھی ۔ابو نے کال اٹینڈ کر لی تھی ۔سلام دعا کے بعد وہ مدعے پر آئی تھی ۔

"وہ ابو جی ۔حاشر نے ڈنر کا کہا ہے؟؟" اس کا لہجہ سوالیہ تھا جاؤں کہ نہیں ۔" ہاں مجھ سے پوچھا تھا اس نے ۔جاؤ ۔"

کال کاٹ کر وہ اپنے حواس قابو کرنے کی کوشش کرتی رہی ۔اسکے ہاتھ ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے ۔مریم نے دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیرا ۔یہ ہونقوں والے تاثرات گم کرنے تھے ۔پھر چند لمبی لمبی سانسوں کے بعد چہرے پر سنجیدگی طاری کرتی وہ بلڈنگ سے باہر آئی تو وہ لان میں ہاسٹل وارڈن کے ساتھ باتیں کرتا نظر آیا ۔" یہ تو باہر کھڑا تھا ۔۔" مریم بڑبڑاتی اس کے قریب گئی ۔پھر ہاسٹل وارڈن کو الوداعی الفاظ کہتے وہ آگے ہوا ۔مریم سے تو کوئی بات ہی نہیں کی تھی ۔پھر چلتے ہوئے رکا اور اسکے قریب آ کر اسکے دائیں ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا تھا ۔مریم نے حیرت سے اپنے ہاتھ کو دیکھا ۔ہاتھ تو یوں مضبوطی سے پکڑا تھا جیسے صدیوں کے یارانے تھے ۔جیسے محبت بھرے بچھڑے دل عرصے بعد ملے ہوں ۔اسکا ہاتھ پکڑے وہ آگے چلتا جا رہا تھا ۔

مریم نے بھی ہاتھ چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی ۔پھر گاڑی میں اسے بٹھایا تھا ۔اور جب وہ ہوٹل میں جانے لگے تب بھی گاڑی سے اتر کر اس نے مریم کا ہاتھ اسی طرح پکڑ لیا تھا ۔دیکھنے سے لگتا کہ بہت ہی محبت تھی ۔جب کے مریم کا دل جل چکا تھا ۔یہاں وہاں کی باتیں ہی کرتا رہا تھا ۔ایک بار بھی اسکی تعریف نہیں کی تھی ۔" سڑا ہوا انسان ۔۔"

وہ ہوٹل کے اوپن ایریا میں ایسی ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے جہاں سے نیچے سے پورا اسلام آباد نظر آ رہا تھا۔پھر اس سے باتوں میں اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اس نے تعریف نہیں کی تھی۔ان دونوں کی گفتگو عام سی باتوں سے شروع ہوئی تھی۔اور دنیا جہان کا ہر موضوع آ گیا تھا۔کچھ ذکر نہیں تھا تو بس اپنی ہی باتوں کا۔بس ایک بات جو مریم نے محسوس کی تھی کہ حاشر کی نظریں بس اسی پر رہی تھیں۔تعریف کا شکوہ بھی دم توڑ گیا تھا۔جب حاشر سنجیدگی سے گفتگو کرتا رہا تو وہ بھی اسی کے جیسے پکاؤ تاثرات لیے بیٹھی رہی۔جب گفتگو کے دوران حاشر نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔کبھی ہنس دیتا۔تو اس نے دیکھا اسکی بیوی بھی اس کی طرح تھی۔جب وہ ہنستا تھا تو اس کے بھی چہرے پر نرمی آ گئی تھی۔نپی تلی ہنسی۔حاشر کے اندر ڈھیروں قہقہے ابل رہے تھے۔وہ جانتا تھا وہ کیا کر رہی تھی۔جتنا تم ہنسو گے میں بھی اتنا ہی۔میں کوئی تم سے ملنے کو مرے جا رہی تھی کہ تمہاری باتوں پر قہقہے لگاؤں۔اگر اسے خود معلوم ہوتا کہ وہ کیا چیز تھی تو اپنی ہی محبت میں مبتلا ہو جاتی۔واپسی تک وہ اپنی باتوں تک آ چکے تھے۔

"اتنی مصروفیات بندے کو تھکا دیتی ہے۔آپ مصروفیات کم کریں اپنی۔" وہ اسکا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔اور وہ اسکی فکر میں بول رہی تھی۔" کسی کام کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔سرداری کی مصروفیات کم نہیں ہو سکتیں کیونکہ علاقہ میں نے ہی سنبھالنا ہے۔بزنس میں اور بھائی بھی ساتھ ہیں لیکن بابا جان کبھی بھی گوارا نہیں کریں گے کہ میں بزنس بھائیوں کے حوالے کر دوں۔بقول بابا جان بڑا بھائی ہوں تو باپ کے جیسا ہوں۔"

"اور سیاست؟۔۔"

" میرا اپنا شوق ہے۔یا بزنس کرتا یا سیاست۔لیکن بابا جان نے دونوں میں ہی گھسا دیا۔حقیقتاً اپنی ذات کے لیے وقت نہیں ملتا۔"

"اسی لیے کہہ رہی ہوں۔کوئی تدبیر نکالیں مصروفیات سے نکلنے کی۔"

☆......☆......☆

اسکے فائنل سمسٹر کی وجہ سے حاشر مہینے بعد آتا اسے لینے۔کبھی کہیں لے جاتا کبھی کہیں۔وہ ہر بار ابو سے پوچھ کر تصدیق کرتی تھی کہ آیا انکی اجازت تھی۔ابو ہر بار کہتے ہاں چلی جاؤ۔لیکن یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ بیٹا

پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔وہ اسکے ابو تھے مریم جانتی تھی ابو یہ چاہتے تھے کہ وہ جب بھی حاشر کے ہمراہ کہیں جائے تو انہیں معلوم ہو۔

ایک دو بار ایسا ہوا کہ حاشر رات گئے اسے ملنے آیا۔اور پندرہ بیس منٹ بعد چلا گیا۔اگر مریم اپنی پڑھائی کی وجہ سے مصروف تھی تو میر حاشر کے پاس مصروفیات کا ڈھیر تھا۔وہ پھر بھی اس سے وقت نکال کر اس سے ملنے آجاتا تھا۔زندگی خوبصورت اور آسان تھی۔ ہر چیز اپنے دائرے میں تھی۔ایک نارمل طریقے سے۔اسکی ڈگری کے ختم ہونے کا وقت قریب تھا۔اور اس نے حاشر سے کہہ دیا تھا کہ اسکے پیپرز کے بھی ہفتے کے بعد وہ لوگ شادی کی تاریخ لینے آئیں۔وہ خود پڑھائی کو اہمیت دینے والا شخص تھا اسے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔اسکے تین پیپرز رہ گئے تھے جب ردا وہاں سے چلی گئی تھی۔اور اس لمحے مریم کی پرسکون زندگی میں واحد تکلیف اسکی دوست کا یوں جانا تھا۔

اگلے دن ان کا پیپر تھا۔مریم ہمیشہ کی طرح رویژن کر رہی تھی۔ردا کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔وہ کافی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ ردا ،الجھی الجھی سی ہے۔مریم جب پیار سے بات کرتی تو وہ ہر بار جیسے اسے کچھ بتاتے بتاتے چپ کر جاتی تھی۔وہ کسی ذہنی کشمکش کا شکار تھی۔اور مریم جیسی بے وقوفی کی حد تک ہمدرد لڑکی اس بات کو محسوس نہیں کر پائی تھی کہ ردا اس سے کچھ کہتے کہتے خاموش ہوجاتی ہے۔تو وہ اصرار کر کے پوچھ لے۔وہ "دا " مریم تھی جس کا خیال تھا جو چیز دوست کو تکلیف دے رہی ہے میں اس کا ذکر چھیڑ کر اس تکلیف کو کیوں بڑھاؤں۔مریم کا خیال تھا کہ اسکا گھر کا کوئی مسئلہ تھا اور وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔اس بے چاری کی زندگی پر اسے ترس آتا تھا۔ماں باپ کی علیحدگی کے بعد اسکی زندگی بے ترتیب ہوگئی تھی۔امیر ماں باپ کی اولاد تھی مگر ناخوش رہتی تھی۔

ردا برملا کہتی تھی مریم جب سے تم ملی ہو میں نے تب سے خوش ہونا سیکھا ہے۔دوستی ایک طرف مریم اسکے لیے بہت ہمدردی محسوس کرتی تھی۔وہ اندر سے ٹوٹی ہوئی لڑکی تھی۔مریم اس لیے بھی اس کا زیادہ خیال کرتی تھی۔

اب آخری سمسٹر تھا۔بلکہ پیپرز تھے پھر زندگی کی راہیں الگ ہونی تھیں۔مریم تو اسے تسلیاں دیتی رہی کہ

ہمیشہ دوستی رہے گی۔ میں یہیں اسلام آباد میں رہونگی۔ مگر ردا روتی رہی۔ مریم کے لیے اسے روتے دیکھنا تکلیف دہ تھا۔ پھر اب وہ بتا نہیں رہی تھی کہ اتنے دنوں سے اسکی آنکھیں یوں ویران کیوں رہنے لگی تھیں۔ مریم کا خیال تھا کہ پھر ماں یا باپ میں سے کسی نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔

اس معاملے میں وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ردا اس سے بھی کترائی کترائی رہتی تھی۔ مریم کی جانب دیکھتی بھی نہیں تھی۔ پھر آج کا پیپر بھی چھوڑ دیا تھا۔ مریم حقیقی معنوں میں پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔ ردا کمرے میں نہیں تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتی باہر آ گئی تھی۔ جیسی ردا کی ذہنی حالت ہو رہی تھی وہ کسی اکیلے کونے میں ہی مل سکتی تھی۔ مریم کسی کے کمرے میں جانے کی بجائے نیچے اسے لان میں دیکھنے آئی تھی۔ وہ ایک جانب پیٹھ کیے بیٹھی نظر آئی تھی۔ " پاگل ہے کیا یہ۔ بغیر کسی کے شال کے بیٹھی ہے۔ اتنی سردی ہے۔ گھاس بھی نم ہو گی۔ " مریم تیزی سے اسکی جانب بڑھی۔ وہ اداسی سے ایک ہی جانب تکے جا رہی تھی۔

" چلو اندر۔ اتنی سردی ہے۔ مرنا ہے کیا۔ " مریم نے جھک کر اسکی بازو پکڑی۔ ردا اسے دیکھ کر پھر دوبارہ وہیں دیکھنے لگی اور اپنی بازو بھی جھٹکے سے چھڑا لی تھی۔ " جاؤ تم۔۔ "

" کیوں جاؤں؟ مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔ کافی دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ میں نے اس لیے نہیں پوچھا کہ خود ہی سب بتاؤ گی۔ "

" ٹھیک سوچا۔ اب جب نہیں بتا رہی تو جاؤ۔ کیوں پیچھے پڑ گئی ہو۔ " مریم کا دل دُکھا۔ پتہ نہیں وہ کونسی تکلیف جھیل رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ردا نے اس طرف سے چہرہ موڑ کے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ مریم نے واضح محسوس کیا تھا۔ وہ اس سے ہی بچنا چاہ رہی تھی۔ " ردا کیا ہوا ہے؟ کیا میں نے دل دکھایا ہے۔ " ردا کی آنکھیں تیزی سے نم ہوئیں۔ " نہیں۔۔ "

" پھر مجھ سے کیوں دور بھاگ رہی ہو۔ جو بات دل کو تکلیف دے رہی ہے بتاؤ۔ اگر حل نہ بھی نکلا تو بھی اسکی تکلیف کم ہو جائے گی۔ " ردا کی آنکھیں بہنے لگی تھیں۔ مریم کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ " ردا میں نے تو کبھی جان بوجھ کر تمہارا دل نہیں دکھایا۔ اگر انجانے میں کچھ کہہ چکی ہوں تو پلیز مجھ معاف کر دو۔۔ " اسکی بات پوری ہونے سے پہلے ردا سکے گلے لگ چکی تھی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ مریم نے خاموشی سے اسے رونے

دیا۔جانے کتنے دنوں کا غبار تھا۔تھوڑی دیر رونے کے بعد وہ پیچھے ہوئی۔

"بس اسی بات کا افسوس ہے کہ تم نے کبھی میرا دل نہیں دکھایا۔ورنہ کسی طرح خود کو جسٹی فائی کر لیتی۔"

"کیا مطلب۔۔"مریم کے سر کے اوپر سے گزری تھی یہ بات۔

"تمہیں پتہ ہے تم دنیا کی خوش نصیب لوگوں میں سے ہو۔گھر،چار دیواری بہت بڑا تحفظ ہی نہیں بہت بڑا سکھ بھی ہوتا ہے۔تم خوش نصیب ہو جس گھر میں رہتی ہو وہاں کے ہر فرد کے دل میں تمہاری محبت ہے۔جہاں شادی کر کے جاؤ گی وہ بھی تم سے محبت کرتے ہیں۔سب اتنے خوش نصیب نہیں ہوتے۔"وہ آرزدہ تھی۔مریم سمجھ گئی تھی پھر سے ماں باپ کی وجہ سے اسکی حالت ایسی تھی۔"ہوسکتا ہے تمہاری شادی کسی اچھی جگہ ہو جائے اور تمہیں بھی اچھی فیملی مل جائے۔"مریم نے تسلی دینی چاہی۔

"تم بہت معصوم،بلکہ کسی حد تک بے وقوف ہو۔کاش تم اتنی اچھی نہ ہوتی تو آج یوں نہ ہوتا۔"ردا نے اور ہی بات کی تھی۔"مجھے کیوں لگ رہا ہے جیسے تم میرے کسی معاملے پر پریشان ہو۔"

"بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔۔"ردا استہزائیہ ہنسی۔

"ردا بتاؤ کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں ہے۔بس ممی کی باتوں کی وجہ سے دکھی ہوں۔کاش انہیں مجھ سے محبت ہوتی۔مجھ سے کبھی کسی نے محبت نہیں کی۔تم اس دنیا کی واحد انسان ہو جسے ردا سے محبت ہے۔اسے تمہاری معصومیت نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔۔۔"

"تمہارا شوہر بھی کرے گا اور پھر بچے بھی۔۔"مریم نے اسے ہنسانا چاہا۔وہ ہنسنے کی بجائے پھر سے رو دی تھی۔"ردا مجھے پاگل کر رہی ہو۔۔"

"مریم ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ردا تم سے بہت محبت کرتی ہے۔ردا سے کبھی کسی نے محبت نہیں کی تھی۔اس لیے ردا کو معلوم نہیں تھا کہ انسانوں سے محبت کیسے کی جاتی ہے۔لیکن پھر تم آئی اور بس۔۔کاش کہ پہلے آئی ہوتی یا اب نہ آتی۔۔"ردا کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔اور مریم کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ دراصل کہنا کیا چاہتی ہے۔

پھر مریم اسے تسلیاں دیتی ردا کبھی ہنس دیتی۔کبھی رونے لگ جاتی۔ردا تھک کر اسکی گود میں سر رکھے رونے لگ گئی تھی۔مریم بے بسی سے خود اسکے ساتھ رو رہی تھی۔اسکی دوست اسقدر تکلیف میں تھی اور وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ردا اپنے غم کی وجہ سے سردی سے بے نیاز ہو چکی تھی۔رات کو بہت دیر سے وہ لان سے اٹھ کر کمرے میں آئیں تھیں۔

صبح ہوتے ہی ردا سامان باندھے جانے کو تھی۔مریم غصہ میں تھی کم از کم پیپر تو دے دیتی۔ردا رات کی نسبت بہتر لگ رہی تھی۔مریم کی کوئی بات اسے نہ روک سکی۔وہ ہاسٹل میں صرف اسی سے ملی تھی۔اور جاتے جاتے کہہ گئی تھی کہ شاید نہ آپاؤں تو مریم تم میرے لیے دعا کرتی رہنا۔دعا نہ کرو تو اچھے الفاظ میں یاد کرتی رہنا۔پھر وہ چلی گئی تھی۔مریم تو ابھی تک اسکی حالت کو سوچ رہی تھی۔اس سے اپنے پیپر کی تیاری بھی ٹھیک سے نہیں ہو پا رہی تھی۔

اپنا دھیان بٹانے کو اس نے نیناں کے پاس جانے کا سوچا۔پھر یاد آیا وہ تو کل چلی گئی تھی۔ناز اور اسکے پیپرز جب ختم ہوئے تھے۔جاذب انہیں لے گیا تھا۔تھک کر اس نے پھر سے کتابیں اٹھالی تھیں۔عصر کے بعد کا وقت تھا جب حاشر کی کال آئی کہ نیچے آؤ۔مریم سکھ کی سانس لیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ورنہ اسے لگ رہا تھا کہ اس ٹینشن میں اس کا پیپر خراب نہ ہو جائے۔اب حاشر آ گیا تھا۔خراب موڈ ٹھیک ہو جانا تھا۔وہ دوپٹہ ٹھیک کرتی ویٹنگ روم میں آئی تھی۔

"کیسی ہو؟" اسکے قریب جاتے ہی اس نے مریم کا ہاتھ تھاما۔"ٹھیک ہوں۔" مریم ہولے سے مسکائی۔" لگ نہیں رہی۔کہیں باہر چلیں؟"

"نہیں کل پیپر ہے۔پڑھنا ہے بہت سارا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" پھر اسی طرح ہاتھ تھامے وہ لان میں چلے آئے تھے۔مریم نے اس کونے کو دیکھا۔جہاں رات ردا بیٹھ کر رو رہی تھی۔"اداس کیوں ہو؟" وہ دونوں ایک طرف رکھی بنچ پر جا بیٹھے۔"ردا میری دوست۔وہ رات چلی گئی ہے۔پیپرز بھی چھوڑ دیے۔بہت پریشان تھی وہ، بس اسی کو سوچ رہی تھی۔"

" کسی اور کے لیے خود کو اتنا ہلکان نہ کرو۔بیمار لگ رہی ہو۔" وہ ہنس دی تھی۔آہ یہ آپ سے محبت کرنے

والے لوگ۔۔" آپ بتائیں کہاں بزی رہے۔" حاشر نے اسکی بات سن کر گہری سانس لی۔"وہی پرانی مصروفیت ہی کافی تھی کہ نئی آن کھڑی ہوئی۔"

" کیوں کیا ہوا؟" مریم چونکی۔"بس جرگے کے مسئلے۔۔تم رہنے دو۔مردوں کی باتیں ہیں۔آج کے بعد مصروفیت اور بڑھ جانی ہے اس لیے سوچا تم سے مل لوں۔پھر پیپرز کے بعد تم نے بھی گھر چلے جانا ہے۔پھر شاید شادی پر ہی ملاقات ہو۔" وہ عام سے لہجے میں بول رہا تھا۔مریم نے اسکی آخری بات پر اسی سنجیدگی سے سر ہلانا چاہا۔لیکن سرخ چہرے کے ساتھ وہ نگاہ چرا گئی تھی۔"سناؤ گولڈ میڈل ون کر رہی ہو؟" اسے بھی اسکے رزلٹ کا انتظار تھا۔وہ ہنسی۔"ہاں انشاء اللہ۔۔"

" دیکھ لو کہیں ایسا نہ ہو انڈے ٹماٹر لینے پڑ جائیں۔" اس نے ابو کی طرح چھیڑا تھا۔مریم کھلے دل سے ہنس دی تھی۔"اس زندگی میں تو ایسی نوبت نہیں آئے گی۔مریم عالم ٹاپ سے کم پر راضی نہیں ہوتی اور اسکے لیے جی توڑ محنت کرتی ہے۔" رومینٹک باتوں سے تو دونوں کو الرجی تھی۔مریم کے نزدیک یہ رومینٹک گفتگو ہی تھی مگر خیر رہنے دیں۔۔حاشر نے بنچ پر بایاں بازو پھیلایا ہوا تھا۔وہ بھی اسی طرف رخ کیے اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی۔دونوں کا رخ ایک دوسرے کی جانب تھا۔مریم نے دیکھا۔آسمان لال ہو رہا تھا۔یوں کہ جیسے سورج سے نکلی دھوپ نارنجی رنگ کی بجائے لال رنگ کی ہو۔وفضا میں عجیب سی بو پھیلی تھی۔جانے کس چیز کی تھی؟ ناحق خون کی تھی؟ کسی دھوکے کی تھی یا کچھ اور تھا۔کچھ واضح نہیں تھا۔ہاں مگر اس دن فضا میں بو پھیلی تھی۔

ویسے موسم ٹھنڈا تھا۔وہ لال سورج بھی اس سردی کو کم نہیں کر رہا تھا۔

باتیں کرتے حاشر نے اپنے دائیں ہاتھ میں اس کے ہاتھ کو پھر سے لے لیا تھا۔وہ اس سے کوئی بات کرتے ہنس رہی تھی کہ اچانک وہ بول اٹھا۔" تمہیں ڈمپل بھی پڑتا ہے۔جب ہنستی ہو۔" وہ ایک دم سے چپ ہوئی تھی۔اسکی دائیں گال پر بننے والا گڑھا صرف اسکے قریب بیٹھنے سے نظر آتا تھا اور میر حاشر نے آج دیکھا تھا۔

"ہاں۔بہت مدھم سا۔۔صرف نزدیک سے نظر آتا ہے جب ہنستی ہوں۔۔" وہ شرما کے ہولے سے بولی۔"بہت اچھا لگتا ہے۔پھر ہنسو۔۔" یہ پہلی بار تھا کہ حاشر نے اسکی تعریف کی تھی۔مریم اس فرمائش پر

ہنس دی تھی۔

" کیا ہو گیا ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے؟" حاشر کو پتہ تھا۔ مریم کے لیے اسکی تعریف غیر متوقع تھی۔ پھر جتنی دیر وہ رہا۔ وہ جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتا رہا جن پر مریم ہنستی اور وہ اسکے اس نامعلوم سے ڈمپل کو دیکھتا رہا۔ "دل پتہ نہیں کیوں تمہاری طرف سے پریشان تھا۔ اس لیے ملنے چلا آیا ورنہ میرے پاس تو کھانا کھانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔" وہ جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ " تمہیں ہنستے ہوئے دیکھ کے جا رہا ہوں۔ دل کو اب تسلی ہے۔" وہ زبان سے محبت کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ لیکن اسکی مریم کی طرف اٹھتی ہر نگاہ میں محبت ہوتی۔ اس نے مریم سے کبھی نہیں کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ زبانی اظہار سے نابلد تھا۔ اکثر مرد ہوتے ہیں۔ لیکن جتنی دیر ساتھ رہتا اسے ہی دیکھتا رہتا۔ اسکے ہاتھ کو تھامے رکھتا۔ اور پھر سیاست سے لے کر دنیا جہان کے ہر موضوع پر بات ہوتی تھی۔ اسکے جانے کے بعد مریم کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ اب پرسکون تھی۔ اور چہرے کی مسکراہٹ بھی لوٹ آئی تھی۔

☆......☆......☆

مریم اب پوری توجہ سے اپنا پیپر تیار کر رہی تھی۔ رات کے دس کا ٹائم تھا۔ وہ کمرے میں اکیلی تھی۔ اس روم میں وہ اور ردا ہی رہتی تھیں۔ ردا کسی اور کو اس کمرے میں ٹکنے ہی نہیں دیتی تھی۔ اس لیے وہ دونوں زیادہ پے کرتی تھیں۔ اب اسکے جانے کے بعد مریم اکیلی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اکیلی تھی۔ ورنہ پچھلے دو سالوں میں ردا ہمیشہ یہاں رہتی تھی۔

مریم ہی اسے چھوڑ کے جاتی تھی۔ مریم نے سر جھٹک کر اس سوچ کو ختم کرنا چاہا۔ حاشر کے جانے کے بعد سے جو وہ پڑھنے بیٹھی تھی تو ابھی تک پڑھ رہی تھی۔ اب تھکن ہو رہی تھی۔ اس نے لیٹنے کا سوچ کر کتابیں ایک طرف کیں۔ اسی اثناء میں باہر سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ لیٹتے لیٹتے اٹھ بیٹھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا۔ چیخ و پکار تھی۔ بھاگتے قدموں کی آوازیں تھیں۔ خوف سے اسکا دل سکڑا۔ وہ کمبل ایک طرف کرتی بستر سے نیچے اتر آئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ باہر نکل کر سارے معاملے کو دیکھے۔ یا پھر انہونی مصیبت کے ڈر سے کمرے میں کہیں چھپ جائے۔ وہ کمرے کے درمیان میں کھڑی سوچ ہی رہی تھی کہ قدموں کی آواز اسے

اپنے دروازے کے قریب سنائی دی۔اس پہلے کہ وہ کچھ کرتی۔دروازہ پوری قوت سے اندر دھکیلا گیا تھا۔اور پولیس کے چند اہلکار اس پر پستول تانے کھڑے تھے۔مریم نے میکانکی انداز میں دونوں ہاتھ کھڑے کیے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" خوف سے اسکی آواز بیٹھی جا رہی تھی۔"مریم عالم آپ اب کہیں بھی نہیں بھاگ سکتی ہیں۔آپکے بھاگنے کے ہر راستے کو بند کر کے آیا ہوں۔لگاؤ ہتھکڑی۔۔"ایک ان سے عہدے میں بڑے آدمی نے ایک اہلکار کو حکم دیا۔"سر لیڈی ہیں۔میں کیسے کروں۔"

"اس جیسی عورتیں ان تکلفات کے قابل تو نہیں ہیں۔لیکن کوئی بات نہیں۔جاؤ لیڈی کانسٹیبل کو بلا کر لاؤ۔" مریم ہکا بکا سب سن رہی تھی۔"دماغ خراب ہے آپ لوگوں کا؟ کیا ہو کیا رہا ہے یہ سب۔۔"اسکی آواز کانپنے لگی۔

" کمرے کی تلاشی لو۔موبائل اور لیپ ٹاپ اپنے قبضے میں لے لو۔باقی کچھ اور ملتا ہے تو لے آؤ۔" وہ ایس پی حکم دے رہا تھا۔اتنے میں لیڈی کانسٹیبل آ گئی تھی۔اور مریم کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا دی تھی۔وہ تو بت بنی اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔"مانا کے بہت چالاکی سے اب تک کھیلتی آئی ہو۔مگر قانون پھر بھی تم جیسوں کو پکڑ ہی لیتا ہے۔تمہاری سب ساتھی پکڑی جا چکی ہیں۔مزید کوئی چالاکی دکھانا بھی مت۔ورنہ سیدھا گولی ماروں گا۔"اسکی باتیں مریم کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔اس کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔وہ بہت عام سی لڑکی تھی جو ذرا بھی غیر متوقع ہونے پر ڈر جاتی تھی۔خوف میں مبتلا ہو جاتی تھی۔اب بھی یہی ہو رہا تھا۔ہاسٹل میں سے جب اسے لے کر جا رہے تھے تو بہت سی گردنیں اسکی جانب مڑی ہوئی تھیں۔ہر نگاہ میں بے یقینی تھی اور سوال تھا۔مریم عالم نے کیا جرم کر دیا تھا؟ مریم بنا کسی احتجاج کے ان کے ساتھ جا رہی تھی۔کیونکہ اسکا دماغ کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔

اسکا دماغ سن ہو رہا تھا۔ذلت؟؟ بہت چھوٹا لفظ تھا یہ تو۔۔اس سے بھی زیادہ اگر کسی لفظ میں یہ تاثیر تھی کہ وہ مریم کی حالت کو بیان کر سکتا تو وہ لفظ مریم کو نہیں مل رہا تھا۔ذلت۔۔۔بے عزتی۔۔اور۔۔اور۔۔اور۔۔ الفاظ نہیں تھے۔

اسے تھانے لے آئے تھے۔اسکے ساتھ اسکی ہاسٹل کی اور بھی لڑکیاں تھیں۔بہت سی رو رہی تھیں۔کچھ بلند

آواز میں دھمکیاں دے رہی تھیں۔ایک وہ خاموش تھی بس۔اور جب لیڈی کانسٹیبل نے اسے سلاخوں کے پیچھے کرنا چاہا تو وہ ایک دم سے ہوش آئی تھی۔پوری قوت سے اپنا بازو چھڑا کر پیچھے کو ہوئی۔"یہ کیا بدتمیزی ہے۔کس جرم میں مجھے یہاں لے آئے ہیں۔"

"اندر چلو بی بی ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"لیڈی کانسٹیبل نے اسے بازو سے پھر دبوچ لیا۔مریم نے غصے میں پوری قوت سے اسے دھکا دیا۔" کیوں اندر چلوں؟ کیا جرم ہے میرا۔"پھر وہ بندھے ہاتھوں کے ساتھ وہاں سے تیز قدموں سے چلتی ایک طرف بنے آفس کے اندر چلی گئی۔وہ ایس پی اپنی کرسی پر بیٹھا جھک کر کوئی کاغذات دیکھ رہا تھا۔"یہ کیا بدتمیزی ہے۔مجھے یہاں کیوں لے آئے ہیں آپ لوگ۔میرا جرم کیا ہے؟"

اس نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔پھر اسکے پیچھے آئی لیڈی کانسٹیبل کو۔"ابھی تک اندر نہیں کیا اسے؟"

"دماغ خراب ہے آپکا؟ ہوش میں ہیں۔۔کیا پوچھ رہی ہوں آپ سے؟ میرا جرم بتائیں۔"

"بی بی اتنی تم معصوم نہیں جتنا اس وقت بن رہی ہو۔تم بھی جانتی ہو کس جرم میں یہاں تک آئی ہو۔۔"وہ اسے دیکھتے تنفر سے بولا۔"عورت کے نام پر دھبہ ہو۔اس قدر گھناؤنے کام کرتے شرم نہیں آئی۔۔نا خاندان کی عزت کا خیال آیا نا ہی عورت ہونے کا۔۔"وہ بولے جا رہا تھا۔مریم نفرت بھری نگاہوں سے اسے گھورتی رہی۔"شرم آپ جیسے لوگوں کو آنی چاہیئے جو قانون کی آڑ میں من مانی کرتے ہیں۔جو کسی بھی شریف عورت پر کوئی الزام دھرتے لمحے بھر کو نہیں سوچتے کہ ان کی ایسی حرکت ان کی زندگی کسطرح خراب کر سکتی ہے۔کیا ثبوت ہے آپکے پاس کہ میرا کوئی جرم ہے؟ کوئی اریسٹ وارنٹ؟ میں کوئی عام سی لڑکی نہیں ہوں۔جسے آپ اندھے قانون کی بل پر لے آئے ہیں۔میں۔۔"

"جانتا ہوں۔بڑے سورسز ہیں تمہارے۔تم جیسوں کے بڑے ہی سورسز ہوتے ہیں۔جرم یہ ہے کہ پاکستان میں پورنوگرافی پھیلا رہی ہو۔مرد مردوں کے لیے اور عورت عرت کے لیے۔۔"وہ بول رہا تھا۔مریم عالم کو لگا اسکے سر پر آسمان آ ٹوٹا ہو۔اس قدر گندے الفاظ وہ اس کے جرم کے لیے کہہ رہا تھا کہ،وہ لکھنے کے قابل نہیں تھے۔وہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ پچھلے کئی سالوں سے اس کیس کے پیچھے تھا۔لیکن کیونکہ وہ بہت چالاک تھی تو کوئی ثبوت نہیں چھوڑتی تھی۔ہاں مگر قانون ایک دن سب کو پکڑ لیتا ہے۔

"بس کریں۔کسقدر فضول بولے جارہے ہیں آپ۔۔کیا ثبوت ہے آپکے پاس کے یہ سب میرے ہی جرم ہیں۔میں نے ان میں سے بہت سے لفظ نہیں سنے کبھی بھی،اور آپ کہتے ہیں میں ان جرائم میں ملوث ہوں۔میں ایک شریف خاندان کی لڑکی ہوں۔میں ایسا کیوں کروں گی؟میں۔۔میں نے نہیں کیا یہ سب۔۔"

"پچھلے ایک سال سے تحقیق کررہا ہوں۔بغیر ثبوت نہیں لایا۔"

"مجھے فون کرنے دیں گھر۔۔۔میں اپنے ابو کو بلاتی ہوں۔۔۔"وہ ایک عام سی ہی لڑکی تھی۔وہ ان باتوں کے مقابلے نہیں کرسکتی تھی۔"آپ کے یہ کالوں والے چونچلوں کو پورا نہیں کیا جاسکتا۔لو جاؤ اسے اندر۔۔" ایس پی نے لیڈی کانسٹیبل کو بھی جھاڑ کر رکھ دیا تھا۔"نہیں جاؤنگی اندر۔جب میں نے یہ جرم نہیں کیا۔میں نے نہیں کیا۔۔اور قانون کو زیادہ نہیں جانتی مگر اتنا معلوم ہے کہ اپنے ولی وارث بلوا سکتی ہوں۔جب تک میرے گھر سے کوئی نہیں آجاتا میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤنگی۔"وہ ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔اسکے پیچھے کھڑی کانسٹیبل نے اسکی بازو کو پھر سے پکڑنا چاہا۔مریم نے سامنے رکھا پیپر ویٹ اٹھا کر اسکے ہاتھ پر مارا۔وہ بلبلا کر ہٹی تھی۔ایس پی جلدی سے اٹھ کر اس تک آیا تھا۔

"خبردار اگر اب کسی نے مجھے ہاتھ لگایا تو۔۔"اس نے پیپر ویٹ والا ہاتھ اٹھا کر دھمکی دی۔" آپ مجھے اس پیپر ویٹ سے ڈرا رہی ہیں۔۔"وہ ہنسا۔مریم نے جلدی سے آگے بڑھ کر میز کے دوسری جانب جا کر ایک طرف رکھا پیپر کٹر اٹھا لیا تھا۔اب دونوں ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔"دیکھ لیں مجرم ہوتی تو پسٹل اٹھاتی۔میں مجرم نہیں ہوں۔میرے گھر والوں کو آنے دیں پہلے پھر جو کرنا ہے کرلیں۔"وہ چھٹانک بھر لڑکی تھی۔ایس پی چاہتا تو منٹ میں اسے قابو کرسکتا تھا۔لیکن کچھ سوچ کر اس نے لیڈی کانسٹیبل کو بھی آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔"ٹھیک ہے کرو کال جسے کرنی ہے۔۔"

"میرا موبائل آپ لوگ لے آئے ہیں۔۔موبائل دیں۔"

"بی بی ہماری ٹیم اس کو چیک کررہی ہے۔آپ کو نمبر زبانی آتا ہے تو کال کریں۔"

اسے گھر کا نمبر آتا تھا۔مگر ابو بہاولپور سے یہاں آتے بہت ٹائم لگ جانا تھا۔اسے اس گھٹن سے جلدی نکلنا تھا۔حاشر۔۔مگر اسکا نمبر زبانی نہیں آتا تھا۔"مجھے نمبر زبانی نہیں آتا۔مجھے موبائل دیں۔"

"موبائل نہیں ہے۔۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔اور ابھی اسی بات پر بحث جاری تھی۔انکی آوازیں بلند تھیں۔مریم کی آواز لرزتی ہوئی بھیگی سی تھی۔اور کچھ دیر ہی گزری تھی کہ حاشر تیزی سے اندر آیا تھا۔مریم نے اسے دیکھ کر دونوں چیزیں ہاتھ سے چھوڑ دی تھیں۔وہ اسکے پاؤں کے بالکل قریب گری تھیں۔" کیوں لے کر آئے ہیں آپ اسے۔۔"اس نے ایس پی کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ایس پی نے تیزی سے خود کو چھڑایا۔" یہ آپکی کیا لگتی ہیں؟"

" بیوی ہے میری۔۔"

پھر ایس پی اپنی کرسی پر آن بیٹھا تھا۔مریم کو لیے وہ اسکے سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔مریم جواب تک بہادر بنی ہوئی تھی۔اب بس رو دینے کو تھی۔اسے رونا تھا بہت سا۔وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔حاشر کیا بول رہا تھا۔اور ایس پی کیا جواب دے رہا تھا۔"میری بیوی کا نام کاٹیں اس ایف آئی آر سے۔۔" مریم کے کانوں میں انکی بحث کے کچھ جملے پڑ رہے تھے۔پھر بہت بحث کے بعد وہ اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔

" آپ کو کس نے بتایا۔۔"

" ہاسٹل کی وارڈن نے کال کی تھی۔" وہ بہت سنجیدہ تھا۔مریم کا ہاتھ تھامے اسے گیٹ سے اندر چھوڑا تھا۔" تم جاؤ آرام کرو۔مجھے کام ہے۔" مریم اسے کہنا چاہتی تھی نہ جاؤ۔لیکن وہ چلا گیا تھا۔وہ اندر جانے کی بجائے لان میں آ گئی تھی۔اور ایک جانب بیٹھ کر یہ سب سوچتے رونے لگ گئی تھی۔

ادھر حاشر دوبارہ تھانے چلا گیا تھا۔وہ اپنی طاقت کے بل پر اسے گھر تو لے آیا تھا لیکن اسکا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہ کیس ختم ہو گیا تھا۔اسے اس معاملے کی تحقیق کرنی تھی۔اور جب تھانے آیا تھا پہلے تو ایس پی اسے قانون کے قاعدے پڑھاتا رہا۔ایک بار تو غصے سے اس نے آگے بڑھ کو پھر سے اسکا گریبان پکڑ لیا تھا۔

" یہ جن گولیوں کے چل جانے کی دھمکی مجھے دے رہے ہو ہمیں گھٹی کے دودھ میں یہ ملا کے دی جاتی ہیں۔مجھے ان سے نہ ڈراؤ۔تمہارے ساتھ بیٹھ کر میں اس کیس کی تحقیق کرونگا۔اگر وہ مجرم ثابت ہوئی تو خود اپنے ہاتھوں سے اسے قانون کے حوالے کرونگا۔لیکن جب تک جرم ثابت نہیں ہوتا اسکا نام بھی نہ آئے۔ملزم ہی لکھنا ہے تو کوئی بھی فرضی نام لکھ دو مگر اسکا نہیں۔"

"قانون کو مذاق سمجھ رکھا ہے آپ نے۔۔اور بنا تحقیق کے نہیں لایا تھا آپکی بیوی کو میں پچھلے ایک سال سے اس کیس کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہر بار مریم عالم کا نام ہی سامنے آتا تھا۔مان لیں آپکی بیوی ایسی ہے۔"ایس پی نے گالی دے کر کہا تھا۔حاشر نے پوری قوت سے اسکے جبڑے پر مکا مارا۔اور پھر برسات کر دی۔اس وقت ایس پی اور وہ کمرے میں اکیلے تھے۔۔

"پولیس والے پر ہاتھ اٹھانے کی سزا کیا ہوتی ہے معلوم ہے۔۔دیکھو اب میں کیسے تمہیں۔۔"

"ایس پی ایک بات یاد رکھنا اگر تم نے اس کیس سے میری بیوی کا نام نہ ہٹایا تو یاد رکھنا تمہارے خاندان کی ایک ایک عورت کو سر بازار نہ لایا تو میر حاشر نہ کہنا۔" پھر دونوں نے ایک دوسرے کی گریبان چھوڑ دی تھی۔دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔"اپنے گھر کی عورت کا سن کر غصہ آیا؟ ایسے ہی میرا بھی خون کھول رہا ہے۔اگر وہ مجرم نہ ہوئی تو تم اس ٹرائل کے دوران اسکی بے عزتی کا ازالہ کیسے کرو گے؟ پھر یہ بھی ثابت ہو جائیکہ وہ مجرم نہیں ہے تب بھی اسکی عزت واپس نہیں آئے گی کیونکہ وہ عورت ہے۔ایک خاندانی عورت۔۔جو کبھی تھانوں کی چوکھٹ پر قدم نہیں رکھتی ہے۔۔اس لیے۔۔اسکا نام ہٹا کر فرضی نام لکھو۔اس کیس کو حل کرنے میں، میں تمہاری مدد کرونگا۔اگر پھر بھی وہ ہی مجرم ہے تو میر حاشر قانون کی عزت کرنے والا بندہ ہے۔قانونی مجرم کو بچانے نہیں آؤں گا۔" پھر اس رات اس کے نام پر کٹی ایف آئی آر گم کر دی گئی تھی۔اور جہاں جہاں اسکا نام بھیجا گیا تھا وہ ایس پی فرضی نام کے ساتھ تصحیح کر رہا تھا۔یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں تھا۔لیکن پھر بھی ہو رہا تھا۔اور پھر وہ فجر کی اذانوں سے قبل گھر لوٹا تھا۔گاڑی چلاتے اسکا ذہن الجھا ہوا تھا۔وہ مریم کے لیپ ٹاپ سے نکلا ڈیٹا دیکھ کر آیا تھا۔ابھی پورا ڈیٹا نہیں ریکور کیا گیا تھا۔بہت سی انکرپٹڈ فائلز تھیں۔لیکن جتنا دیکھا تھا۔وہ اس قابل نہیں تھا کہ دیکھا جاتا۔وہ بے حیائی کا بے انت سمندر تھا۔کئی بار وہ دیکھتے رخ موڑ گیا تھا۔

شرمندگی، غصہ کہ یہ سب اسکی بیوی کے پرسنل ڈیوائس میں تھا۔موبائل ڈیٹا تو ابھی نہیں ملا تھا۔وہاں آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ میں بیٹھے کئی بار اسکی سر کی رگیں پھٹنے کو آئی تھیں۔"مریم ایسی نہیں ہے میں جانتا ہوں۔۔"وہ خود کو بلند آواز میں بتا رہا تھا۔دل چھوٹا نہیں کرنا تھا۔اور ہوشیاری سے اصل مجرم کو پکڑنا تھا۔کیا یہ حاشر کے دشمنوں کی

حرکت تھی؟ یا کوئی اور تھا جوان کے خاندان کو ٹارگٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مریم کا کوئی دشمن ہونا تو ناممکن سا لگ رہا تھا۔ جتنی وہ خوش اخلاق اور سب کی مدد کرنے والی تھی۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔

یہ الزامات ایسے نہیں تھے کہ آسانی سے ہضم ہوتے۔ انہی الجھنوں میں گھرا، وہ گھر پہنچا تھا۔ گاڑی سے اتر کر وہ بنا ادھر ادھر دیکھے اندر چلا گیا تھا۔ پتہ نہیں مریم کس کمرے میں تھی۔ ایک بار ہی تو اس گھر میں آئی تھی۔ اس نے قریب کے ایک دو کمرے چیک کیے تھے۔ وہ خالی تھے۔

وہ ڈرائنگ روم میں بھی نہیں تھی۔ اب اتنے بڑے گھر کا ایک ایک کمرہ کھول کر وہ چیک نہیں کر سکتا تھا۔ ملازمائیں اس وقت اپنے کوارٹرز میں تھیں۔ وہ باہر نکل کر لان میں چلا آیا تھا۔ اس کے اندر اتنی آگ تھی کہ بجھنے میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے جوتے اتار کر ٹھنڈے گھاس پر پاؤں رکھے۔ پاؤں کو اس سرد گھاس نے سکون کا احساس بخشا تھا۔ تھکن کے باوجود بھی نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے واک کرتے دیکھ کر واچ مین اسی کی طرف آ گیا تھا۔ دن رات اس کے گھر چوکیدار چوکنے رہتے تھے۔ کئی دشمن تھے جان کے۔ "وہ جی بی بی ابھی تک باہر ہیں۔ اتنی ٹھنڈ ہے۔"

" کہاں ہے وہ۔۔" وہ چونکا۔ "پہلے ادھر سامنے لان میں تھیں۔ وسائی کے بار بار کہنے پر بھی اندر نہیں گئیں۔ پھر یہاں سے اٹھ کر ادھر پیچھے والے حصے میں چلی گئیں۔" اسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کرتے وہ جوتے پہن کر پیچھے کی طرف آ گیا تھا۔ وہ اسے کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ رات کا اندھیرا بہت گہرا تھا۔ اس نے موبائل کی لائٹ آن کی اور اسے چاروں جانب دوڑایا۔ ایک طرف اسکے دوپٹے کا گمان ہوا تو وہاں پہنچا۔ وہ ٹھنڈی گھاس پر گٹھڑی بنی سو رہی تھی۔ اسکا چہرہ ستا ہوا تھا جیسے بہت روئی ہو۔ حاشر نے جھک کر کندھا ہلایا۔ "مریم۔۔اٹھو۔۔" وہ ڈر کر اٹھ بیٹھی تھی۔ پھر وہ اسے اندر لے آیا تھا۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ "پاگل ہو اتنی سردی میں باہر بیٹھی رہی۔" وہ خاموش رہی تھی۔ پھر اسے ایک کمرے میں سلا کر وہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

☆......☆......☆

صبح ناشتے پر ان دونوں کا سامنا ہوا تھا۔ دونوں ہی اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ "میرا آج پیپر ہے۔" وہ

آہستگی سے بولی۔وہ چونک گیا۔" کتنے بجے؟"

"نو بجے۔۔"

" آخری ہے؟"

"نہیں،آخری کل ہے۔"

" ٹھیک ہے تیار ہو جاؤ۔چھوڑ آتا ہوں۔" بہت نپی تلی گفتگو ہو رہی تھی۔" میری بکس ہاسٹل رہ گئیں۔آپ میرا موبائل اور لیپ ٹاپ لے آئے ان سے۔۔" حاشر نے غور سے اسکے چہرے کو دیکھا۔وہ کچھ پڑھنا چاہتا تھا۔وہ ویڈیوز اسکے دماغ سے نہیں نکل رہی تھیں۔

وہ بہت ہی ضبط والا انسان تھا کہ اتنا سب ہونے کے باوجود بھی اپنا غصہ اس پر نہیں نکال رہا تھا۔غصہ نجانے تھا کس پر۔۔مریم پر،خود پر یا پولیس پر۔۔بس اندر غصے کا طوفان تھا اور وہ اس پر قابو کیے بیٹھا تھا۔" کچھ دنوں تک سب واپس مل جائے گا۔تمہارے لیپ ٹاپ میں بہت سی انکرپٹڈ فائلز ہیں۔۔" آگے وہ خاموش ہو گیا تھا۔اور مریم کو بس اتنا پتہ تھا کہ جو فائلز نہیں کھلتی ہیں۔وہ وائرس ہوتے ہیں جو کمپیوٹر میں خود بخود گھس جاتے ہیں۔" مطلب وائرس؟؟"

" نہیں وائرس نہیں۔۔تمہارا لیپ ٹاپ کون کون استعمال کرتا تھا۔"

" ردا کرتی تھی۔لیکن کبھی کبھار ہاسٹل کی کوئی لڑکی بھی مانگ لیتی تھی۔"

"اور تم دے دیتی تھی؟"

"جی۔۔"

" کبھی چیک کیا ،وہ کیا کرتی تھیں تمہارے لیپ ٹاپ پر؟"

" نہیں اب چیز دے کر بندہ سر پر سوار ہو جائے۔" اسے جیسے برا لگا تھا۔

"موبائل کون کون استعمال کرتا تھا؟"

میں بھی۔اور جب جسے ضرورت ہوتی تھی دے دیتی تھی کیونکہ کریڈٹ ہوتا تھا تو کبھی کسی نے گھر کال کرنی ہوتی۔۔"

"پبلک پراپرٹی تھی کوئی بھی استعمال کر لیتا تھا۔" حاشر نے ماتھے پر بل ڈالے پوچھا۔

"اب کوئی مانگے تو میں کیا کروں۔۔"

"تو ہر ایرے غیرے کو 'انکار' کیا جاتا ہے۔ ہاسٹل میں بھی تو فون کنکشن ہے۔ وارڈن کا سیل فون ہے۔ وہاں سے کیوں نہیں کرتی تھیں وہ سب۔۔ ہاسٹل میں کئی لڑکیاں ہیں۔ ان سب کا نہیں بس تمہارا فون پبلک بوتھ تھا۔ اور لیپ ٹاپ بھی۔" حاشر کا غصہ بولتے ہوئے مزید بڑھ چکا تھا۔

اسے پہلی بار مریم سے مایوسی ہوئی تھی کوئی اس حد تک بے وقوف ہو سکتا ہے۔ اور مریم کیا کہتی کہ اس کے لیے کوئی بھی ایرا غیرا نہیں تھا۔ اسکی سب سے اچھی بنی ہوئی تھی اور یہ اسکی کمزوری تھی کہ وہ کبھی کسی کو انکار نہیں کر سکتی تھی۔ مریم اسکے ماتھے کے بل دیکھ رہی تھی۔ اس کا لہجہ پہلی بار اسکے ساتھ سخت تھا۔ اور اسے لگا تھا کہ وہ اس پر اعتبار نہیں کر رہا۔ جو الزام پولیس نے لگائے ہیں وہ سچ سمجھ رہا ہے۔ عورتیں بعض اوقات اپنے مردوں کے بارے میں جلدی قائم کر لیتی ہیں وجہ شاید انکا حساس ہونا ہے کہ جن کے ہونٹ آپ نے اپنے لیے سدا مسکراتے دیکھے ہوں ان کے ماتھے کے بل دل کو تکلیف میں ڈال دیتے ہیں۔ اسکی حساسیت اس وقت اسکی بے وقوفی تھی۔ اسے سمجھنا چاہیئے تھا وہ مرد تھا وہ ایسی باتیں نہ صرف سن کر آیا تھا بلکہ آنکھوں سے ثبوت دیکھ کر آیا تھا۔ ثبوتوں کا سچا جھوٹا ہونا تو بعد کی بات تھی۔ اسکا موڈ خراب ہونا تھا مگر اسکا مطلب بے اعتباری نہیں ہوتا۔

"حاشر میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ آہستگی سے بول اٹھی۔ حاشر نے گہری سانس لی۔ اور کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "آؤ پیپر کے لیے چھوڑ دوں۔" مریم نے بے یقینی سے دیکھا۔ اسکی بات کو یوں اگنور کر دیا تھا جیسے فضول سی بات ہو۔ اس کا دل ڈوب گیا تھا۔ یعنی حاشر اسے مجرم سمجھ رہا تھا۔ اسکے بعد اسکے لب سلے رہے۔

جب کہ وہ مرد تھا وہ بیٹھ کر اسے پیار محبت والی باتیں نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ پر یقین تھا کہ وہ کسی کا نشانہ بنی ہے۔ اصلی چہرہ کوئی اور ہے۔ وہ اسے وہاں سے لے آیا ہے۔ اس پر چیخ چلا نہیں رہا۔ اسے کوئی باتیں نہیں سنا رہا۔ تو اسکی بیوی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ شوہر اسکے ساتھ ہے۔ اب ضروری نہیں ہاتھ پکڑ کر تسلی دے۔ اور مریم سے زیادہ تسلی کی تو شاید اسے ضرورت تھی۔ وہ مرد تھا ایک روایتی سا۔ اسکی بیوی کے پرسنل ڈیوائسز میں سے گند نکلتا ہے اتنے لوگوں کے بیچ۔۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس نے اب تک ضبط کیسے کیا ہوا تھا۔ غصہ

تھا۔شرمندگی۔۔بھلے وہ مجرم نہیں تھی لیکن ایسے الزام بھی غیرت پر تازیانے کے لیے کافی تھے۔وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مظلوم تھے۔اس نے مریم کو وضاحت نہیں دی تھی کہ وہ اسکے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔اسکی خاموشی اسے مریم کی نظروں میں مجرم بنا گئی تھی۔

پھر اس دن بھی وہ وہیں رہی تھی۔حاشر رات گئے گھر آیا تھا۔اور آخری دن پیپر دینے کے بعد وہ اسے خود چھوڑنے جانے والا تھا کہ مریم نے منع کر دیا تھا۔وہ خود جا سکتی تھی۔حاشر نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔یہاں بہت کام تھے۔اور اس آخری وقت دونوں کو ہی معلوم نہیں تھا کہ آخری بار مل رہے تھے۔اسے الوداع کہہ کر وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی شاید وہ کچھ کہے۔وہ ماتھے پر بل ڈالے ارد گرد دیکھ رہا تھا اس پر بھی بھولی بھٹکی نگاہ آن ٹھہرتی۔

"میں نے نہیں کیا یہ۔۔" آہستگی سے اسکے لب ہلے تھے۔حاشر نے اسکے چہرے پر نگاہ ٹکائی۔اسکی آنکھوں میں نمی تھی۔اور بے بسی کا احساس تھا۔حاشر کے دل کو کچھ ہوا۔ان تین دنوں میں اس سے چند لمحے بھی رک کر صحیح طرح بات نہیں کی تھی۔"میں جانتا ہوں۔"وہ بھی آہستگی سے بولا۔"تمہارے ہاسٹل سے تقریبا سارا سامان پولیس لے گئی تھی۔اب تمہارا موبائل،لیپ ٹاپ انہی کے پاس ہے۔انکوائری کے بعد دے دیں گے۔"حالانکہ موبائل کا سارا ڈیٹا وہ لے چکے تھے۔"باقی جو سامان ہے۔وہ سوٹ کیس میں ہے۔" مریم خاموشی سے اپنے شہر لوٹ آئی تھی۔اسکے دل کو یقین ہو چلا تھا کہ اسکا حاشر سے رشتہ بس چند دنوں پر محیط تھا۔وہ اسے آخری بار دیکھ رہی تھی۔

جس وقت وہ وہاں سے روانہ ہوئی تھی۔اس سے کچھ دیر بعد ادھر ابو اسلام آباد کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔دو دن سے مریم ان کی کال نہیں اٹھا رہی تھی۔ایک بار اٹھائی تھی لیکن بولا کچھ نہیں تھا پھر کال کاٹ دی گئی تھی۔ان کا دل پریشان ہو اٹھا تھا۔پھر ہاسٹل کال کی تھی تو جو سننے کو ملا تھا اس نے پیروں کے نیچے سے زمین نکال لی تھی۔پھر خود کو سنبھال کر انہوں نے علی کے ساتھ اسلام آباد آنے کی تیاری کر لی تھی۔

گھر میں امی اور بھابھی کو کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔حاشر کو کال کرنے کا کئی بار سوچا تھا لیکن دل لرز رہا تھا۔داماد تھا کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو رشتہ بگڑ جاتا تھا۔وہ اکیلے جا کر اس معاملے کو دیکھنا چاہتے تھے۔وہ اسلام آباد

پہنچ کر پہلے ہاسٹل گئے تھے۔وہاں سے لرزہ خیز باتیں سننے کو ملی تھیں۔پھر تھانے گئے تھے۔اتفاق سے ایس پی بھی مل گیا تھا۔مریم عالم کے باپ کا سن کر اس نے ساری روداد سنا دی تھی۔فرد جرم بھی اور اسکے کچھ ثبوت بھی۔اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اسے حاشر لے گیا تھا۔

وہ ہمت ہار چکے تھے۔پھر باہر آ کر حاشر کو کال کی تھی اس نے بتایا کہ مریم اسکے گھر رہی تھی دو دن۔اب وہ چلی گئی ہے شاید اب تک گھر پہنچ چکی ہو۔پھر وہ بنا داماد کو ملے گھر واپس آ گئے تھے۔وہ اندر سے ٹوٹ گئے تھے۔زندگی کا سب سے بڑا صدمہ ملا تھا۔جب وہ لوگ گھر پہنچے مریم سو رہی تھی۔"مریم کہاں ہے اسے بلاؤ۔" وہ بہت نیچی آواز میں بیوی سے مخاطب ہوئے۔جب کہ علی نڈھال سا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔"سو رہی ہے۔"

" کیسی ہے وہ۔۔"

"بہت پریشان لگ رہی تھی۔پوچھا تو کہتی امی کچھ نہیں ہے۔بس تھکی ہوئی ہوں۔" انہوں نے مریم کی بات دہرائی تھی۔" آپ بتائیں کیا ہوا ہے۔اتنا تھکے ہوئے کیوں لگ رہے ہیں۔" ان کی آواز میں شوہر کے لیے پریشانی تھی۔"ٹوٹ گیا ہوں میں۔۔" وہ اسقدر مضبوط تھے لیکن اب بولتے ہوئے آنکھیں نم ہوتی چلی گئیں۔انہوں نے آگے بڑھ کر شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔" عالم ایسا کیوں کہہ رہے ہیں کیا ہوا ہے؟ میرے دل میں برے برے وہم آ رہے ہیں۔"

" کاش بتانے کا حوصلہ ہوتا۔۔" کہہ کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ان کی آنکھوں سے خاموشی سے آنسو نکلتے رہے۔اسکی امی انہیں روتا دیکھ خود رونے لگ گئی تھیں۔مرد گھر کا سب سے مضبوط ستون ہوتے ہیں۔ہر کڑے وقت میں وہ سامنے تن کر کھڑے ہوتے ہیں۔مشکلوں میں بھی گھر کی عورتوں کو حوصلہ دینے کو مسکرا دیتے ہیں۔اور جب وہ ستون اپنی مضبوطی کھونے لگتے ہیں تو یقین کریں گھر کی عورتیں بھربھری ریت کی مانند ثابت ہوتی ہیں۔

انہونی کا خوف دل کو دہلا دیتا ہے۔ان کے گھر کا ستون اپنی مضبوطی کھو رہا تھا اور ان کے دل کو پتنگے لگ گئے تھے۔آخر کیا برا ہونے جا رہا تھا۔اور اسکے ابو بنا کچھ کہے روئے جا رہے تھے کہ ان کا دل پھٹنے کو تھا۔اگر نہ روتے

تو۔۔ادھر علی اپنے کمرے میں رو رہا تھا۔مریم بستر میں پڑی بغیر آواز آنسو بہائے جا رہی تھی۔اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اپنے گھر والوں کا سامنا کیسے کرے گی۔۔وہ بے قصور تھی مگر الزام ایسے تھے کہ وہ نگاہ اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ان کے گھر سے یقیناً خوشیوں کا سایہ اٹھ چکا تھا۔ابھی صرف تین لوگوں کو معلوم تھا اور گھر میں موت جیسی خاموشی چھا گئی تھی۔امی، آپی، بھابھی اور عاطف بھائی تو ابھی بھی لاعلم تھے۔۔

☆......☆......☆

بات کب تک چھپ سکتی تھی۔۔جب علی اس سے باز پرس کر رہا تھا۔وہ چیخ رہا تھا۔مریم نفی میں سر ہلاتی روئے جا رہی تھی۔امی اور بھابھی منہ پر ہاتھ رکھے سن رہی تھیں۔امی بار بار نفی میں سر ہلاتیں۔"میں نے تو کبھی بے وضو ،ان کو دودھ نہیں پلایا۔۔نہیں میری اولاد ایسا نہیں کر سکتی۔۔" وہ بولتے ہوئے ڈھے گئی تھیں۔ان کو گرتا دیکھ کر بھابھی چیخی تھیں۔وہ دونوں امی کے پاس بھاگے تھے۔"میری مریم ایسی نہیں ہے۔۔نہیں ہے۔۔"

"امی میں نے کچھ نہیں کیا۔۔امی میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ ان کا ہاتھ تھامے روتے ہوئے بول رہی تھی۔

آنے والے دنوں میں مریم کے لیے مشکلات بڑھتی گئیں۔ابو اسے دیکھ کر چہرہ پھیر لیتے تھے۔امی رونے لگ جاتی تھیں۔علی کی اسے کچھ خبر نہیں تھی وہ کہاں تھا۔اس نے سوچا کہ وہ ابو سے جا کے بات کرے انہیں اپنا اعتبار دلائے۔"اگر کبھی ماں باپ کا اعتبار ٹوٹنے لگے تو اپنی سچائی سے انکا اعتبار پھر سے جیت لینا چاہیئے۔" مریم نے ایک بار پھر خود کو یاد دلایا تھا۔ابھی تک یہ بات ان کے گھر کی چار دیواری میں ہی تھی۔اور جب وہ ابو کے پاس گئی تو انہوں نے اسے دیکھ کر چہرے کا رخ پھیر لیا تھا۔اس کا دل دکھا تھا۔"ابو جی آپ سے بات کرنی تھی۔" انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔اسکا حوصلہ پھر سے ٹوٹنے لگا۔ان چند دنوں نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔وہ ہر روز یہی سوچتی یہ دن میری زندگی کا سب سے برا دن ہے۔اور اگلا دن شروع ہوتے ہی معلوم ہو جاتا کہ نہیں آج کا تو کل والے سے زیادہ برا ہے۔گھر کا ہر فرد اسے دیکھ کر یوں رخ بدلتا جیسے کسی بری چیز کو دیکھ لیا ہو۔"ابو جی آپ تو میرا اعتبار کریں میں نے کچھ نہیں کیا۔میں ایسا کیوں کرونگی۔میں اتنی بری ہو سکتی

ہوں؟؟ آپ بتائیں کیا میں ایسی ہو سکتی ہوں؟؟ مجھے کسی نے پھنسایا ہے۔۔"

"سب کو تم پر اعتبار ہے۔کوئی بے اعتبار نہیں ہوا۔تم یہ پریشانی نہ پالو۔جاؤ اپنے کمرے میں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولتے اسی طرح چہرہ موڑے ہوئے تھے۔مریم کا دل چاہا آگے بڑھ کر ان کی گود میں سر رکھ کر اپنا سارا درد بہا دے لیکن آج ان تک پہنچنا ناممکن لگ رہا تھا۔وہ خود کو گھسیٹتی باہر لے آئی تھی۔

نمی تو آنکھوں میں یوں آن سمائی تھی جیسے اسکا اپنا گھر ہو۔اور اب جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔پھر امی ہی کبھی کبھار بے دلی سے سہی مگر اس سے بات کر لیتی تھیں۔کبھی وہ اسکے ساتھ بیٹھ کر پیار کرتی رہتیں۔اس کا سر چومتیں۔اور اس سے زیادہ خود کو تسلیاں دیتیں۔"سب ٹھیک ہو جائے گا۔یہ جھوٹ بھی ایک دن بے نقاب ہو جائے گا۔تم پریشان نہ ہو میرا بچہ۔رومت۔۔" مگر تسلی کے یہ حروف شروع کے دنوں میں تھے۔پھر امی کا رویہ بھی بدلتا گیا۔

بھابھی تو جیسے تھی ہی نہیں۔ایک بار اس نے بھتیجوں سے بات کرنی چاہی۔وہ ترس گئی تھی کسی سے بات کرنے کو مگر۔۔

" آؤ پھپو کھیلیں۔۔" وہ خود کو حوصلہ دیتی اس دن بھتیجوں کے روم میں ان سے کھیلنے آگئی تھی۔بھلے کوئی بچہ سہی مگر بات تو کرتا اس سے۔دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اسے۔بالآخر بڑے بھائی نے گلا کھنکار کر بولنے کا فیصلہ کیا۔

" آپ ہماری پھپو ہیں۔ہمیں اچھی لگتی ہیں لیکن مما نے آپ سے بات کرنے کو منع کیا ہے۔انہوں نے کہا آپ اچھی نہیں ہیں۔" وہ بچے تھے۔انہوں نے سچ بول دیا تھا۔مریم پھیکا چہرہ لیے انہیں دیکھتی رہی۔اسے کوئی جواب ہی سمجھ نہیں آیا۔وہ اپنے ڈیفینس میں ان بچوں سے کیا کہے۔وہ جو ان سے کھیلنے کو فرش پر ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔اس کے لیے وہاں سے اٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔دونوں ہاتھ زمین پر ٹکاتے وہ آہستگی سے اوپر کو ہو کر اٹھی تھی۔اور پھر اسی آہستگی سے چلتی اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

وہ دن بدن ٹوٹتی جا رہی تھی۔ابو ہر دو دن بعد حاشر کو کال کر کے پوچھتے کہ کیس کا کیا بنا۔کچھ ملا جو مریم کو بے گناہ ثابت کرے۔اور نفی میں جواب سن کر وہ پھر کتنے گھنٹوں خاموش رہتے تھے۔مریم کو امی بتاتیں کہ

حاشر سے ابو بات کرتے تھے اور جواب کیا ملتا تھا۔اسے معلوم تھا اگر اسکا شوہر اسقدر طاقت ورنہ ہوتا تو اب وہ جیل میں ہوتی۔اور بے گناہی کے لیے بھی بھاگ دوڑ وہی کر رہا تھا ورنہ تو کیس واضح تھا ہر ثبوت اسکے خلاف جاتا تھا۔شروع میں جو گھر والوں کو یقین تھا کہ اسے پھنسایا گیا ہے وہ بے گناہ ثابت ہوگی۔ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ یقین ٹوٹتا جا رہا تھا۔اور جیسے جیسے یقین ٹوٹ رہا تھا۔ان کا رویہ مزید دل دکھانے والا ہوتا جا رہا تھا۔ایک دن امی اسے حاشر کی کال کا بتانے لگیں تو وہ رو پڑی تھی۔"امی میں نے کچھ نہیں کیا۔۔میرا یقین کریں۔۔مجھے کسی نے پھنسایا ہے۔۔"

"بی بی کس کے پاس اتنا فالتو وقت ہوتا ہے کہ جائے دوسروں کے لیے ایسی پرفیکٹ سچویشن کری ایٹ کرے۔آخر کہیں تو وہ رہ جاتا نا۔۔ہر طرف سے تمہارے ہی خلاف ثبوت ہیں۔ہوسکتا ہے تم ہی ہمیں اب تک بے وقوف بناتی رہی ہو۔۔"وہ گھر کے باقی لوگوں کی زبان بول رہی تھیں۔

مسلسل اسکے خلاف نکلتے ثبوتوں پر وہ ایسا سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ضروری تو نہیں تھا کہ وہ بے گناہ ہی ہوتی۔مریم ان سب کے رویے اتنا جلدی بدلنے پر حیران تھی۔ان گھر والوں کی محبت اس کا فخر تھی۔وہ سب ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔وہ تو ایک محبت بھرا گھرانہ تھا۔وہ محبت بھی ریت کی مانند ثابت ہو رہی تھی۔ہر گزرتے دن کے ساتھ جگہ چھوڑ رہی تھی۔کیا واقعی اتنا ہی آسان ہوتا ہے کہ اپنے خونی رشتے کو یوں مشکل وقت میں چھوڑ دیا جائے۔مریم ہر لمحے خود سے سوال و جواب میں مصروف رہتی۔

آپی آتیں تو امی کے پاس بیٹھی رہتیں۔اور امی نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ نہ ڈائننگ ٹیبل پر آئے نا ہی کسی مہمان کے سامنے۔وہ اپنے گھر میں اچھوت بن چکی تھی۔کبھی کبھی اسے لگتا کہ وہ کوئی برا خواب دیکھ رہی ہے۔جب نیند سے اٹھے گی تو ہر چیز پہلے کی طرح ہوگی۔مگر یہ برا خواب تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ان برے دنوں میں اسکا رزلٹ ہی بس خوشگوار ہوا کا جھونکا تھا۔ایک دن جب وہ سو کر اٹھی تو اسکی بیڈ سائیڈ دراز پر خاکی لفافہ رکھا تھا۔اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔کوئی مہر یا پتہ درج نہیں تھا۔اس نے کھول کر دیکھا تو اس کا ایم ایس سی کیمسٹری کا رزلٹ کارڈ تھا۔اوہ یہ تو وہ بھول ہی گئی تھی۔ہمیشہ کی طرح اسکی پہلی پوزیشن تھی۔

پتہ نہیں ابو خود لے آئے تھے اسکا رزلٹ کہ حاشر نے بھیجا تھا۔وہ بہت دیر خوشی سے اپنے رزلٹ کو دیکھتی

رہی۔ یہ اسکی زندگی کی جمع پونجی تھی۔ اسکی زندگی کا وقت کتابوں میں گزرا تھا۔ یہ اس کا اعمال نامہ تھا۔ اگر کوئی غور کرتا تو پتہ چلتا کہ اُن کاموں کے ساتھ پھر پڑھائی میں شاندار کامیابی ناممکن ہوتی ہے۔ اگر وہ اُن کاموں میں ملوث ہوتی تو کیا وہ گولڈ میڈل وِن کر سکتی تھی؟ گولڈ میڈل لینا کوئی آسان کام تو نہیں۔ طالب علم تو جی جان لگا دیتے ہیں تب جا کر صلہ ملتا ہے۔

بہت دیر اسے دیکھنے کے بعد وہ اٹھی اور اپنی وارڈروب میں بنی ایک چھوٹی دراز کو کھولا۔ وہاں وہ اپنی قیمتی چیزیں رکھتی تھی۔ اسکے ڈاکومنٹس۔۔ اسکا حاصل وصول۔ اس نے فائل باہر نکال لی۔ پھر ایک ایک کر کے اپنی ساری ڈگریوں کو دیکھتی گئی۔ اور پھر فائل میں رکھ دیتی۔ بہت سے شارٹ کورسز کے ڈپلومہ سرٹیفیکٹس تھے۔ سب سے اوپر اپنا نیا رزلٹ کارڈ رکھا۔ خوشی سے بھاگ کر گھر والوں کو بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ گھر میں سے کوئی فرد اسکے کمرے میں اسے رکھ کر گیا تھا۔

اب نہ اسکے پاس موبائل تھا نہ لیپ ٹاپ۔ باہر کی دنیا سے تو اس کا رابطہ کب کا کٹ چکا تھا۔ حاشر سے بھی بات نہیں ہوئی تھی۔ اور مریم کے دل میں شکوہ تھا وہ چاہتا تو اسکے ابو کے نمبر پر رابطہ کر سکتا تھا۔ کم از کم حال احوال ہی پوچھ لیتا۔ جب نیناں اور نازہاسٹل واپس آئی ہونگی تو لوگوں نے انہیں کیا کہا ہوگا؟ ایسے کئی سوال تھے جو اسکے دماغ میں اودھم مچائے رکھتے۔ اور پھر سب سے برا دن وہ تھا جب آپی روتی ہوئی وہاں آ گئی تھیں۔ ان کے رونے کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ مریم نے کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھول دیا تھا تو آواز واضح طور پر اندر آنے لگی تھی۔

"وہ کہتے ہیں میری طرف سے طلاق ہی سمجھو۔ مجھے کیا پتہ تھا تمہاری بہن ایسی ہے۔ تم بھی ایسی ہی ہوگی۔ اب تک بہت بے وقوف بنالیا۔ بچے بھی لے لیے۔۔ امی۔۔" ان کی دردناک آہ بلند ہوئی تھی۔ "وہ کہتے ہیں ماں باپ کو چھوڑ دو۔ میکے سے رشتہ ختم کرو گی تو بساؤں گا ورنہ بچوں کو بھی بھول جاؤ۔" وہ بولتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔ اب ان کے ساتھ امی کی آواز بھی تھی۔

امی کا تو وہ حال تھا کہ بس ذرا سا بہانا ملے اور وہ جی بھر کے روئیں۔ اب وہ رو رو کر نہیں تھکتی تھیں۔ ان کا گھر بکھر گیا تھا انہیں کیسے صبر آتا؟۔ "وہی ہے فساد کی جڑ۔۔ نکال پھینکیں اسے۔۔ اسکی وجہ سے پورے خاندان

میں بدنام ہوگئے ہیں۔"

" آپی آپ نے بھائی کو بتایا تھا؟" علی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔" میرا دماغ خراب تھا کیا کہ میں اپنی بہن کے کرتوت اپنے منہ سے اسے بتاتی۔۔" وہ غصے میں چیخ پڑیں۔" یہ بات تو ہمارے گھر تک تھی۔ ہمارے خاندان اور آپکے سسرال تک کیسے پہنچی؟" اسکا سوال اپنی جگہ تھا۔ وہاں کھڑی بھابھی چپکے سے وہاں سے نکل آئی تھیں۔ انہوں نے تو صرف اپنی ماں بہنوں کو بتایا تھا بس۔ آپی نے بھابھی کو جاتا دیکھ لیا تھا۔" آپکی بہو نے سارے خاندان کو بتایا ہے۔۔" وہ تلخ لہجے میں امی کو دیکھ کر بولیں۔ علی نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ زندگی پہلے کم مشکل تھی کہ بھابھی نے نیا عذاب پیدا کردیا تھا۔ مریم نے دروازہ بند کردیا تھا۔ آج کے لیے اتنا کافی تھا۔

ابو نے آپی کی ساس اور انکے شوہر کو بلایا تھا مگر انہوں نے آنے سے انکار کردیا تھا۔ اور انکا وہی مطالبہ تھا۔ ماں باپ سے تعلق ختم کرکے آئے کیونکہ ان کے اندر اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اس بدنامی کے طوق کو گلے میں ڈالتے۔ پھر فیصلہ تو وہی ہونا تھا بیٹی کے گھر کو کون اجاڑنا پسند کرتا ہے۔ امی رو رہی تھیں۔ نجانے کب پھر بیٹی کو دیکھنا نصیب ہو۔ علی کی آنکھیں نم تھیں۔ ابو شکست خوردہ سے تھے۔ اور دل میں ایسی تکلیف تھی کہ جیسے آج ہی رخصت کر رہے ہوں۔

☆......☆......☆

" صرف تمہاری وجہ سے۔۔ صرف تمہاری وجہ سے میرا پورا خاندان بکھر کر رہ گیا ہے۔" امی اسے مار رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ مار کھا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا امی بہت تکلیف میں تھیں۔ وہ اپنا غصہ اس پر نکالنا چاہ رہی تھیں ورنہ اسے تو کبھی بچپن میں بھی مار نہیں پڑی تھی۔ وہ تو ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ جب سے اسلام آباد پڑھنے گئی تھی امی اور زیادہ لاڈ اٹھانے لگ گئی تھیں۔ ہاں وہ بہت تکلیف میں تھیں۔ اس لیے اسے مار رہی تھیں۔" امی میں نے نہیں کیا۔۔" وہ بنا آواز بس یہی جملہ دہراتی رہی۔" مجھے کیا معلوم تھا بیٹی نہیں گند پیدا کیا ہے۔۔ آخر ایسا کیسے کرسکتی ہو تم۔۔" ہاں بس ہر جملے کے ساتھ تکلیف بڑھتی جا رہی تھی اور تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

" میں نے تو کبھی بنا وضو تمہیں دودھ بھی نہیں پلایا تھا تاکہ میری اولاد نیک ہو۔۔ یہ کیا کیا تم نے۔۔ میرے دل پر روز آرے چلتے ہیں۔۔ وہ اونچا لمبا مرد، روز مجھ سے پیٹھ پھیرے روتا رہتا ہے۔۔ وہ ہر روز رو کر

سوتا ہے۔تمہیں اندازہ ہے وہ کیا برداشت کررہا ہے۔علی۔۔وہ کب سے نہیں ہنسا۔۔میری بیٹی چلی گئی کیونکہ تم۔۔تم ہمارے گھر کا گند ہو۔۔باپ بھائی کی دشمن ہو۔پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا۔۔"

مارتے مارتے امی تھک گئی تھیں۔مریم کا دل درد سے پھٹا جارہا تھا۔"امی میں نے نہیں کیا۔۔میں کیوں کرونگی۔۔میں ایسی نہیں ہوں۔آپکو پتہ ہے میں ایسی نہیں ہوں۔۔۔"وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔امی نے نفرت سے اسے دیکھا تھا۔پھراٹھ کر باہر آگئی تھیں۔

اب تو ابو حاشر کو کال نہیں کرتے تھے۔وہ خود ہی کچھ دن چھوڑ کرانہیں کیس کے بارے میں معلومات دیتا کہ آج یہاں سرچ کیا وہاں کیا۔آج یہ ثبوت ملا۔۔اوررزلٹ ہر بار کی طرح ایک ہی ہوتا ہر ثبوت مریم عالم کو گناہ گار ثابت کرتا تھا۔وہ اس پر یقین کرتے کرتے تھک گئے تھے۔کہیں تو کچھ ایسا ہوتا جو اسے بے گناہ ثابت کرتا۔وہ یقیناً مجرم تھی۔۔ہر بات شفاف تھی۔

امی نے اسے کل سے کھانا نہیں دیا تھا ورنہ اسکے کمرے میں آکر دے جاتی تھیں۔مریم سے مزید بھوک برداشت نہیں ہوسکتی تھی۔وہ نڈھال سی کچن میں آئی۔امی اور بھابھی دوپہر کے کھانے کی تیاری کررہی تھیں۔آہٹ پر دونوں نے مڑ کر دیکھا تھا۔بھابھی نے چہرہ واپس موڑ لیا تھا۔امی نے برہمی سے اسے دیکھا۔"جی۔۔"

"امی آپ نے مجھے کل رات کو کھانا نہیں دیا تھا۔صبح ناشتہ بھی نہیں دیا مجھے بھوک لگی تھی۔۔"وہ ڈرتے ہوئے آہستگی سے بولی۔"تم چلو اپنے کمرے میں میں لے کر آرہی ہوں۔"

"امی میں اچھوت تو نہیں ہوں۔آپکی بیٹی ہوں۔بھلے آپکی نگاہ میں مجرم سہی مگر اولاد تو ہوں۔۔"وہ یہ امی سے نہیں کہہ سکتی تھی۔واپس پلٹتے دل میں کہے جارہی تھی۔اس گھر کے ہر فرد کا رویہ اسکے دل میں مزید کانٹے چبھا دیتا تھا۔تھوڑی دیر بعد امی چار سلائس اور فرائیڈ انڈے دے کر گئی تھیں۔وہ کہنا چاہتی تھی امی بھوک زیادہ لگی ہے۔مگر امی کے خوف سے خاموش رہی۔وہ پھر سے غصہ کرنا نہ شروع کردیں۔"امی۔۔"وہ دروازے پر تھیں۔جب وہ پکار اٹھی۔"جی؟؟۔۔"

"لنچ کو بننے میں کتنا ٹائم ہے؟مجھے دے جائیں گی۔؟"اسکے لہجے میں بے یقینی تھی۔"ہاں تمہاری ذاتی

خدمتگار لگی ہوں۔ دے جاؤں گی۔" وہ تلخی سے کہتی پلٹ گئی تھیں۔

پھر امی اسے کھانا دینا بھولنے لگی تھیں۔ اور اسے باہر نکلنے پر بھی سختی سے منع تھا۔ وہ اگر صبح کا ناشتہ کرتی تو اسے لنچ اور ڈنر نہیں ملتا تھا۔ اگر لنچ ملتا تو رات اور صبح کا کھانا نہیں۔ اور کبھی تینوں وقت کا کھانا وقت پر امی دے جاتی تھیں۔ وہ کسی قیدی کے جیسی زندگی گزار رہی تھی کیوں؟؟ کیونکہ وہ ان لوگوں سے محبت کرتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ تکلیف میں تھے۔ ورنہ اب تک جنت جیسی زندگی بھی تو انہی در و دیوار میں گزار چکی تھی۔ وقت بدلا تھا۔ رویہ بھی بدلے تھے۔ محبتیں نفرتوں میں بدل گئی تھیں۔ مگر اسے وہ محبت بھرا وقت نہیں بھولتا تھا۔ وہ بھولنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ یہی یادیں اسے ہمت دیتی تھیں۔ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہر چیز پرانی روٹین پر آجائے گی۔

وہ سب اس سے محبت کرتے تھے۔ ٹھیک ہے اب اسے تکلیف دیتے تھے۔ مگر اسکے خونی رشتے تھے۔ وہ ان کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ان در و دیوار سے باہر کی زندگی کو تو اس نے کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ اس لیے تو دو دن کی بھی چھٹی ملنے پر وہ گھر بھاگی آتی تھی۔ اسے یقین تھا سب پھر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ بھلے ہر گزرتا دن پہلے والے سے مزید بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ہر تکلیف کو آخری حد کی تکلیف سمجھتی۔ مگر ہر بار غلط ثابت ہوتی۔ ہر نئی تکلیف پہلے سے بڑھ کر دل کو ہلا دیتی تھی۔

"اسکی ساس کو فون کرو۔ کہو رخصتی کریں اب۔۔" اسکے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ لاؤنج میں ہونے والی باتیں صاف اسکے کمرے تک آتی تھیں۔ مریم نے کتاب سے نظریں ہٹائیں۔ اور پھر اسے بند کر دیا تھا۔ اسے اٹھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بیڈ پر بیٹھے بھی ابو کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ "پتہ نہیں کرتی بھی ہیں کہ نہیں۔۔" امی آرزدگی سے بولیں۔ "عالم۔۔ میں اسے جب کھانا نہیں دیتی تو اب نہیں مانگتی وہ۔۔" امی کی نم آواز سنائی دی تھی۔ "میں جانتی ہوں بھوک کی کچی ہے۔ میں نے سوچا دو وقت کا کھانا نہیں دوں گی تو مر جائے گی۔۔" ان کی سسکیاں بندھ گئی تھیں۔ پھر جب اسکے کمرے میں جاتی ہوں تو اسکی صورت دیکھ کر کلیجہ پھٹنے کو آتا ہے۔ میری تو سب سے لاڈلی اولاد تھی۔۔ کیسے بگڑ گئی۔۔ ترس آجاتا ہے۔۔ کیا کروں ماں ہوں نا اور اولاد تو گناہوں سمیت پیاری ہے۔۔ اسکے گناہ بہت بھاری ہیں عالم یقین کریں میرے کندھے اس بوجھ کو نہیں

اٹھا پا رہے۔۔" مریم کے آنسو بہنے لگ گئے تھے۔" میں کیا کروں۔۔میرے دل کو چین نہیں ہے۔۔میں کیا کروں۔۔" وہ شوہر کے کندھے پر سر رکھے روئے جا رہی تھیں۔اس کے ابو نے خود کو سنبھالا۔" اسے بھوک کی سزا نہ دیا کرو۔ برے اعمال سہی مگر بیٹی ہے۔۔اب سنبھالو خود کو اور اسکی ساس کو فون کرو۔کہو چھ ماہ ہونے کو آئے ہیں۔آپ لوگوں نے تو اسکے پیپرز کے بعد ایک ماہ کا کہا تھا۔اب رخصتی کریں۔۔"

" حاشر نے گھر والوں کو نہیں بتایا ہوگا کیا۔عالم الٹا مجھے ہی نہ پڑ جائیں وہ۔۔"

" نہیں مجھے امید ہے۔حاشر نے انہیں کچھ نہیں کہا ہوگا۔اور حاشر خود سارے کیس کو دیکھ رہا ہے۔اسے طلاق بھیجنی ہوتی تو اب تک بھیج چکا ہوتا۔وہ بری سہی مگر وہ اسے بسائے گا۔۔" ابو کے لہجے میں امید تھی۔ پھر اسکی امی نے اسکی ساس کو کال کی تھی۔

پچھلے چھ ماہ میں سوائے حاشر کے اسکے سسرال میں سے کسی نے بھی یہاں رابطہ نہیں کیا تھا۔انکا جواب تو واضح تھا۔مگر دلِ خوش فہم۔۔کئی گھنٹیوں کے بعد اسکی ساس کی آواز سنائی دی تھی۔امی نے سپیکر آن کیا ہوا تھا۔سلام دعا کے بعد امی نے جب جھجکتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ انہیں شروع ہو گئی تھیں۔

" کیسے بے غیرت لوگ ہیں آپ۔ابھی بھی۔۔ابھی بھی۔۔آپ کو امید ہے کہ ہم آپکی بیٹی کو لے جائیں گے۔بڑے خاندان کے دعوے کر کے گئی تھی آپکی بیٹی اور میں انہیں سچ سمجھ بیٹھی تھی۔میرے بیٹے کی زندگی تباہ کر دی اس نے۔۔کہیں کا نہیں چھوڑا ہمیں۔۔" وہ اب رونے لگ گئی تھیں۔" وہ سردار ہے اور اسکی پگ کو کیسا میلا کیا اس نے۔۔روز کتنے مردوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔اسے اندازہ ہے کہ اس نے میرے سردار بیٹے کو کسی سے نگاہ ملانے کے قابل نہیں چھوڑا۔وہ اب جب بیٹھتا ہے تو اسکا سر جھکا ہوتا ہے۔۔میں کبھی معاف نہیں کرونگی اسے۔۔کبھی نہیں۔۔" امی بے جان سی ہوئی موبائل کو دیکھتی رہیں۔ابو نے آگے بڑھ کر کال کاٹ دی تھی۔جواب مل چکا تھا۔

اسکے جانے کی آخری امید بھی ختم ہو گئی تھی۔مریم نے دروازہ بند کر دیا تھا۔اسکی بھی آخری امید ختم ہوئی تھی۔ہاں یہ دن زندگی کا سب سے برا دن تھا۔مگر نہیں جب تک زندگی ہے وہ ہر روز آپکو نئے تحفے دے گی۔آپ لینا چاہیں یا نہیں مگر ان پر آپکا نام لکھ کر انہیں آپکے دروازے چھوڑ دیا جاتا ہے۔دو دن ہی گزرے تھے

کہ وہ دودن پرانا دن اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا۔یعنی وہ سب سے برا دن نہیں رہا تھا۔بدترین دن تو آج تھا۔جب اسے طلاق کے کاغذات موصول ہوئے تھے۔وہ کاغذات اس نے جا کر وصول نہیں کیے تھے۔انہیں علی نے وصول کیا تھا۔اور پھر غصہ انسان کی عقل کو کھا جاتا ہے۔زرا سا غصہ ساری پھنے خانی نکال دیتا ہے۔اوراس کا اندازہ تب ہوتا ہے جب تک غصہ اتر چکا ہوتا ہے۔

علی نے ڈاک وصول کی تھی۔سب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔وہ لفافے پر لکھا مریم کا نام پڑھ چکا تھا۔اور اب اس میں بہن کے لیے اتنی اخلاقیات نہیں رہیں تھیں کہ وہ اسکی ڈاک بنا کھولے اسے ہی جا کر دیتا۔وہ اندر آتے ہوئے اسے کھولنے کی بھی کوشش کرتا رہا۔اور جب اسے باہر نکال کر دیکھا تو اس پر لکھے طلاق کے لفظ نے اسکے حواس چھین لیے تھے۔اس نے انہیں پھینک دیا تھا۔اس نے انہیں پورا نہیں پڑھا تھا۔وہ مریم کے نام آیا تھا اور اس میں طلاق تھی۔یہ انکے خاندان کا پہلا واقعہ تھا۔۔یہ سب حادثات پہلی مرتبہ ہی تو ہوئے تھے ان کے خاندان میں۔۔امی ابو اسکی حالت دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"کیا ہوا۔۔"ابو نے آگے بڑھ کر نیچے گرے کاغذات کو اٹھانا چاہا۔علی تیر کی تیزی سے جھکا۔"آپکی بیٹی کی طلاق آئی ہے۔۔مبارک ہو خاندان کے ماتھے پر ایک اور جھومر سج گیا ہے۔"لفافہ اور کاغذات اٹھائے وہ تیزی سے مڑا۔ابو تو سن کر ادھر ہی صوفے پر ڈھے گئے تھے۔امی علی کے پیچھے لپکیں۔وہ کہاں جا رہا تھا ان کاغذات کو لیے۔۔

پھر عرصے بعد مریم نے اپنے بھائی کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔وہ خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔جب کہ علی خونخوار تاثرات لیے اسکے سر پر جا پہنچا تھا۔"مبارک ہو جو تم چاہتی تھی ہو گیا۔۔خود سے جڑے کسی شخص کو سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا تم نے۔۔"وہ اسکا پیارا بھائی۔۔اسکا ساتھی۔۔آنکھوں میں خون لیے اسکے سر پر سوار تھا۔پھر علی نے اسکی گردن پکڑ لی تھی۔امی بوکھلا کر آگے بڑھی تھیں۔جب کہ علی پورا زور لگائے اسکا گلا دبائے جا رہا تھا۔امی کی بلند و بالا چیخوں نے گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔"مت کرو علی۔۔نہ کرو۔۔مر جائے گی یہ۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں یہ مر جائے۔۔"علی ان سے زیادہ اونچی آواز میں چیخا تھا۔مریم کی سانسیں بند

ہونے لگی تھیں۔اسکی آنکھیں پھیلتی جارہی تھیں۔امی کی چیخوں کوسن کر بھابھی ہانپتی ہوئی وہاں پہنچی تھیں۔"علی ابو۔۔ابو وہاں صوفے پر گرے ہوئے ہیں۔انہیں سنبھالواسے چھوڑو۔۔"ابو کاسن کراسکا ہاتھ ڈھیلا ہوا تھا۔وہ سب تیزی سے اسکے کمرے سے نکلے تھے۔وہ کھانسے جارہی تھی۔اسکی گردن میں شدید درد ہورہا تھااور کھانسنے سے درد مزید بڑھتا۔پھر جب اسکی حالت سنبھلی تو اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کردیا تھا۔اورلاک لگادیا تھا۔دروازے سے ٹیک لگائے وہ گہری گہری سانسیں لیتی رہی۔

علی کے ہاتھ سے گرنے والا لفافہ اسکے بیڈ کی پائنتی کے ساتھ پڑا تھا۔وہ بنا پلک جھپکے انہیں دیکھتی رہی۔یہاں تک کہ آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔اور پھر رونے کو بہت کچھ تھا۔۔اسکے سگے بھائی نے اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔آہ۔۔زندگی۔۔کیسے یقین آئے کہ جن کے ساتھ ایک ہی برتن سے بیٹھ کر کھایا ہو وہ آپکی جان کے دشمن بن جائیں۔۔حاشر۔۔کیوں چھوڑ دیا۔۔اسکا بھی قصور نہیں تھا۔۔ہر شخص مجبور تھا۔۔ہر شخص مظلوم تھا۔۔سب اذیت سہہ رہے تھے۔مگر مریم کی اذیت سوا تھی۔کہ اسی کی ذات تھی جواتنے بہت سے لوگوں کی نفرت جھیل رہی تھی۔وہ کہاں سے اتنی ہمت لاتی کہ خود کو ان نفرتوں سے پڑنے والے زخموں کی مرہم لگاتی۔"حاشر آپکا بھی قصور نہیں ہے۔۔یہ تو ایک دن ہونا تھا سو آج ہوا۔۔"رو رو کر جب وہ تھکی تو آنسو صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔اوران کاغذات کو بنا پڑھے لفافے میں ڈال دیا۔اب وہ انہیں پڑھتی کہ نہیں۔طلاق تو ہو چکی تھی۔۔جس کا اتنا اثر ورسوخ تھا کہ سنگین جرم پر اسے جیل جانے سے بچایا تھا۔اسے طلاق کے لیے اس کے سائن کی ضرورت نہیں تھی۔یقیناً یہ فارمیلٹی بھی وہ خود پوری کر چکا تھا۔مریم انہیں اٹھائے اپنی دراز کھولنے لگی۔پھر رک گئی۔یہ اس کی زندگی کی قیمتی چیزوں میں سے نہیں تھا۔اسکی جگہ وہاں نہیں تھی۔مریم نے وارڈروب کا دروازہ بند کردیا تھا اور اسے اپنی بک شیلف پر سامنے رکھا تھا۔کہ جب بھی وہاں دیکھو تو یہ نظر آئیں۔ہاں ان کے لیے وہی بہتر جگہ تھی۔اسے یاد رکھنا چاہیئے تھا کہ اسے میر حاشر نے چھوڑ دیا تھا۔

جب ماں، باپ، بہن، بھائی چھوڑ گئے تھے تو وہ کیوں نہ چھوڑتا۔ہر شخص تب تک خود کو آپ سے منسوب رکھتا ہے جب تک آپ کی ذات اسکی عزت ووقار میں اضافہ کرتی رہے۔بس ذرا سا گرنے کی دیر ہوتی ہے سب رشتے یوں آپ سے لاتعلقی کا اظہار کرنے لگتے ہیں جیسے آپکے گناہ ان کے سر نہ آجائیں۔یہ دنیا کی ریت

ہے اس کے لیے کسی سے کیا ناراض ہونا۔۔ ہر شخص کا حق ہے وہ خود کو اچھے لوگوں سے منسوب رکھے۔۔ مریم ان کاغذات کو تکتے سوچے جا رہی تھی۔ طلا؟ ق متوقع تھی مگر پھر بھی اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

"ساری دنیا کرتی مگر تم تو نہ کرتے۔۔ تم نے بھی مجھے تکلیف دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔۔۔" لفافے کو تکتے پھر سے وہ رونے لگ گئی تھی۔ اب رونا ہی تھا۔ وہ روتے روتے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔ وہ ہر بار جب بھی ملتا اسکے ہاتھ کو تھامے رکھتا۔ اسکے چہرے سے نگاہیں نہیں ہٹاتا تھا۔ وہ تو اس سے محبت کرتا تھا۔ زندگی میں سب اچھا تھا۔ زندگی تو خوبصورت تھی۔ یہ بدصورتیاں کیوں کھلی تھیں؟۔ مریم کو حاشر کے حوالے سے ہر بات پر رونا ہی آ رہا تھا۔ بے بسی تھی۔ کسی بھی مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ ہر شے برباد ہو چکی تھی۔ خوشیوں کے محل دھڑام سے پیروں میں آ گرے تھے۔ وہ اس ملبے کو دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھے اپنی چیخوں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔" کیوں ہوا یہ سب کیوں؟؟۔۔"

رونے کی آواز کو کم کرنے کو منہ پر ہاتھوں کو سختی سے جما رکھا تھا۔ سب ختم ہو گیا تھا۔ ایک خوف تھا جس نے اسکے دل کو جکڑ لیا تھا۔ مزید کیا برا ہو سکتا تھا؟ مگر اسکے دل میں اندر تک اب بس خوف تھا۔ بے اعتمادی اسکی روح تک میں آ چکی تھی۔

وہ ہر دن نئی مصیبتوں کی عادی ہو چلی تھی۔ روز کے طنز، طعنے خوراک بن چکی تھی۔ بھلے وہ لیتی کہ نہیں۔ یہ اسکا حق تھا سو گھر میں سے کوئی نا کوئی ادا کر دیتا تھا۔

مغرب کی نماز پڑھ کر لان میں آ گئی تھی۔ اس گھر میں اب بس وہ پودے ہی اسے اپنے ہمدرد لگتے تھے۔ ان کے پاس جا کر زندگی کا احساس پھر سے جاگنے لگتا تھا۔ اسے شیشے کے اس پار امی اور بھابھی لاؤنج میں نظر آ رہی تھیں۔ امی کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ بھابھی بچوں کو پڑھا کر ان کے بیگ سمیٹ رہی تھیں۔ بچے بیگ اٹھا کر اپنے کمروں میں بھاگ گئے تھے۔ وہ خاموش کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ کبھی وہ بھی ایسے مناظر کا حصہ ہوا کرتی تھی۔" آہ۔۔"

بیرونی گیٹ بہت زور سے دھڑ دھڑا گیا تھا۔ وہ ڈر گئی تھی۔ کون بدتمیز تھا۔ اس نے سوچا وہ کھولنے جائے۔ لیکن بھابھی بھاگتی ہوئی آئی تھیں۔ اسے اب خاندان والوں کے سامنے نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ مریم

نے ایک طرف رکھی اپنی جوتی پاؤں میں ڈالی۔تب تک بھابھی دروازہ کھول چکی تھیں۔علی کسی طوفان کی مانند اندر داخل ہوا تھا۔" کہاں ہے وہ بے غیرت۔۔" وہ دھاڑتا ہوا آ رہا تھا۔مریم کا دل سکڑ کر رہ گیا تھا۔کہیں آج بھی اسکی گردن نہ دبا دے۔اس نے خوف سے وہاں سے جلدی بھاگنا چاہا۔تب تک علی کی اندر آ کر اس تک نگاہ پڑ چکی تھی۔اسکے پیچھے ابو ڈھیلے قدموں سے چلتے آ رہے تھے۔نہیں۔۔ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔وہ دراصل رو رہے تھے۔جسکی وجہ سے آنکھیں دھندلی ہو جاتیں اور قدم رکھنے کو زمین دکھائی نہ دیتی تھی۔

"ابو۔۔" وہ ابو کی حالت دیکھ کر اپنا ڈر بھول گئی تھی۔۔وہ کیوں اس حال میں تھے۔علی نے اس کے پاس آئے بغیر ایک نفرت بھری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔پھر تیزی سے اندر بڑھ گیا تھا۔ابھی تو اسکے لیے دھاڑتا آیا تھا۔اب بنا کچھ کہے چلا گیا تھا۔

مریم اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی۔بھابھی ابو کو سہارا دیے لان میں رکھی کرسیوں کی جانب لے آئی تھیں۔کھلی فضا ان کے لیے بہتر ہوتی۔ابو ایک کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔مریم ان کو دیکھتی سوچنے لگی آیا ان کے قریب جائے یا نہیں۔اور چند لمحے ہی گزرے تھے۔علی ہاتھ میں گوشت بنانے والی تیز دھار چھری لیے اسکی جانب آ رہا تھا۔وہ کچھ بولتا آ رہا تھا۔

مریم تب ابو کو دیکھ رہی تھی۔امی کی آواز پر دیکھا تو وہ علی کے پیچھے بھاگتی ہوئی آ رہی تھیں۔مریم نے علی کو اور اسکے ہاتھ میں پکڑی چھری کو دیکھا۔خوف کے مارے اسکے قدم زمین میں گڑ گئے تھے۔وہ بھاگنا چاہتی تھی۔اسے اپنے بھائی کے ہاتھوں نہیں مرنا تھا۔وہ غیرت کے نام پر قتل ہونے جا رہی تھی۔۔اسے لگ رہا تھا اسکی ٹانگیں مفلوج ہو چکی ہیں۔" نہیں۔۔نہیں۔۔۔" وہ ہذیانی ہوئی چیخی تھی۔تب تک علی اسکے سر پر پہنچ چکا تھا۔" آج میں اپنے ہاتھوں سے تمہارے ٹکڑے کروں گا تاکہ تم جیسی بہنیں عبرت کا نشان بن جائیں۔وہ دائیں ہاتھ سے اسکے منہ کو دبوچے اس پر چیخ رہا تھا۔

" تمہاری وجہ سے۔۔صرف تمہاری وجہ سے۔۔کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔۔" امی علی کو بار بار بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ رہی تھیں۔وہ اس سے فریاد کر رہی تھیں۔مگر وہ انکی آواز سے بے نیاز ہو چکا تھا۔مریم نے ابو کی جانب دیکھا۔وہ بے بسی سے روتے ہوئے انہیں دیکھ رہے تھے۔۔مریم کو لگا وہ واقعی مر چکی

ہے۔اسکے ابو۔۔اسکے ابو۔۔ہاں اسی کے ابو۔۔وہ سامنے بیٹھے تھے۔اور اسکے قتل کا فرمان آچکا تھا۔

"ابو۔۔۔"وہ درد سے چلا اٹھی تھی۔"آج وہ خبیث۔۔وہ سب نمازی کہتے ہیں ابو سے،آپکی بیٹی تو چھپی رستم نکلی۔۔عالم صاحب خود بھی یہی کام کرتی تھی یا بس کرواتی تھی۔۔وہ حمزہ مجھے کہتا ہے بہن سے کہو اپنی ویڈیو دے مجھے۔۔میں پہلے کہتا تھا وہ آوارہ ہے۔۔وہ تو بازاری نکلی۔۔"علی تکلیف سے پھٹتے دل کے ساتھ وہ باتیں دہرارہا تھا۔اس پر کسی پاگل کا گمان ہورہا تھا۔"علی میں نے نہیں کیا۔۔۔میں نے نہیں کیا۔۔کچھ نہیں کیا۔۔نہیں کیا۔۔۔"وہ بے بسی سے رو رہی تھی۔

"اب تم جتنی معصومیت کے ڈھونگ رچاؤ۔۔تمہاری اصلیت سب کو پتہ لگ چکی ہے۔۔"وہ اب پوری قوت سے اسکا گلہ دبارہا تھا۔وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی تھی۔بھابھی ابو کو چھوڑ کر اسے چھڑانے آئی تھیں۔وہ امی اور بھابھی کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔پھر علی نے چھری کو اسکے پیٹ کے اندر کرنا چاہا۔مریم جو تڑپ رہی تھی تو علی کا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔وہ مریم کی بائیں سائیڈ سے جلد سے رگڑ کھا کر گئی تھی۔اور اسکی نوک ذرا سا اندگھس گئی تھی۔مریم کی دلدوز چیخیں نکلی تھیں۔"امی۔۔۔۔"اسکی قمیض خون سے رنگنے لگی تھی۔لمحوں کا کھیل تھا۔علی سمجھا اسکے پیٹ میں چھری لگی تھی۔اس نے اسکی گردن چھوڑ کر اسے پیچھے دھکیل دیا تھا۔

پھر لان میں جلتی لائٹس کی روشنی میں اسکی قمیض پر خون کی نمی دکھائی دینے لگی تھی۔علی نے چھری پرے پھینک دی تھی۔مریم تکلیف سے روتی اپنی سائیڈ کو دونوں ہاتھوں سے دبائے جارہی تھی۔امی اور بھابھی بے یقینی سے منہ پر ہاتھ رکھے اسے دہرا ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ابو دونوں ہاتھوں میں سر گرائے بلند آواز میں رو رہے تھے۔علی اب دیوار میں جا کر اپنا سر مار رہا تھا۔وہ دیوانہ ہو چکا تھا۔

امی جو گرتی بیٹی کو سنبھالنا چاہتی تھیں۔بیٹے کے پاس بھاگیں۔ہاں یہ گھر اجڑ چکا تھا۔ہر شخص بلند آواز میں رو رہا تھا۔مریم نے خود کو سیدھا کرنا چاہا۔درد کی ٹیسیں پورے جسم میں پھیل گئی تھیں۔اس نے اب کی بار سختی سے لبوں کو بھینچ لیا تھا۔پھر ہولے سے قدم اٹھاتی آگے کو بڑھی تھی۔اسے اپنے کمرے میں جانا تھا۔اگرچہ وہ مرنے والی تھی مگر اس گھر میں اپنی واحد جائے پناہ میں مرنا تھا۔بھابھی اسے قدم بڑھاتا دیکھ اسے سہارا دینے کو اسکے پاس آئی تھیں۔

مریم نے نفرت سے ان کے ہاتھ کو جھٹک دیا تھا۔اسے پہلی بار اس گھر سے،اس گھر کے لوگوں سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔وہ اسی طرح بمشکل چلتے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔اس نے مڑ کو ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا۔جہاں امی اب علی کو گلے سے لگائے رو رہی تھیں۔ان کے رونے کی آوازوں نے اسکے کمرے تک اسکا پیچھا کیا تھا۔دروازہ بند کرتے آوازیں مدھم ہو گئی تھیں۔وہ لڑکھڑاتے ہوئے چلتے بیڈ کے ساتھ نیچے بیٹھ گئی تھی۔اسکی گردن میں درد تھا۔سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔اتنی تکلیف کہ اسکا دل چاہ رہا تھا وہ سانس نہ لے۔

اور پھر وہ چھری سے لگے زخم کا درد۔۔امی کا اس تک نہ آنا،اور ابو کا دور بیٹھ کر اسکا قتل ہوتے دیکھنا اور سب سے بڑھ کر دوست جیسے بھائی کا یوں جان کا دشمن ہونا۔۔وہ کس چیز پر روتی۔۔اپنے جسم کی تکلیف پر یا روح کی تکلیف پر۔۔وہ جان گئی تھی آج اسکی زندگی کی آخری رات تھی۔اب اس میں سانسیں کم بچی تھیں۔تکلیف سے روتے اس نے اپنے بائیں ہاتھ کو زخم سے ہٹا کر اپنے سامنے کیا۔اسکا ہاتھ کانپ رہا تھا۔وہ خون آلود تھا۔" آہ۔۔امی۔۔"وہ خوف سے پھر چلا اٹھی تھی۔

"امی میرا خون۔۔امی۔۔ابو جی آپ آئیں۔۔آئیں بھی۔۔۔کوئی تو آؤ۔۔۔میں مر رہی ہوں۔۔میرا خون بہہ رہا ہے۔۔امی۔۔"اسے اتنا گہرا زخم نہیں آیا تھا۔اور چھری بھی جسم کے اندر بہت گہری نہیں گئی تھی۔ایک طرح سے اسکی جلد پر ہی زخم آیا تھا۔وہ خون کا بہاؤ بس کچھ دیر کا تھا۔وہ اسی طرح ہاتھ رکھے رہتی تو خون بہنا بند ہو جانا تھا۔مگر اس نے اپنا زخم نہیں دیکھا تھا۔اپنا خون دیکھ کر اس کے حواس جا رہے تھے۔اسے لگ رہا تھا۔وہ اب بس مر جائے گی۔کیونکہ اسکے پیٹ میں چھری لگی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔اور پھر ہر درد اور تکلیف پر موت کا خوف حاوی ہو گیا تھا۔دنیا کا سب سے بڑا ڈر۔۔موت کا۔۔ہر ڈر کی بنیاد۔۔

پانی سے ڈر لگتا ہے۔کیوں؟؟ ڈوب جائیں گے۔۔ڈوب گئے تو پھر۔۔پھر مر جائیں گے۔۔نہیں۔۔نہیں۔۔پانی میں نہیں جانا۔۔ڈر لگتا ہے۔

بلندی سے ڈر لگتا ہے۔کیوں؟؟ نیچے گر جائیں گے۔۔تو؟؟ تو کچھ بھی نہیں بچے گا ہڈیاں بھی نہیں۔۔اور ہم مر جائیں گے۔بلندی سے ڈر لگتا ہے۔۔

اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔۔۔
فلاں جانور سے ڈر لگتا ہے۔۔فلاں کیڑے سے ڈر لگتا ہے۔۔فلاں چیز سے ڈر لگتا ہے۔۔دنیا میں بہت سی قسم کے ڈر ہیں اور ہر ڈر کی بنیاد موت ہے۔۔انسان درحقیقت موت سے ڈرتا ہے۔اگر کسی بھی انسان سے چند لمحے بھی رک کر اس سے کوئی ڈر، خوف
پوچھا جائے تو جو وہ بتائے گا وہ پس پردہ موت کا خوف ہوگا۔۔انسان ازل سے موت سے ڈرتا ہے۔وہ خود پر سو خول چڑھائے مگر جب وہ ڈر حقیقت بن سامنے آئے تو پتہ چلتا ہے۔بہادری نام کی ہوتی ہے۔۔موت کا خوف تو بہت برا ہے۔اور دراصل بہادر وہی ہوتے ہیں جو اس خوف پر قابو پاتے ہیں۔جو اس ڈر پر حکمرانی کرتے ہیں۔اور یہ سب کے بس کے بات کہاں ہوتی ہے۔۔اس وقت وہ بھی موت کے خوف کا شکار ہو چکی تھی۔وہ خوف کے مارے پسینہ پسینہ ہو چکی تھی۔کمرے میں پنکھا پہلے سے چل رہا تھا مگر اسے ہوا نہیں لگ رہی تھی۔اسکے ذہن سے ہر بات ختم ہوتی جا رہی تھی سوائے اسکے کہ وہ اب چند گھنٹوں میں مر جائے گی۔اسکا جسم سرد ہو جائے گا۔۔اور۔۔وہ مر جائے گی۔۔
کمرے کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھلا تھا۔مریم نے خوف سے روتے ہوئے گھٹنوں میں چہرہ چھپا لیا تھا۔اسکا جسم واضح طور پر کانپ رہا تھا۔کسی کے قدموں کی آواز تھی۔مریم کو کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔وہ کیا پڑھے۔۔کوئی اسم ہو جو اس سے نجات دلائے۔۔زندگی بدتر تھی۔۔مگر پھر بھی وہ زندگی تھی۔۔موت کی خواہش اور تمنا کے باوجود بھی جب وہ سامنے آ جائے تو انسان اس سے فرار کے ہر ممکن راستے تلاش کرنے لگتا ہے۔۔
کون تھا؟ کیا موت کا فرشتہ۔۔وہ پھر سے آواز کے ساتھ رونے لگ گئی تھی۔"بند کرو اپنے یہ ڈرامے۔۔" امی کی تنفر بھری آواز اسکے بہت قریب سے آئی تھی۔وہ ڈر کر اچھلی تھی۔۔"امی۔۔مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔۔"اس نے اپنا دایاں ہاتھ انکی طرف بڑھایا۔وہ پکڑ لیتیں تو خوف کم ہو جانا تھا۔
"ایسی حرکتیں کرتے ڈر نہیں لگا تھا۔۔نہ ماں، باپ کا نہ خدا کا۔۔اب تمہیں بڑے خوف آ رہے ہیں۔ڈائن ہو تم۔۔میرے گھر کی خوشیوں کو کھا گئی۔۔تم خود کیوں نہیں مر جاتی ہو۔۔کیوں میرے بیٹے کو اپنا قاتل بنانا چاہتی ہو۔تم چاہتی ہو وہ تمہیں مار کر اپنی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم کر لے۔۔خود کیوں نہیں مر جاتی

ہو۔۔کیوں اپنے ہی خاندان کی دشمن بن گئی ہو۔۔"امی روتے ہوئے اسے ملامت کر رہی تھیں۔اسکا ہاتھ پھر سے اسکے پہلو میں آ گرا تھا۔امی اسکے لیے نہیں آئی تھیں۔۔نفرت کا جذبہ ایسا ہے کہ اس سے بندھی پٹی پھر انسان کو اولاد سے بھی بے نیاز کر دیتی ہے۔امی کی آنکھوں پر اسکی نفرت کی پٹی تھی وہ کیسے دیکھ سکتی تھیں کہ وہ درد کی انتہا پر تھی۔

"تمہارا باپ ذلت سے مرجانے کو ہے۔۔بھائی اپنی جان کے درپے ہے اور تم ہو کہ ابھی بھی اپنے درد، تکلیف سوچ رہی ہو۔۔تم مر کیوں نہیں جاتی ہو۔۔"مریم کا پورا جسم روتے ہوئے کانپ رہا تھا۔

"امی نہ کہیں ایسے۔۔۔" وہ گھٹنوں میں سر دیے بول رہی تھی۔"میں نے کچھ نہیں کیا۔۔اتنی نفرت نہ کریں۔۔"اسکی امی چند لمحے اسے نفرت سے دیکھتی رہیں۔پھر وہ وہاں سے چلی گئی تھیں۔مریم ایک بار پھر سے کمرے میں اکیلی تھی۔اپنے خوف سمیت۔۔

امی کی باتوں کو سوچتے ایک بار پھر اپنے زخم پر دھیان چلا گیا تھا۔اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور ہاتھ کو اپنے سامنے کیا۔اس پر خون ویسے ہی لگا ہوا تھا۔وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔۔"اللہ میں کیا کروں۔۔۔"اس کے ذہن پر غنودگی چھانے لگی تھی۔مگر نہیں۔۔یہ صرف اسکا خوف تھا جو اسے ایسے محسوس کروا رہا تھا۔

پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے ملک الموت اسکے سامنے آ کھڑا ہو۔اسکے منہ سے بھنچی بھنچی آواز نکلی تھی۔وہ خون آلود ہاتھ منہ پر رکھے چند قدم پیچھے کو ہوئی تھی۔"نہیں۔۔۔پلیز نہیں۔۔"وہ تصور کر رہی تھی کہ کوئی کالے کپڑوں میں اسکے سر پر کھڑا ہے۔اب کی بار اسکے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔اور جب پسینے کے چند قطرے بہتے ہوئے اسکی پیٹھ سے نیچے اسکی کمر تک آئے تھے۔وہ ان قطروں کے جسم پر چلنے سے بھی ڈر گئی تھی۔اس نے تیزی سے بازو موڑ کر اپنی پشت کو چھوا تھا۔اسکے جسم پر ابھی کچھ چلا تھا۔کسی چیز نے حرکت کی تھی۔وہ بھنچی آواز سے روتے ایک ہاتھ اپنے زخم پر رکھے ہوئے تھی اور دوسرے کو پیٹھ پر دیوانہ وار پھیر رہی تھی۔

سامنے موت کھڑی تھی۔۔"اللہ۔۔میرے اللہ۔۔میں کیا کروں۔۔کوئی نہیں ہے میرے پاس۔۔" پھر اسے محسوس ہوا کہ اسکے پاؤں کے انگوٹھوں پر سرسراہٹ ہوئی تھی۔اور موت کا فرشتہ اسکے پیروں سے اسکی جان نکال رہا تھا۔گردن میں سانسیں اٹکنے لگی تھیں۔اور یاد رکھیں ہر شے کا ایک انت ہوا کرتا ہے۔۔ایسے ہی انسانی

خوف کا بھی۔۔اکنامکس کا ایک نظریہ ہے کہ کسی بھی شے کی طلب یا اسکی پیداوار کی ایک حد مقرر ہوتی ہے۔ٹاپ پوائنٹ۔۔پھر اس پوائنٹ پر پہنچ کر وہ طلب، پیداوار کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ایسے ہی ہر انسانی جذبہ ہوتا ہے۔اگر کوئی جذبہ اپنے پیک پوائنٹ کو چھو لے تو وہ اس پوائنٹ کے بعد اپنی اہمیت کھونے لگتا ہے۔بلندی پر کچھ عرصے تک ہی رہا جا سکتا ہے۔بلندی پر ہمیشگی نہیں ہوتی۔انسان بہت سے خوف لیے ساری زندگی جیتا ہے۔کیوں؟ کیونکہ وہ کبھی ان کے پیک پوائنٹ تک نہیں پہنچا ہوتا اس لیے۔انسان جس خوف کے آخری مقام کو چھو لے پھر وہ خوف بے معنی ہو جاتا ہے۔اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جب انسان کو اپنے خوف سے آزادی حاصل ہوتی ہے۔وہ خوف کی اس انتہا کو چھو چکی تھی۔اس نے پیٹھ سے ہاتھ ہٹا کر سامنے کر لیا تھا۔اور پوری طرح آنکھیں کھولے اپنے تصور کی آنکھ سے نظر آتے اس موت کے فرشتے کو دیکھا تھا۔وہ اسی طرح کھڑا تھا۔خونخوار تاثرات لیے اسکی جانب دیکھتا ہوا۔اس نے پھر سے روتے ہوئے گھٹنوں میں چہرہ چھپا لیا تھا۔"پلیز چلے جاؤ۔۔مجھے ڈر لگ رہا ہے۔۔" اس خوف نے چند گھنٹوں میں اسکی حالت خراب کر دی تھی۔خود اسے اپنی ذہنی حالت مشکوک لگ رہی تھی۔وہ فرشتہ کے خوف سے کبھی بیڈ کے بالکل قریب ہو کے بیٹھتی کبھی کھسک کر بیڈ کی سائیڈ دراز تک جا بیٹھتی۔وہ جہاں جا بیٹھتی۔موت کا فرشتہ اسے سر پر کھڑا دکھائی دیتا۔

"امی۔۔۔" بے بسی کی حد تھی۔بلانے پر کوئی نہیں آ رہا تھا اور وہ بن بلائے کب سے سر پر کھڑا تھا۔

"وہ سب نہیں آئیں گے کوئی نہیں آئے گا میرے پاس۔۔موت کے وقت سب اکیلے ہوتے ہیں۔۔آؤ اب تم آ جاؤ۔۔"

اور پھر اس نے موت کا سامنا کرنے کا سوچا۔

"میں مر جاؤں گی۔۔سب مر جاتے ہیں۔۔میرا وقت اب ہے۔۔یہ فرشتہ میرے ساتھ کیا کرے گا؟؟؟" وہ اس کے کالے کپڑوں کو جرأت سے دیکھنے لگی۔"یہ میری روح کو اللہ کے پاس لے جائے گا۔۔اور اللہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔۔" اسکا رونا تھم چکا تھا۔بہتے آنسو رک گئے تھے۔"اللہ۔۔وہ مجھ سے میری پوری زندگی کے اعمال کا حساب لے گا۔اور میں نے کیا کیا ساری زندگی؟ کبھی بھی جان بوجھ کو اسکی نافرمانی نہیں کی۔۔۔کبھی اسکی حدیں نہیں توڑیں۔۔میرے گناہ۔۔میں نے کبھی جان بوجھ کر گناہ نہیں کیا۔۔اور اگر کیا

ہے تو؟؟ تو وہ میرا اللہ ہے۔۔وہ مجھ سے نرمی سے سلوک کرے گا کیونکہ میں نے کبھی اسکی جان بوجھ کرنافرمانی نہیں کی۔وہ مجھ پر غصہ نہیں ہوگا۔اور جن گناہوں کو میں اپنی نادانی کی وجہ سے گناہ نہیں مانتی اس لمحے میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔۔اے رب میرے تمام گناہوں کو معاف کردے۔۔بس یہی ہے موت۔۔میں کیوں اس سے ڈر رہی ہوں۔" وہ کالے کپڑے دور ہو رہے تھے۔اس نے اب آنکھوں کو بند کر کے کلمہ پڑھا۔اور بولی۔" آؤ اور مجھے لے جاؤ۔میرا وقت ختم ہوا۔۔" پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔وہ موت کا فرشتہ کہیں نہیں تھا۔اس نے گردن یہاں وہاں گھمائی۔وہ کمرے میں اکیلی تھی۔

اس نے چند گہری سانسیں لیں۔تو موت کا خوف تمام ہوا۔مبارک ہو مریم عالم تم اس جنگ میں فاتح ٹھہری۔۔ہاں جو موت کے خوف پر قابو پاتے ہیں وہی فاتح کہلانے کے حقدار ہیں۔اس کے ذہن سے موت کے خوف کے جالے کیا اترے تھے۔اس میں نئی ہمت آ گئی تھی۔چند لمحوں پہلے اسے بمشکل سانسیں آ رہی تھیں۔اب وہ دھیرے سے ناک کے ذریعے گہری سانس لیتی اور پھر اسے آزاد کر دیتی۔اسکا ذہن آہستہ آہستہ بے دار ہونے لگا تھا۔

آج شام کا واقعہ پھر سے ذہن میں تازہ ہوا تھا۔اس کے بھائی نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔گھر کے سب لوگ جانتے تھے وہ زخمی تھی مگر کوئی اسکے زخموں کی دیکھ بھال کرنے نہیں آیا تھا۔بھلے ان کے سامنے نہیں مری تھی مگر چھری لگے زخم کے ساتھ اسے مرنے چھوڑ دیا گیا تھا۔وہ مر جاتی تو اس کے کفن دفن کا انتظام کر لیتے اور۔۔پہلی بار۔۔پہلی بار اسے ان سب سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔وہ ایک ہاتھ زمین سے ٹکائے اوپر کو اٹھی۔اٹھتے ہوئے بائیں حصے میں شدید درد اٹھا تھا۔اس نے لب بھینچ لیے تھے۔اٹھ کر کمرے کا دروازہ لاک کیا تھا۔پھر اسی طرح چلتی آئینے کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔زخم سے ہاتھ ہٹاتی وہ سیدھی کھڑی ہوئی۔اسکی قمیض پر خون کا بہت بڑا دھبہ تھا۔

مریم نے نے آہستگی سے بائیں جانب سے قمیض اوپر کی اور آئینے میں اپنے زخم کو دیکھا۔اسکے لب ابھی بھی بھنچے ہوئے تھے۔ایک انچ برابر زخم تھا۔مسلسل ہاتھ رکھنے سے اب وہاں سے خون نہیں بہہ رہا تھا مگر اسکی جلد دو حصوں میں ہوئی لگتی تھی۔اس نے غور سے دیکھا۔زخم تو صرف وہی تھا۔اسکے اردگرد چھری کی رگڑ تھی جیسے

ہلکی سی لگ کے گئی ہو۔جلد ہلکی سے الگ ہوئی تھی مگر اندر تک نہیں پھٹی تھی۔وہاں بھی خون سوکھا ہوا تھا۔اسکے کمرے میں کوئی فرسٹ ایڈ باکس نہیں تھا۔اسکے لیے کچن میں جانا پڑتا۔اب وہ باہر نکلنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔وہ دیکھتے کہ نہیں مری تو شاید اب پوری طاقت سے مار دیتے۔اسے امی کی بات یاد آئی۔

"تم مر کیوں نہیں جاتی۔۔"ان سب کو اسکی موت کی تمنا تھا۔طبعی موت آتی یا وہ خودکشی کر لیتی۔۔وہ یہ نہیں چاہتی تھیں کہ اسکی موت ان کے بیٹے کے ہاتھوں ہو۔۔بس بیٹا قاتل نہ بنے ہاں مگر وہ ضرور مر جائے۔۔طبعی طور پر۔۔اور خودکشی کا راستہ تو بتا کر گئی تھیں۔۔مریم نے پھر سے نم ہوتی آنکھوں کو خون آلود ہاتھوں سے صاف کیا۔اس نے غور کیا۔اس کے چہرے پر بھی خون لگا ہوا تھا۔اس نے قمیض نیچے کر کے ٹھیک کر دی۔پھر آہستگی سے چلتی وارڈروب کی طرف آئی۔ایک لان کی قمیض نکالی۔اور پھر بیڈ کی سائیڈ دراز تک آ کر قینچی کی مدد سے اسے کاٹا۔اسکے ایک کٹے حصے کو فولڈ کرتے اتنا چھوٹا کر دیا تھا کہ اسکے زخم کو آرام سے کور کر لیتا۔پھر اس نے ایک اور لمبی پٹی کاٹی۔وہ چھوٹی لگ رہی تھی۔ایک اور کاٹی۔پھر ان دونوں کو گانٹھ لگا کے جوڑ دیا۔

"دوپٹہ ہی لے لیتی۔۔"اسے افسوس ہوا۔پھر آئینے کے سامنے جا کر اس نے فولڈ کی ہوئی پٹی کو زخم پر رکھا۔وہ اس وقت اپنے زخم کو صاف کرنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔بند ہوا زخم پھر سے کھل جاتا تو اور خون بہنے لگتا۔پھر لمبی پٹی کو کمر کے گرد کر کے زخم کے ایک طرف کر کے اسے بھی گانٹھ لگا دی تھی۔

اس کے پاس اب دو راستے تھے۔یا تو خودکشی کر لیتی۔۔کیونکہ اس گھر میں اب مزید اسے زندہ دیکھنا ان لوگوں کے لیے ناممکن تھا۔تو،یا تو خودکشی کر لیتی یا پھر۔۔یا پھر وہ یہاں سے دور چلی جاتی۔۔مریم نے دوسرے راستے کو چننے کا فیصلہ کیا تھا۔وہ آہستہ قدموں سے چلتی دوبارہ اپنی الماری کی طرف آئی تھی۔اس میں ایک کونے میں اسکا کالج کا فیورٹ بیگ رکھا تھا۔جو وہ بہت کم استعمال کرتی تھی کہیں خراب نہ ہو جائے۔وہ خالی تھا۔

مریم نے اپنے دو سوٹ اس میں رکھے۔اور دراز کھول کر اپنے ڈاکومنٹس کی فائل بھی نکال لی تھی۔اسے

بھی بیگ کے اندر رکھا۔اسے پیسے چاہیئے تھے۔اسے یاد آیا۔اسکی چیک بک بھی پولیس نے واپس نہیں کی تھی۔اکاؤنٹ میں اب جتنے بھی پیسے تھے وہ بے کار تھے۔اور کیش پتہ نہیں کتنا تھا۔جب سے آئی تھی اس نے تو پیسوں کو استعمال ہی نہیں کیا تھا۔اور نہ ہی اور ملے تھے۔اس نے اپنا اسلام آباد والا بیگ چیک کیا۔اس میں دس ہزار تھے۔اتنے پیسوں میں وہ یہ شہر تو آرام سے چھوڑ سکتی تھی مگر آگے کیا ہوتا؟اس کا ہاتھ کان میں پہنی بالیوں تک گیا۔وہ بھی ناکافی تھیں۔اس نے جلدی سے آگے بڑھ اپنے نکاح کے زیور کو دیکھا۔امی ابو نے بھی ایک سیٹ گفٹ کیا تھا۔

اس کے پاس ان سب کی رسیدیں نہیں تھیں۔نجانے وہ بکتا کہ نہیں۔پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنے نکاح کی تین تصویریں البم سے نکال لیں جس میں اس نے یہ سارا زیور پہنا ہوا تھا۔یہ تصویریں رسیدوں کا کام کرنے والی تھیں۔"میر حاشر تم تو کام نہ آئے۔۔چلو یہ زیور ہی کام آجائے۔۔آخر منکوحہ رہی ہوں تمہاری۔۔اتنے پر تو میرا حق ہے۔۔" تنفر سے بولتی وہ ایک ایک زیور کو ڈبوں سے نکال رہی تھی۔

اور پھر ایک صاف سوٹ نکال کر اپنے کپڑے بدل لیے تھے۔چہرہ بھی صاف کر چکی تھی۔وہ اب جانے کو تیار تھی۔بیڈ پر بیٹھے اسکی نگاہ سامنے بک شیلف تک گئی۔اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔طلاق کے کاغذات اسے اپنا مذاق اڑاتے محسوس ہو رہے تھے۔میر حاشر پر یقین تھا۔اسکی محبت پر۔۔بدگمانی کے باوجود بھی اندر کہیں گہرا تھا یہ یقین کہ،وہ اسے نہیں چھوڑے گا۔ہر یقین ٹوٹنے کے لیے ہوتا ہے۔" کیا انہیں بھی ساتھ لے جاؤں۔" اس نے ان کاغذات کو دیکھتے سوچا۔پھر نفی میں سر ہلایا۔" نہیں ان سب نے میرا جتنا نقصان کرنا تھا کر لیا۔۔۔"

اس رات نے اسے مکمل طور پر بدل دیا تھا۔وہ اپنے اندر غصہ اور نفرت محسوس کر رہی تھی۔سب کے لیے۔۔زندگی میں جتنی بے وقوفیاں کرنی تھی کر لی تھیں۔۔اب پھر سے پرانے طور طریقے نہیں اپنانے تھے۔اس لیے اسے اب رات کے اندھیرے میں یہ گھر نہیں چھوڑنا تھا۔وہ پاگل تو نہیں تھی کہ اس وقت نکل کر خود کو مصیبت میں ڈالتی۔۔

بھلا رات کو بھی کبھی اکیلی عورتوں کو باہر جائے پناہ ملی ہے؟۔۔اس وقت سوائے لوفروں کے کون ہوتا

باہر۔۔یا پھر کتے ہوتے۔۔وہ بیڈ پر بیٹھی صبر سے صبح کے ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔اور جب صبح کی روشنی پھیل گئی تھی۔اس نے آہستگی سے اٹھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔سامنے کوئی بھی نہیں تھا۔اس نے واپس جا کر بیڈ پر رکھا بیگ ایک طرف سے کندھے پر ڈالا اور دوپٹہ ٹھیک کیا۔دوپٹہ بہت بڑا تھا،چادر کی ضرورت نہیں تھی۔کمرے سے باہر نکل کر اس نے کمرے کا دروازہ واپس بند کر دیا۔

اگر وہ اسے دیکھنے نہ آتے تو انہیں پتہ بھی نہیں چلنا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ورنہ کل نہیں مری تھی تو اب کی بار اسے یقیناً بھرے بازار میں الٹا لٹکا دیتے۔وہ مضبوط بنی ہولے سے قدم اٹھاتی باہر کی طرف جا رہی تھی۔لان خالی تھا۔مین گیٹ تک پہنچ کر اس کا دل چاہا وہ مڑ کر دیکھے۔مگر یہ بے کار تھا۔اب یہ گھر اس کا نہیں تھا۔بنا آواز پیدا کیے اس نے لاک کھولا۔اور پھر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا تھا۔رات کے واقعے کے بعد یقیناً علی اور ابو گھر میں ہی تھے۔مسجد کوئی نہیں گیا تھا۔اس نے چہرہ چھپانے کو دوپٹے کو ماتھے سے ذرا نیچے تک کھینچ لیا تھا۔نقاب کرنے کا سوچا مگر نہیں کیا کہیں مشکوک نہ لگتی۔اسے اب جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔اسے موت سے ڈر نہیں لگتا تھا لیکن اسے بس اپنے باپ بھائی کے ہاتھوں سے قتل نہیں ہونا تھا۔وہ آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے ہولے ہولے قدم اٹھا رہی تھی۔وہ تیز نہیں چل سکتی تھی۔ذرا سی دیر میں آہستہ چلنے کے باوجود بھی اسے اپنی سائیڈ میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔

کاش کوئی رکشہ مل جاتا۔اور چند قدموں کے بعد اسے سواری مل گئی تھی۔پہلے وہ راستے میں ایک لیڈی ڈاکٹر کے کلینک پر اتر گئی تھی۔اسے اپنے زخم کی نوعیت نہیں معلوم تھی۔جب اکیلے زندگی جینی تھی تو اپنا پہلے سے زیادہ خیال کرنا تھا کہ انجان لوگوں میں گرنا الٹا نقصان دہ ہوتا ہے۔

اتنی صبح ڈاکٹر نہیں تھی۔نرس بار بار اسکے زخم کی وجہ معلوم کر رہی تھی۔"شوہر نے مارا ہے؟"اس نے ہاں میں گردن ہلائی۔"یہیں کی ہو؟"وہ اس سے اسکا پورا بائیوڈیٹا معلوم کرنا چاہتی تھی۔"اس نے اب بھی اقرار میں گردن ہلائی۔"اچھا اب میکے جا رہی ہو۔"مریم نے اب بھی انکار نہیں کیا تھا۔اس کے سوال اس کے لیے آسانی پیدا کر رہے تھے ورنہ اس نے نہیں سوچا تھا کہ ان زخموں پر ڈاکٹر سے کیا کہے گی کہ کیسے آئے۔

"زخم بہت گہرا نہیں ہے۔شکر کرو۔میری مانو تو اب ایسے شوہر کے پاس لوٹنے کی ضرورت بھی نہیں

ہے۔ظالم درندہ۔۔چھریوں سے بیوی کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔" مریم چونک گئی تھی۔اس نے اسے نہیں بتایا تھا کہ اسے یہ زخم کیسے آیا تھا۔اب جو روز مریضوں کو ڈیل کرتے ہوں یقیناً انہیں زخم دیکھ کر اسکی نوعیت معلوم ہو جاتی تھی۔" خوش قسمت ہو بچ گئی ہو۔میرا شوہر بھی پہلے مجھے بہت مارتا تھا۔۔جس دن میں نے اسے اسی کی طرح مارا۔اب نہیں مارتا، ڈرتا ہے کہیں اسی کی طرح اسکا سر نہ پھاڑ دوں۔۔ایک تو تم پڑھی لکھی لڑکیاں بس زبان ہی چلاتی ہو عقل بھی چلالیا کرو۔ارے ڈرو گی تو اور ڈرائے گا۔۔مرد ہوتا ہی ایسا ہے۔۔" وہ اسے نجانے کونسے سنہرے پاٹ پڑھا رہی تھی۔مریم جی بھر کر بےزار ہوئی۔نرس اس سے ہمدردی میں بولتی رہی۔

" ڈاکٹر صاحبہ تو نو بجے کے بعد آتی ہیں۔لیکن میں یہاں کی سب سے قابل نرس ہوں۔روز عورتیں بچے پیدا کرنے آئی ہوتی ہیں۔۔" " یا اللہ کوئی اسے چپ کرا دیتا۔" بات سنیں۔مجھے آپکا موبائل مل سکتا ہے؟ میرے شوہر نے موبائل چھین لیا ہے۔اب گھر والوں سے رابطہ کرنا ہے۔" نرس نے چلتی زبان کو روک کر لینڈ لائن کی طرف اشارہ کیا۔اگر کوئی اسکے کمرے میں جا کر دیکھتا تو اسکی غیر موجودگی پر اسے ڈھونڈنے سب سے پہلے بس اسٹینڈ جاتے۔اسے اپنی منزل تبدیل کرنی تھی۔انٹرنیٹ ہے یہاں؟" ہاں کمپیوٹر میں لگا ہوا ہے۔لیکن وہ ڈاکٹر صاحبہ کا ہے میں استعمال نہیں کرنے دوں گی۔"

اس نرس کا اتنی سی بھی خوش اخلاقی دکھانا بہت تھا۔ورنہ پاکستان میں نرسوں سے خوش اخلاقی کی امید رکھنا وہ بھی کسی مریض کے ساتھ۔۔انتہائی معذرت کے ساتھ مگر پاکستان میں شاید ایک فیصد ایسی خوش اخلاق نرسز ہیں۔ورنہ تو یوں رویہ ہوتا کہ جیسے ڈاکٹر ہی وہی ہیں۔۔اور مجھے کہنے دیں ڈاکٹر ہونے کے باوجود بھی غرور کرنا تو کسی طور نہیں جچتا۔مریم اپنی دوائیاں اور پرچہ لیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔اور پھر ایک دو کمروں میں جا کر وہاں بیٹھی خواتین سے موبائل مانگا۔ایک نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔اب ہر کوئی مریم عالم تو نہیں ہوتا جو مانگنے پر انکار نہ کرے۔آخر ایک کمرے میں بیٹھی خاتون نے اپنا سمارٹ فون اسکے حوالے کیا۔اس نے انٹرنیٹ کی مدد سے لاہور جانے والی بسز کا شیڈول چیک کیا۔وہ ہمیشہ ڈائیو سے سفر کرتی تھی۔اگر اسے دیکھنے جاتے تو یقیناً پہلے وہیں جاتے۔اس نے دوسری بس کمپنی سے چند گھنٹوں بعد کی بکنگ کروالی تھی۔شکریہ کے ساتھ موبائل واپس کرتی وہ ویٹنگ لاؤنج میں آبیٹھی تھی۔

جب وہ آئی تھی تب کوئی نہیں تھا۔اب ہولے ہولے مریض خواتین آنا شروع ہوگئی تھیں۔گائنی کلینک تھا۔اس کے ساتھ بیٹھنے والی جب اس سے کوئی سوال پوچھتی تو اس کا دل چاہتا ان کے منہ پر ٹیپ چپکا دے۔یہ عورتیں اس قدر فضول کیوں بولتی ہیں۔وہ چپ بیٹھی تھی تو سب کی توجہ بار بار بھٹک کر اسی کی طرف جاتی۔مریم کو یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کا فیصلہ فضول لگا تھا۔

بس اپنے زخم کے لیے آئی تھی پھر چیک اپ کے بعد چلی جاتی۔لیکن یہاں اسے ڈھونڈے جانے کا ڈر نہیں تھا اس لیے بیٹھ گئی تھی۔پھر وہ پکاؤ تاثرات لیے بیٹھی رہی۔پوچھتی رہو جو پوچھنا ہے۔۔

یہ شادی شدہ عورتیں تو بے تھے بیل کی طرح ہوجاتی ہیں۔زرا جو بولتے ہوئیں سوچیں۔بس شادی کا لائسنس ہے جو بول دو گناہ معاف۔مریم تپی بیٹھی تھی۔پھر آخر کار اسکے جانے کا ٹائم ہوگیا تھا۔اب کی بار اس نے نقاب کر لیا تھا۔اب اچھا خاصا دن تھا۔بہت چہل پہل تھی باہر۔اللہ کا نام لیے اس نے اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔اس کے اندازے کے عین مطابق اسکے ابو اور بھائی اسے اسلام آباد جانے والی بسوں میں ڈھونڈتے رہے۔اسکے جانے کے ایک گھنٹے بعد ہی انہیں اسکے گھر چھوڑنے کا پتہ چل گیا تھا۔وہ بسوں کے شیڈول کے حساب سے وہاں چکر لگا رہے تھے۔جب وہ اپنی بس میں بیٹھی تھی تو سامنے ہی ابو اور علی اسلام آباد جانے والی بس میں سے نکل رہے تھے۔اسکی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پھیل گئی تھی۔اسے بیچ بازاریوں باپ بھائی کے ہاتھوں گھسٹتے ہوئے نہیں جانا تھا۔وہ اپنے بچاؤ کی دعائیں کر رہی تھی۔پھر وہاں سے چہرہ موڑ کر گردن جھکا لی تھی۔بالآخر اسکی بس چل پڑی تھی۔زندگی کا یہ باب بھی تمام ہوا تھا۔

☆......☆......☆

لاہور پہنچ کر سب سے پہلے بازار جانا تھا۔تاکہ پیسوں کا انتظام ہوسکتا اور وہ اپنی رہائش کا انتظام کرتی۔۔وہ پہلی بار لاہور آئی تھی۔لیکن کیونکہ وہ سفر کرنے کی عادی تھی۔اور دو سال اکیلے ایک شہر میں گزار آئی تھی۔اس لیے وہ انجان شہر میں بھی پر اعتماد تھی۔

اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو اسے ایسی مارکیٹ میں لے جانے کو کہا تھا جہاں گولڈ کی سب سے بہترین شاپس تھیں۔اسکے اندازے کے مطابق وہ بڑی دکان والے اس سے ان سارے زیورات کی رسیدیں مانگ رہے

تھے۔اس نے اپنی نکاح کی تصویر دکھائی۔ایک میں وہ حاشر کے ساتھ بیٹھی تھی۔ایک میں پورے خاندان کے ساتھ۔اور ایک میں اکیلی۔۔وہ جیولر چند لمحے اسے پرسوچ نظروں سے دیکھتا رہا۔

"یہ لاکھوں کا زیور ہے۔ہمارے پاس ابھی اتنا کیش نہیں ہے۔"

"اتنی بڑی شاپ ہے اور کیش نہیں۔۔شاید آپ کو مجھ پر یقین نہیں آیا۔کوئی بات نہیں میں کہیں اور جا کر بیچ لوں گی۔"اس نے سارا زیور سمیٹ کر بیگ میں ڈالنا شروع کیا۔"رکیں میڈم۔ایسا کریں۔آدھا ابھی بیچ لیں۔آدھا بعد میں بیچ دیجیئے گا۔"

"میں آپکو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔میرے شوہر کا وہاں افریقہ میں ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔مجھے ان کے پاس لازمی جانا ہے۔میرے پاس کیش نہیں ہے۔وہاں شفٹنگ کرتے ہم کیش سارا استعمال کر چکے ہیں۔ہمیں تو یہ امید تھی ہمارا کاروبار وہاں چل نکلے گا۔نصیب کی بات اب جمع پونجی بھی بیچ کے کھانی پڑ رہی ہے۔یہ میری ساس کے خاندانی زیورات ہیں۔آپ چیک کر چکے ہیں۔یہ کوئی آج کل میں نہیں بنے ہوئے۔۔"مریم عالم اب میان سے نکلی تلوار بن چکی تھی۔جو بھی اسکے قریب آنے کی کوشش کرتا اپنا نقصان کرتا۔کوئی ایک رات میں بھی یوں تبدیل ہوتا ہے؟کوئی اور ہوتا یا نہ ہوتا مریم عالم تبدیل ہو چکی تھی۔اسے اب عزت دار زندگی گزارنی تھی۔اسکی بلا سے سب بھاڑ میں جائیں۔۔اور اس زندگی کے لیے اگر جھوٹ کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔تو بھی اسے شرمندگی نہیں تھی۔اگر لوگ سچ کو قبول کرنے والے ہوتے تو وہ بتا دیتی۔مگر ایک رات میں وہ عام لڑکی سے ایک سمجھدار عورت کا روپ دھار چکی تھی۔اور بے وقوف تو وہ بس چھپے دشمنوں کو پکڑنے کے معاملے تک تھی۔جو سامنے آ کر وار کر رہے تھے۔ان کے لیے تو وہ دو دھاری تلوار تھی۔دشمن سامنے دیکھ کر تو دماغ خوب چلتا تھا۔اور بچاؤ کا ہر ممکن رستہ سوچتی تھی۔

اور آج بھی اپنے بچاؤ کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔رونے کی بجائے خود کو پھر سے کھڑا کر رہی تھی۔اب وہ کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔اس دکان دار پر بھی نہیں کہ وہ باقی زیور بعد میں بیچنے آتی۔اور اس دوران وہ پولیس کو اسکے بارے میں بتا دیتا تو؟اور جب حاشر نے اسے طلاق بھیج دی تھی تو اب یقیناً اسکا نام بھی اس کیس میں پھر سے لکھا گیا ہوگا۔

اسے تو دراصل اس شہر میں بھی نہیں رہنا تھا۔پھر جیولر نے اللہ جانے اسکی باتوں پر اعتبار کیا تھا۔یا پرانا اچھا زیور دیکھ کر چپ رہا تھا۔مریم کو اب ایک نیا لیپ ٹاپ اور موبائل چاہیئے تھا۔۔یہ اسکی سب سے اہم ضرورتیں تھیں۔کیوں؟؟؟

کیونکہ اب یہی دو چیزیں ہی اسے یہاں سے نکلنے میں مدد دے سکتی تھیں۔جیولر کی شاپ سے نکل کر وہ ٹیکسی کر کے حفیظ سنٹر چلی آئی تھی۔یہ بھی ڈرائیور نے بتایا تھا کہ یہاں سے اچھا سامان ملے گا۔لیپ ٹاپ اور موبائل کی پیمنٹ کرتے اس نے بہت احتیاط سے پیسے نکالے تھے۔وہ اتنی زیادہ رقم تھی کہ کوئی بھی دیکھ کر آرام سے اسکا دشمن بن سکتا تھا۔بے احتیاطی کا مطلب دوسروں کا ایمان اور اپنی جان وعزت خطرے میں ڈالنا تھا۔انسان کو سکھانے کے لیے ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔ایک لمحہ ہی آپکی عقل پر پردے ہٹانے کو کافی ہوتا ہے۔پھر جو چوٹ آپ نے نہیں کھائی ہوتی آپ اس کے لیے بھی حساس ہو جاتے ہیں۔مریم نے ایک دھوکہ کھایا تھا۔وہ نہیں جانتی تھی کہ کس نے کیا تھا یہ سب۔وہ تو ہر ایک پر اعتبار کرتی تھی۔اور اب وہ سوائے اپنی ذات کے کسی انسان پر بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔

موبائل لینے کے بعد اسے سم چاہیئے تھی جو کہ یقیناً اسی کے آئی ڈی کارڈ سے رجسٹرڈ ہوتی۔اور اسکے بعد اگر وہ اسی سم کے ذریعے پکڑی جاتی تو؟اس سوچ کے آتے ہی وہ ڈر گئی تھی۔یہاں وہ کسے جانتی تھی کہ انکے نام کی سم نکلواتی۔اور جانتی بھی ہوتی تو کیا وہ ایسا کرتی؟نہیں۔نجانے وہ کیسا ہوتا؟اور اگر وہ کسی معاملے میں قانون کو مطلوب ہوتا تو۔

مریم ایک موبائل کمپنی کی فرنچائز کے اندر تو داخل ہو گئی تھی۔لیکن اب سوچ و بچار میں تھی کیا کرے۔پھر اسکی نظر دیوار پر گئی۔جہاں اس کمپنی کے سم پیکجز،اور وائی فائی ڈیوائس کے پیکجز کی مختلف کمرشلز لگے تھے۔اس نے خود کو ڈپٹا۔"مریم اب تو عقل کو تیز دوڑانا شروع کرو۔۔"پھر وہاں سے ایک وائی فائی ڈیوائس لیے باہر نکلی تھی۔

آپ کے لیے آسانیاں پیدا کرنے آسمان سے فرشتے نہیں اترتے۔بس اپنی عقل پر پڑے پردوں کو ہٹانے کی زحمت کرنی پڑتی ہے تو آپ خود اپنی ذات کے لیے آسانیاں کر لیتے ہیں۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ مغرب کی اذان کسی بھی وقت ہو سکتی تھی۔ اس سارے دن نے اسے بہت تھکا دیا تھا۔ اب اسے آرام کرنا تھا مگر کہاں؟ شہر انجان تھا۔ ہاسٹلز کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ کہاں تھے۔ کیسے تھے۔ کھانے کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ باہر نکل کر اس نے ایک بار پھر ٹیکسی کی تھی۔

" کسی ایسے بیوٹی پارلر میں لے جائیں جو بہت مشہور ہو اور جہاں ہر وقت رش رہتا ہو۔" ٹیکسی ڈرائیور نے باقاعدہ مڑ کر اسے دیکھا۔ عجیب عورت تھی جو کہہ رہی تھی کہ رش والے پارلر لے جاؤ۔ ورنہ عورتیں تو کہتی ہیں بس ہم ہی پہلی کسٹمر ہوں۔ کیونکہ پیچھے گڑیا، پپو روتے چھوڑ کے آتی تھیں۔ بڑا ہی سٹیمنا تھا اس خاتون میں تو۔

" کیا؟؟ لاہور میں ایک بھی اچھا بیوٹی پارلر نہیں ہے۔؟" مریم نے اسکے مڑنے پر بگڑے لہجے میں کہا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ " نہیں نہیں۔ بہت ہیں۔" پھر ٹیکسی چل پڑی تھی۔ ایک دو پارلر کے باہر ٹیکسی رکی۔ تو اس نے ڈرائیور سے کہا کہ پتہ کر کے آئے رش ہے کہ نہیں۔ اور جب وہ کہتا ہے کہ نہیں اتنا زیادہ نہیں ہے آدھے گھنٹے تک آپکی باری آجائے گی۔ وہ اسے پھر سے ٹیکسی چلانے کا کہہ دیتی۔ پھر ایک جگہ بہت رش تھا۔ بیک وقت چار پانچ دلہنوں کی اپائنٹ منٹ تھی شاید۔ ٹیکسی ڈرائیور مایوسی سے بتا رہا تھا۔

" وہ جی کہہ رہے ہیں کہ ہمارے پاس آج بالکل ٹائم نہیں ہے۔ تین گھنٹوں سے پہلے تو ایک منٹ بھی نہیں دے سکتی ہیں ان کی باجی۔۔"

مریم سن کر اتر آئی تھی۔ اسے مطلوبہ جگہ مل گئی تھی۔ کرایہ دیتے وہ اندر آگئی تھی۔ اتنی عورتیں تھیں کہ اگر وہ آرگنائزڈ نہ ہوتا تو باہر ابل پڑتیں۔ مریم نے ریسپشن پر اپنے فیشل کے لیے کہا تو لڑکی نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ کسٹمرز کو نا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

" میڈم آج بہت رش ہے۔ یہ جو سامنے دو دلہنیں نظر آرہی ہیں۔ صرف یہ نہیں ان دونوں کا پورا خاندان نہیں تیار ہوگا۔ آپکی باری تو رات گیارہ بجے تک آئے شاید۔۔" وہ بے چاری اسے ڈائریکٹ نہیں کہہ پا رہی تھی کہ بیٹھنے کو جگہ نہیں ہے۔ آپ چلی جائیں۔" کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے آپکی میڈم سے ہی فیشل کرانا ہے۔ بہت تعریفیں سنی ہیں انکی۔" مریم اطمینان سے بولی۔ اچھا آپ ادھر اس طرف بیٹھ جائیں۔ جیسے ہی کوئی

لڑکی فارغ ہوتی ہے میں آپکو بلا لونگی۔"

"نہیں مجھے کسی اور لڑکی سے نہیں بس آپکی میڈم سے ہی فیشل کرانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔آپ ادھر بیٹھ جائیں۔" مریم ایک جانب رکھے صوفے پر آبیٹھی۔وہاں آئینوں کے آگے رکھی کرسیاں پُر تھیں۔کہیں میک اپ ہورہا تھا کہیں ہیئر اسٹائلنگ۔۔اور کچھ لڑکیوں کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔اور فراغت کو دور کرنے کو ہاتھوں میں پکڑے موبائلوں میں مصروف تھیں۔ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے جملے بازیاں چل رہی تھیں۔ہنسی اور قہقہوں کی آواز تھی۔

مریم نے ان سے نگاہ ہٹا کر اپنے ہاتھ میں پکڑا ایک شاپنگ بیگ کھولا۔اور لیپ ٹاپ باہر نکالا۔اسے سکون سے لیپ ٹاپ استعمال کرنا تھا۔اس لیے اسے رش والی جگہ چاہیئے تھی۔ایسی رش والی جہاں ہر کوئی اپنی میں پڑا ہو،اسکی جاسوسیاں نہ کرے۔اور خواتین کے بیوٹی سیلون سے بڑھ کر دنیا میں ایسی کونسی جگہ ہوسکتی ہے۔وہاں بیٹھی ہر خاتون کا مسئلہ بس اپنے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔

موبائل فرنچائز مردانہ جگہ تھی اس لیے وہ وہاں سے نکل آئی تھی۔لیپ ٹاپ کی ونڈو رجسٹرڈ تھی۔چند لمحوں بعد اس کے ساتھ وائی فائی ڈیوائس اٹیچ کیا تھا۔انسٹالیشن کے بعد وہ نیٹ براؤزر کھول رہی تھی۔اب ہر وقت وہ نیٹ کے لیے دوسروں سے موبائل نہیں مانگ سکتی تھی۔اور نہ کوئی پانچ منٹ سے زیادہ صبر کر سکتا تھا۔اور لاہور میں اپنے کام کے لیے وہ زیادہ پھر بھی نہیں سکتی تھی۔ایک تو زخم۔۔دوسرا پکڑ ےجانے کا ڈر بھی تھا۔اسکا کام لمبا تھا۔وہ لاہور کے مختلف پرائیویٹ ہاسٹلز کو سرچ کر رہی تھی۔پھر موبائل آن کر کے اسکے نوٹس میں ساری معلومات لکھتی رہی۔

وہاں کسی نے بھی کونے میں بیٹھی اس لڑکی پر توجہ نہیں کی تھی۔کوئی اپنے بالوں کے لیے پریشان تھی۔کوئی لپ اسٹک کے شیڈ کے لیے بول رہی تھی۔کوئی اپنے میک اپ کے لیے لڑکی کو بلاتے ہوئے جھنجھلاہٹ کا شکار تھی۔سب کے اپنے مسئلے تھے۔

مریم نے پانچ چھ ہاسٹلز کا پتہ لکھ لیا تھا۔اب وہ کل ہی وہاں جاسکتی تھی۔اس وقت رات ہوچکی تھی۔اسے اب کہیں رات گزارنی تھی۔ہوٹل؟؟اس سوچ کو تو وہ پہلے رد کر چکی تھی۔لیکن اب آخری آپشن یہی تھا۔اس نے

اچھی ہوٹلز کو سرچ کیا۔ پھر ایک جگہ بکنگ کرا لی تھی۔ وہ ایک گھنٹے میں فارغ ہو چکی تھی۔ سیلون میں ویسے ہی رش تھا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "رش کم نہیں ہو رہا۔ مجھے اب جانا ہے میں کل آ جاؤنگی۔" وہ ریسپشنسٹ کو مطلع کرتی باہر نکلی۔ پیچھے وہ کہتی رہ گئی۔ اب بس تھوڑا سا ٹائم بچا ہے۔ مریم ان سنا کیے آ گئی تھی۔ پھر ٹیکسی کر کے اپنے ہوٹل آ گئی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر سکھ کا سانس لیا تھا۔ مشکل ترین دن تھا۔

اسکی سائیڈ میں پھر سے درد ہو رہا تھا۔ اس نے کھانا روم میں منگوا لیا تھا۔ پھر درد کی وجہ سے اس سے ٹھیک طرح سے کھایا نہیں گیا تھا۔ زخم کی ڈریسنگ کر کے وہ بستر میں گھس گئی تھی۔ اتنی تھکن کے باوجود بھی نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تکیے پر سر رکھتے ہی اس کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ اسے سب یاد آ رہا تھا۔ اسے اپنی بہادری پر رونا آ رہا تھا۔ اسے ہر بات پر رونا آ رہا تھا۔ امی، ابو کے آنسو یاد آ رہے تھے۔ علی۔۔ اسکا پیارا بھائی۔۔ لیکن اسے زخم دینے والا۔ اسکا ہاتھ اپنے زخم تک گیا۔ نجانے کب روتے روتے اسکی آنکھ لگی تھی۔

☆......☆......☆

اگلی صبح وہ سب ہاسٹلز میں جا کر چیک کر رہی تھی۔ اکیلا روم نہیں مل رہا تھا۔ اب اسے کسی کے ساتھ نہیں رہنا تھا۔ ذرا سے پیسے زیادہ لگتے لیکن انسانوں میں چھپے سانپوں سے بچ جاتی۔ صبح سے شام ہو گئی تھی۔ وہ تھک چکی تھی۔ پھر آخری ہاسٹل میں ایک کمرہ مل گیا تھا۔ یہاں مہینے کا کرایہ اسکی فائیو سٹار ہوٹل کی ایک رات کے برابر تھا۔

جب تک اسکے پاس کمانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا تب تک وہ ان پیسوں کو نہیں اڑا سکتی تھی۔ وہ چاہتی تو پورا مہینہ اس فائیو سٹار ہوٹل میں رہ لیتی مگر اسکے بعد کیا؟ ایک ذلالت والی زندگی ہوتی۔ پیسے کے بغیر زندگی بہت بری ہوتی ہے۔ بہت مشکل۔ اسے اس پیسے کی حفاظت کرنی تھی۔ اپنی ذات کی طرح۔ اسی سوچ کی وجہ سے وہ ہاسٹل کے لیے صبح سے خوار ہو رہی تھی۔

ہاسٹل میں سب طے کر کے وہ ہوٹل واپس آ گئی تھی۔ کل سے اس نے ہاسٹل میں جا کر رہنا تھا۔ وہاں وہ کسی لڑکی سے بات نہیں کرتی تھی۔ اسے کرنی بھی نہیں تھی۔ اسکے ساتھ والے رومز کی لڑکیوں نے پہلے کچھ دن اسکے ساتھ بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے لیے دیے رویے پر پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ "بہت مغرور ہے۔۔ نک

چڑھی۔۔"

"بات کرنے کی تمیز ہی نہیں ہے۔۔"

"بہت بداخلاق لڑکی ہے۔۔" سب کی اپنی رائے تھی۔" صحیح کہا۔۔آنٹی (وارڈن) کہہ رہی تھیں کہ اس نے کہا میں جب تک ہوں روم کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرونگی۔خوش اخلاق ہوتی تو یوں بدمزاجی نہ دکھاتی۔"

ہر شخص دوسرے کے عمل کو اپنے نظریے سے دیکھتا ہے۔اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ جو وہ دوسرے کے بارے میں رائے دے رہا ہے وہ سچ مانی جائے۔اسکا کہا معتبر ہو۔کیوں؟؟ ہم لوگ اپنے زعم میں یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہر شخص کی زندگی کی کہانی مختلف ہوتی ہے۔اسکے اچھے برے رویے کے پیچھے کیا وجہ ہوسکتی ہے۔اور اگر کہانی معلوم بھی ہو جائے تو لوگ اسکے لیے کئی جواز دے دیتے ہیں۔

لو ایسا تو نہیں ہوتا اچھا تم ایسا کر لیتی۔اچھا تم ویسا کر لیتی۔ویسے ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔مجھے تو یہ بات جھوٹ لگتی ہے۔۔ایسی ہی بہت سی مختلف آراء ہم لوگ کتنی آسانی سے دے دیتے ہیں۔مسئلہ پتہ ہے کہاں ہوتا ہے۔مسئلہ ہمارے دماغ کیساتھ ہوتا ہے۔اگر آپکے اردگرد یہ سب نہیں ہوتا تو مطلب دنیا میں کہیں نہیں ہوتا؟ ایسے لوگوں کو اپنے دماغ کا کینوس وسیع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔کہ جو ان کے ہاں نہیں ہوتا وہ تب بھی ان کے لیے قابل قبول ہو کہ ایسا کسی اور کے " کہیں " والے کینوس میں ہو رہا ہوتا ہے۔آپ کو نگاہ میں وسعت لانی ہوتی ہے۔پھر یقین کریں کسی شخص سے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ہر شخص قابل قبول لگتا ہے۔ہر انسان اچھا لگتا ہے۔ہر انسان قابل عزت لگتا ہے۔

مریم کو ان میں سے کسی کی رائے کی بھی ذرا برابر پروا نہیں تھی۔جن خونی رشتوں کے ساتھ ساری عمر رہی تھی۔ہر وقت اچھا کہنے والے برے وقت میں برا کہہ کر ساتھ چھوڑ گئے تھے۔اسکی بلا سے اب سب بھاڑ میں جاتے۔اسے پرواہ نہیں تھی۔اسے بداخلاق یا بدزبان کہا جاتا۔لوگ ایک دو بار اچھا بولنے پر خوش اخلاق کہتے ہیں،پھر اگر کبھی تندی سے بات کر لی جائے تو ساری زندگی کا اخلاق دھرا رہ جاتا ہے اور لوگ یہی یاد رکھتے ہیں کہ آپ نے ان سے برے طریقے سے بات کی ہے۔آپکی ایک غلطی پھر سے آپ کو اسی مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔تو وہ ایسے لوگوں کی نظروں میں اچھا بننے کے لیے اپنی انرجی ضائع کرتی۔اگر اب بھی ایسا ہی کرتی تو پھر

مریم عالم پر افسوس ہی کیا جا سکتا تھا۔

وہ سارا دن کمرے میں بیٹھ کر مختلف ٹریولنگ ویب سائٹس کو چیک کرتی رہتی۔

جی ہاں اسے پاکستان میں نہیں رہنا تھا۔گھر والے اسے ڈھونڈے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔اور کیا پتہ پولیس بھی اسکے پیچھے ہو۔وہ اسی وجہ سے جب سے ہاسٹل آئی تھی باہر نہیں نکلی تھی۔

بھلے اسکے پاس جتنے پیسے تھے لیکن اسے کسی ملک کا مستقل ویزہ نہیں چاہیئے تھا۔ایک تو یہ لمبا پراسز ہوتا اور آگے پتہ نہیں وہ ملک رہنے قابل نکلتا بھی کہ نہیں۔اسے جہاں بھی جانا تھا۔بطور سیاح جانا تھا۔یورپین کنٹریز کے ویزہ پروسز تو تھکا دینے والے لگتے تھے۔

(Fiji)فجی کے پیکجز زیادہ پسند آئے تھے۔فجی آئی لینڈ دنیا کے جیسے آخری کونے پر واقع ہے۔آسٹریلیا سے بھی پرے۔۔مریم کا پاسپورٹ ابو نے عمرے پر جانے کے لیے پچھلے سال بنوایا تھا۔پھر صرف امی،ابو اور علی گئے تھے۔مریم اپنی پڑھائی کی وجہ سے نہیں گئی تھی۔پاسپورٹ دیکھتے اسے وہ دن یاد آیا جب وہ سب پاسپورٹ آفس بیٹھے ہوئے تھے۔علی کی چھیڑ چھاڑ جاری تھی۔

"سنو چڑیل دوپٹہ اچھی طرح سے سیٹ کر لینا۔اگر تمہارے چڑیلوں والے بال نظر آ گئے،تو یہ بہت سے گھرانوں کے چراغ ڈر کے مارے بجھ جائیں گے۔"اس نے اسے چڑانے کورش کی طرف اشارہ کیا۔

"افسوس کے تم سات پردوں میں بھی بندر ہی لگتے ہو۔"مریم تڑپ اٹھی تھی۔اسکے بالوں کا دشمن اسکا بھائی۔وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتی رہی۔"بندر والی بات امی کو بتا دی تو تمہاری کیا عزت رہ جائے گی۔چہ چہ۔۔" علی کا اچھا ٹائم پاس ہو رہا تھا۔

"اور چڑیل والی بات میں ابو کو بتا دوں تو کیا نہ ہوگا،جو ابو آپکی عزت افزائی میں پیش کریں گے۔ایکس توپوں کو تو رہنے دو۔۔" وہ بھی اسی کی بہن تھی۔"میری اچھی بہن مریم۔۔بس بال چڑیلوں کی مانند،ورنہ چاند کا ادھا ٹوٹا(ٹکڑا)ہو۔۔"علی نے دانت پیسے تھے۔

مریم کے ہونٹ مسکرا اٹھے تھے۔آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔جو بالآخر گالوں پر رواں ہو گئی تھی۔"خوبصورت وقت کیوں جلدی گزر جاتا ہے۔۔"

اس نے دائیں ہاتھ سے گالوں کو صاف کیا۔پھر پاسپورٹ کی ایکسپائر ڈیٹ دیکھ کر فائل میں رکھ دیا تھا۔ابھی بہت ٹائم تھا اسکے ایکسپائر ہونے میں۔وہ آرام سے سفر کرسکتی تھی۔اس نے فجی کے پندرہ دن کے ٹور کو سلیکٹ کیا تھا۔وہ سب سے سستا پیکج لے رہی تھی۔یعنی ہوٹل اور ایئرپورٹ آنے جانے تک کے لیے ٹرانسپورٹ تھی۔باقی ٹور اس نے اپنی مرضی سے کرنا تھا۔وہ جہاں مرضی گھومتی۔جیب کے حساب سے کھانا پینا اور شاپنگ کرتی۔وہ ایک ٹریول کمپنی کو اپنے ڈاکومنٹس سینڈ کر چکی تھی۔

لاہور سے اس نے اپنی ضروریات کی تھوڑی سی شاپنگ کی تھی۔ایک دو نئے سوٹ اور جوتوں کے جوڑے لیے تھے۔وہ ہاسٹل اسکے پرانے ہاسٹل کی نسبت بہت چھوٹا تھا۔اور اس میں لان بھی نہیں تھا۔بس ایک عمارت تھی۔جس کا چھوٹا سا صحن تھا۔باقی سارے حصے پر بلڈنگ تھی۔وہ بس اتنا باہر نکلتی تھی کہ اپنا کھانا لے کے کمرے میں آجاتی تھی۔اکثر کمرے کا دروازہ بند رکھتی تھی۔جب کبھی اس کمرے میں پڑے دم گھٹتا تھا تو دروازہ کھول دیتی تھی۔اس کے کمرے میں کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی۔تو گھٹن سے اسکی سانسیں تنگ پڑنے لگتی تھیں۔

ویزٹ کے لیے ساری ضروریات پوری کرنے کے بعد بالآخر اسکا ویزٹ ویزہ آچکا تھا۔اس سارے عمل میں ایک سے ڈیڑھ ماہ لگا تھا۔مریم نے بہت صبر سے اس وقت کا انتظار کیا تھا۔آج اسکی لاہور سے فلائٹ تھی۔ظاہری بات ہے اسکی منزل دنیا کا آخری حصہ تھا،تو ایک ہی فلائٹ سے جانا مشکل تھا۔عموماً فجی کی فلائٹس کے دو سٹاپ ہوتے ہیں۔مریم نے بھی دو کنیکٹنگ فلائٹس پکڑنی تھیں۔ایئرپورٹ پر بورڈنگ کے وقت اسکا دل ڈوب رہا تھا۔کہیں وہ پکڑی نہ جائے۔کہیں اسکا نام ملک کے سنگین مجرموں میں تو شامل نہیں ہے۔ڈر ضرور تھا مگر اسے یہ رسک لینا تھا۔کیونکہ یہاں بھی کچھ نہیں رکھا تھا اس کے لیے۔خدا خدا کر کے وہ بورڈنگ کروا کے آگے چلی گئی تھی۔

اسے اپنی سرزمین چھوڑنے کا دکھ ہو رہا تھا مگر اتنا نہیں کہ وہ روتی رہتی۔وہ آنے والے وقت سے اچھی امیدیں لگائے بیٹھی تھی۔اس لیے چپ تھی۔اور اس ساڑھے اٹھارہ گھنٹے کی فلائٹ نے اسکی حالت خراب کر دی تھی۔وہ ایک لمحے کو بھی نہیں سوئی تھی۔پتہ نہیں وہ کونسے عظیم لوگ ہوتے ہیں جنہیں فلائٹس کے دوران نیند آجاتی ہے اور ان سے کھانا بھی کھایا جاتا ہے۔اس نے اپنی کنیکٹنگ فلائٹس کے دوران بھاگتے ہوئے ہی کھانا کھایا

تھا۔ کیونکہ ان میں بھی زیادہ وقفہ نہیں تھا۔فجی اور لاہور کے وقت میں سات گھنٹوں کا فرق ہے۔تو وہ ایک دن آگے آ گئی تھی۔

نادی انٹرنیشنل ایئرپرٹ پر جب اسکی فلائیٹ نے لینڈ کیا تو وہاں ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ مریم کھڑکی سے سر ٹکائے شیشے کے پار نظر آتے منظر دیکھ رہی تھی۔ بارش کے قطرے تیزی سے شیشے پر پھسل رہے تھے۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ ایک وسیع لینڈ سکیپ۔ اور اسکے پار بے انت سمندر۔۔ وہ بہت تھک چکی تھی لیکن پھر بھی اس منظر کو سراہے بنا نہیں رہ سکی تھی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ اسے پاکستان یاد آیا ابھی وہ اس تاریخ تک پہنچنے کو ایک گھنٹہ پیچھے تھا۔

ایئرپورٹ سے باہر نکل کر اسے احساس ہوا کہ موسم بہت سرد تھا۔ جب کہ وہ پاکستانی موسم کے حساب سے لان کا سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس نے کب سوچا تھا کا دنیا میں ایسا ملک بھی ہو سکتا ہے جہاں جولائی میں سردی پڑتی ہو۔ فجی کے لیے اس لیے اپلائی کیا تھا کہ ایک تو سستا پیکج تھا دوسرا بہت دور تھا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ وہ وہاں ہو سکتی ہے؟ مگر اس نے وہاں کے موسم کو سرچ نہیں کیا تھا۔

اس کے ایجنٹ کی طرف سے بھیجا ڈرائیور اسے لینے آ چکا تھا۔ اسے ہوٹل چھوڑ کر وہ ڈرائیور چلا گیا تھا۔ مریم نے سرسری نگاہ میں کمرے کا جائزہ لیا۔ درمیانے سے ہوٹل کا ایک درمیانے سائز کا کمرہ تھا۔ اب سستے پیکج میں اتنا ہی مل سکتا تھا۔ تھری سٹار ہوٹل ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ ایک سنگل بیڈ۔ جس پر سفید چادر بچھی تھی۔ بیڈ کی سائیڈ دراز پر ایک جانب لیمپ رکھا تھا اور دوسری جانب فون کنکشن تھا۔ لیمپ والی سائیڈ سے بیڈ سے تھوڑے سے فاصلے پر دو کرسیاں رکھی تھیں۔ اور ان کے درمیان چھوٹی سی میز تھی۔ جس پر رکھے گلدان میں تازہ پھول سجے تھے۔ جو آتشی گلابی رنگ کے تھے۔ اسے پھولوں میں بس چند مشہور پھولوں کا پتہ تھا۔ ان کا نام نجانے کیا تھا۔ مریم نے بیگ سے کپڑے نکال کر ایک جانب بنی چھوٹی سی الماری میں لٹکائے۔ مجموعاً وہ ایک سادہ اور خوبصورت کمرہ تھا۔

اس کمرے میں جو سب سے اچھی چیز تھی وہ یہ کہ اسکے بیڈ کے بالکل سامنے والی دیوار شیشے کی تھی۔ مریم نے آگے بڑھ کر اسکے ادھ کھلے پردوں کو مکمل طور پر ایک طرف کر دیا۔

"اوہ۔۔" سامنے بہت خوبصورت منظر تھا۔ ہوٹل کا سوئمنگ پول اسکے سامنے تھا۔اور اس سے پرے ہوٹل کا سبزہ زار۔ یہ تھری سٹار ہوٹل بھی اس ویو سے فائیو سٹار لگ رہا تھا۔مریم نے پردے برابر کر دیے تھے۔اسے سونا تھا وہ تھکن سے اب مرنے کو تھی۔

☆......☆......☆

اگلی صبح ناشتے کے بعد اس نے سب سے پہلے کرنسی تبدیل کروائی تھی۔آتے ہوئے وہ آدھے پیسوں کو امریکن ڈالر میں کنورٹ کروا چکی تھی۔اب بچے ہوئے پیسے فجین ڈالر میں لیے تھے۔اسکے بعد وہ شاپنگ کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

اتنی سردی تھی کہ اسے لگ رہا تھا اسکی قلفی جم جائے گی۔اس نے دوپٹے کو سکارف کی طرح ڈبل کر کے لے لیا تھا۔وہاں بہت سے ملکوں کے ٹورسٹ آئے ہوئے تھے لیکن شاید وہ واحد پاکستانی تھی۔اسے بھیڑ میں کوئی بھی اپنا چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔چلو اچھا تھا وہ اپنے ملک کے لوگوں سے ویسے بھی دور رہنا چاہتی تھی۔لوگ اسکے لباس کی وجہ سے اسے ٹھٹک کر ضرور دیکھتے تھے۔

مریم نے ایک گرم کوٹ اور کیپ لی تھی۔وہاں سردی تو اچھی طرح سے پوچھ رہی تھی۔اسے اس شہر میں گھومنے کا کوئی شوق نہیں تھا بس اسے کمانے کو کوئی نوکری مل جاتی تو زندگی آسان تھی۔

مگر نوکری ملنا کوئی اتنا بھی آسان کام نہیں تھا کہ اسے ایک ہی دن میں مل جاتی۔وہ روز نیٹ پر بیٹھ کر نوکریاں دیکھتی رہتی مگر وہ لوکل لوگوں کے لیے ہوتی تھیں۔وہ چھوٹا سا ملک تھا۔ایک دنیا سے الگ۔۔وہ اپنے لوگوں کو موقع نہ دیتا تو کسے دیتا۔

مریم ڈھیروں نوکریاں دیکھتی تھی مگر اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔کہاں اپلائی کرے۔دن پر دن گزر رہے تھے۔اسکا ٹرپ ختم ہو جانا تھا اس سے پہلے اسے کوئی ایسی جاب ڈھونڈنی تھی جہاں ویزہ بھی وہ خود دیتے۔

آج ساتواں دن تھا۔وہ لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھ کر تھک چکی تھی۔کوٹ لے کر وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔سردی اتنی تھی کہ حد نہیں۔وہ گرم گرم سوپ پینے کو ہوٹل کے ڈائننگ روم میں آ گئی تھی۔دن کا

وقت تھا۔اکثر سیاح اس وقت گھومنے پھرنے میں لگے ہوتے تھے۔اس لیے ہال میں اکا دکا لوگ نظر آرہے تھے۔

وہ ایک ستون کے قریب والی ٹیبل کے گرد جا بیٹھی۔ہال کی دیواروں پر لگی بڑی بڑی کھڑکیوں سے باہر کا منظر نظر آرہا تھا۔بادلوں نے آسمان کو گھیرا ہوا تھا۔وہ ایک ہاتھ گال کے نیچے رکھے کہنی ٹیبل سے ٹکائے کھڑکی کے اس پار دیکھنے لگی۔وہ کس قدر خود کو مصروف رکھنے کے جتن کر رہی تھی۔کچھ بھی یاد نہ آئے۔لیکن بس تب تک یاد نہیں رہتا تھا جب تک وہ سوئی رہتی تھی۔سوتے ہوئے آخری خیال انہی ستمگر لوگوں کا ہوتا اور صبح اٹھتے ہی پہلا خیال بھی انہی کا ہوتا۔آنسو اب نہیں نکلتے تھے۔مگر یہ اداسی بھی جان نہیں چھوڑ رہی تھی۔

اس لیے آج اس نے نادی شہر گھومنے کا سوچا تھا۔بس جو ہونا تھا ہو گیا تھا۔اب نئی زندگی کی شروعات کرنی چاہیئے تھی۔رونے کے لیے لاہور میں گزرے دن کافی تھے۔

ویٹر اس سے آرڈر لے کر جا چکا تھا۔وہ کھڑکی کے پار دیکھتی رہی۔ہلکی سی کن من ہونے لگی تھی۔بارش کے قطرے شیشوں سے ٹکرا کر لکیریں بنا کر نیچے کی جانب سفر کرنے لگتے تھے۔اسکے ساتھ والی ٹیبل پر ایک کپل آکر بیٹھا تھا۔اسکے منظر کے درمیان اب وہ لوگ آ گئے تھے۔وہ بدمزہ ہوئی اور ان لوگوں کو گھورنا چاہا۔وہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مگن تھے۔لڑکی تیز تیز بول رہی تھی اور لڑکا کبھی اسکے بالوں کی لٹ پیچھے کرنے لگتا۔کبھی اس کے گال پر ہاتھ رکھ دیتا۔پتہ نہیں محبت نامی جذبہ لوگوں کو اتنا بے وقوف کیوں بنائے رکھتا ہے جب کہ اس نے کرنا خوار ہوتا ہے۔

مریم نے بے زاری سے نگاہ پھیرنی چاہی۔

تبھی اسکی نگاہ ان دونوں کے ہاتھوں پر پڑی۔اس لڑکے نے گرم جوشی سے لڑکی کے ہاتھ کو پکڑا ہوا تھا۔بالکل ویسے ہی جیسے حاشر اسکا ہاتھ پکڑا کرتا تھا۔مریم کا سانس وہیں اٹک گیا تھا۔

ہزاروں مشغلے ہیں جو مجھے مصروف رکھتے ہیں
مگر محسن وہ ایسا ہے کہ پھر بھی یاد آتا ہے

"حاشر۔۔" اسے اپنا پہلا ڈنر یاد آیا تھا۔اس نے لرزتے ہاتھوں کو ٹیبل پر رکھ کر اٹھنا چاہا۔اور ہمت کر

کے کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔اسکے بیٹھنے کو کوئی جگہ نہیں تھی۔سوائے اسکے کمرے کے۔۔

اسے اب تک یقین نہیں آتا تھا کہ اسے حاشر نے طلاق دے دی تھی۔آتا بھی تو کیسے۔۔وہ جسطرح محبت سے اس چہرے کو تکتا رہتا تھا۔اس نے سوچا اب وہ کیسے جی رہا ہوگا اسکے بغیر۔۔اس احساس کے ساتھ کہ مریم اسکی بیوی نہیں ہے۔کیا واقعی اسکے لیے آسان تھا اسے چھوڑنا۔۔اسے احساس بھی نہیں ہوا،اسکے آنسو گالوں تک آ چکے تھے۔وہ سر جھکائے چھوٹے چھوٹےقدم اٹھاتی ٹیبلز کے درمیان سے گزر رہی تھی۔"میم آپکا آرڈر۔۔"ویٹر نے پیچھے سے پکارا۔اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔"جی۔۔"

"میم آپ ٹھیک ہیں؟"ویٹر نے اسکے بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر پوچھا۔"ہاں۔سردی لگ رہی تھی اس لیے رو رہی تھی۔"مریم نے اسکے ہاتھ سے اپنا آرڈر لیا۔

"جی۔۔۔؟؟؟"ویٹر کو جھٹکا لگا تھا۔عجیب خاتون تھی جو سردی کی وجہ سے رو رہی تھی۔

"اوکے۔"وہ سمجھ کر سر ہلاتا مڑ گیا تھا۔مریم نے اس سوپ کو آنسوؤں کے ساتھ پیا تھا۔"میر حاشر اچھا نہیں کیا۔تم سے یہ امید ہی کب کی تھی کہ مجھے چھوڑ دگے۔۔آہ۔۔میرا دل پھٹتا ہے۔۔جب یاد آتا ہے۔تم بھی نہیں رہے میرے پاس۔۔کوئی بھی نہیں ہے۔۔امی بھی نہیں ہیں۔۔ابو۔۔علی۔۔سب نے چھوڑ دیا۔۔۔لیکن تم میر حاشر یہ نہ سمجھنا۔۔۔تمہارے عشق میں بیٹھی رہونگی۔۔تم دیکھنا۔تم سب دیکھنا میں اپنی زندگی جیوں گی۔۔بہت اچھے سے جیوں گی۔۔تم لوگوں کے دیے دکھوں پر ساری زندگی بیٹھ کر نہیں روؤں گی۔۔"وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ سوچے جا رہی تھی۔جلتے دل کو کسی طور قرار نہیں تھا۔بہادری سب ایک طرف۔۔

اندر کے دکھ کا کوئی علاج نہیں تھا۔اور اگر تھا تو اس میں ابھی وقت لگنا تھا۔

☆......☆......☆

اسکا ٹرپ ختم ہونے میں دو دن بچے تھے۔اور وہ جو یہ سوچ کر آئی تھی کہ کچھ نا کچھ کر ہی لوں گی وہاں جا کے۔۔اب نوکری نہ ملتی تو آپشن پاکستان تھا۔پاکستانی روپوں تک تو ٹھیک تھا لیکن جب وہ ڈالر میں کنورٹ ہوئے تھے تو وہ اتنے نہیں تھے کہ وہ انہیں زیادہ عرصہ خرچ کر سکتی۔اس نے کبھی جاب نہیں کی تھی اس لیے اسے

پتہ بھی نہیں تھا کہ جاب کے لیے کوششیں کیسے کی جاتی ہیں۔
اور جو اصل بات تھی اسے اندر سے یہ خوف تھا کہ اگر وہ کسی اچھی پوسٹ پر جائے گی۔اور اسکے ملک کے لوگوں کو اسکی تلاش ہوئی تو وہ اسے آسانی سے ڈھونڈ لیں گے۔۔۔وہ گمنام نوکری چاہتی تھی۔ضروریات زندگی بھی پوری ہو جاتیں اور کوئی خوف کی تلوار بھی سر پر نہ ہوتی۔آج ایک بار میں انٹرویو دینے گئی تھی۔
'اڈز بار' نامی اس کلب کا مالک بار بار اسکا حیرت سے جائزہ لیتا۔" تم واقعی یہاں نوکری کرنا چاہتی ہو؟"
"جی۔۔"
" دیکھو یہاں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔اور پھر ہمارے ڈی جے اور بارٹینڈر اپنے کام کے ماہر ہیں۔تم دونوں کاموں میں زیرو لگتی ہو۔اور اس حلیے میں یہاں آؤ گی؟"
" کیا ہے میرے حلیے کو۔۔" مریم نے برا مان کر خود پر نگاہ ڈالی۔" ہمارا یونیفارم ہے۔وہ یوز کرنا ہوگا۔اور میرے پاس اس وقت ویٹرس کی نوکری ہے۔کرنا چاہو تو کل سے آجاؤ۔" وہ دانتوں کے درمیان ایک تیلی دبائے اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔مریم کا دل چاہا ایک گھونسہ دے مارے اسے۔خبیث گھورے ہی جا رہا تھا۔پھر اسکی آفر کو خود رد کرتے وہ باہر آ گئی تھی۔
ٹھیک ہے زندگی مشکل تھی لیکن وہ ویٹرس نہیں بن سکتی تھی۔انسان کی اپنی نظر میں بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔کوئی پوچھتا کہ بارٹینڈر اور ڈی جے کیا چیف ایگزیکٹو ہوتے ہیں؟۔
وہ مایوس ہو چکی تھی۔چلتے چلتے نجانے کہاں نکل آئی تھی۔چونک کر دیکھا تو ایک پارک سے گزر رہی تھی۔اس سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک بنچ پڑی تھی۔وہ چند قدم چل کر اس تک جا پہنچی اور بیٹھ گئی۔یہ ایک وسیع پارک لگ رہا تھا۔نجانے کیا نام تھا آتے ہوئے دیکھا بھی نہیں تھا۔اسکے سامنے خوبصورت گھاس ایک کارپٹ کی مانند بچھا نظر آ رہا تھا۔اور سامنے کی روش کے اطراف کچھ فاصلے پر درخت لگے تھے۔جو بہت گھنے نہیں تھے۔اس لیے سامنے کا حصہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔دس منٹ گزرے تھے کہ اسکے ساتھ ایک لڑکی آ بیٹھی۔بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔پھر مریم کی طرف متوجہ ہوئی۔" تم کون ہو کہاں سے آئی ہو۔" مریم کا دل چاہا اسے اگنور کرے۔لیکن دل بھرا ہوا تھا۔وہ لڑکی پہلے

اس سے فچین زبان میں پوچھ رہی تھی۔ پھر بات کو انگلش میں دہرایا تھا۔

"مریم۔۔پاکستان۔" وہ مختصر بولی۔ "میں کرسٹینا۔۔یہیں کی ہوں۔اوہ۔۔میرا باس اتنا زیادہ کام لیتا ہے کہ بندہ مرنے سے ذرا ،ادھر ہو تب چھوڑتا ہے۔سارا دن بوتلیں اٹھا اٹھا کے میرے ہاتھ شل ہو جاتے ہیں۔بازوں میں طاقت نہیں ہوتی کہ چمچ پکڑ کر کھانا کھا سکوں۔کمینہ۔۔" اسکے بعد وہ گالیاں دینے لگی۔مریم نے لب بھینچ لیے۔اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ لڑکیاں بھی اتنی فضول گالیاں دیتی ہیں۔

" کیا کام کرتی ہو اور کہاں؟" مریم نے پوچھ کر اسکی گالیوں کو بریک لگوائی۔"منرل واٹر کی فیکٹری میں۔روزانہ اتنی بوتلیں اٹھانی پڑتی ہیں۔۔میں کہتی ہوں کہ کوئی نئی لڑکی رکھ لیں۔لیکن جو بھی آتی ہے چند ماہ میں چھوڑ جاتی ہے۔۔"

" کیوں؟" مریم کو کوئی تجسس نہیں تھا لیکن بات تو کرنی تھی کوئی۔اس کا دل بھرا ہوا تھا۔بلاوجہ سہی۔۔کسی سے تو بات کرتی۔

" کیونکہ تنخواہ کم دیتا ہے وہ کمینہ،اور کام زیادہ کرواتا ہے۔سب چھوڑ جاتی ہیں۔"

" تم بھی چھوڑ جاؤ۔۔" اب کے مریم نے بےزاری سے اسے دیکھا۔بدتمیز لڑکی تھی ہر دوسری بات میں گالی نکال کر بات کر رہی تھی۔

" مجھے ان سب سے زیادہ دیتا ہے نہیں چھوڑ سکتی۔۔پھر اور کہاں جاب کرونگی کوئی تجربہ بھی نہیں ہے۔۔"

" تجربہ تو کسی بھی چیز کا نہیں ہوتا۔ ہر کام کرنے سے آتا ہے۔اور پھر جا کر وہ آپکے تجربے میں شامل ہوتا ہے۔"

" تم عقل مند لگتی ہو۔۔سنو تم میری فیکٹری میں جاب کرلو۔" مریم نے حیرت سے اسے دیکھا۔" جی۔۔"

" کیا نہیں کرنی۔۔تمہیں دیکھ کر لگا کہ شاید تم جاب نہ ملنے پر اداس ہو۔اچھی پے دلواؤں گی۔"

"اچھا اور رہائش؟ اور ویزہ کمپنی کا ہوگا؟" مریم نے اب کی بار دلچسپی دکھائی تھی۔

کچھ لوگوں کے ساتھ زندگی جو بھی کر لے۔زخم دو دن پرانا ہونے پر پھر سے بھول کر پرانی روش پر آنے لگتے ہیں۔ایک بار پھر سے وہ پرانی غلطی دہرانے جا رہی تھی۔انجان پر اعتبار کرنے کی۔لیکن اس وقت اسے احساس

نہیں تھا کہ وہ غلطی کر رہی ہے۔

"ہاں رہائش مفت اور ویزہ ہماری طرف سے۔۔"

"میں یہاں ٹور پر آئی ہوں۔ دو دن بعد ختم ہونے والا ہے۔ جہاں تک میں جانتی ہوں ویزہ لگنے میں ایک دو ماہ تو لگ جاتے ہیں۔"

"ارے تم ان باتوں کو چھوڑو۔ بس ہاں کرو۔ یہ سب میں سنبھال لونگی۔" وہ لڑکی کھلکھلا اٹھی تھی۔ مریم نے اسے اپنی ہوٹل کا بتایا اور خوشی خوشی ہوٹل آ گئی تھی۔ مسئلہ تو حل ہونے کو تھا۔ بلکہ ہو چکا تھا۔

وہ لڑکی اگلی صبح اسکے ہوٹل آ دھمکی تھی۔ پھر مریم کو اپنے ساتھ فیکٹری لے گئی تھی۔ وہاں مالک نے سرسری انٹرویو کے بعد اسے جاب دے دی تھی۔ تنخواہ کم تھی۔ مگر پورے مہینے میں تین وقت کا کھانا آرام سے نکل سکتا تھا۔ مریم کو اس سے زیادہ کچھ چاہیئے بھی نہیں تھا۔

مریم کا ٹرپ ختم ہونے پر اسکی ٹریولنگ ایجنسی نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ مریم نے انہیں اپنی فجی کی رہائش کا بتا دیا تھا۔ اس فیکٹری میں مرد بھی کام کرتے تھے۔ اور عورتوں والے حصے میں بس کرسٹینا اور چند ساتھی پرانی تھیں باقی سب لڑکیاں تین چار ماہ پرانی تھیں بس۔ مریم نے کوئی تجسس نہیں کیا کہ ایسا کیا ہوتا تھا کہ تھوڑے عرصے میں سب چھوڑ جاتی تھیں۔ اس کا مسئلہ حل ہو رہا تھا اسے اب باقی باتوں کی پروا نہیں تھی۔

اس فیکٹری میں زیادہ تر مقامی لوگ تھے۔ اور اسے حیرت ہوئی جب پتہ چلا مقامی لوگ سیاحوں کو لوٹ مار کر اپنا جیب خرچ نکال لیتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ سب لوگ ہی ایسے تھے۔ لیکن ایسے حادثات ہر آئے دن سننے کو ملتے تھے۔۔ اب یہ صرف ایک گروپ کا کام تھا یا زیادہ لوگ ملوث تھے اس پر کوئی تحقیق نہیں تھی۔ یہاں بھی ایک یونیفارم تھا۔

سردیوں میں جینز شرٹ۔۔ اور گرمیوں میں سکرٹ بلاؤز۔۔ چونکہ اب سردیاں تھیں تو مریم کے لیے آسانی تھی۔ جسم ڈھکا رہتا۔ سکارف کو اسکے باس نے ناک چڑھا کر دیکھا تھا۔ اور منع کر دیا تھا۔ مریم سردی کے بہانے لانگ کوٹ اور سر پر اونی ٹوپی پہنے رکھتی۔ بالوں کا جوڑا کیے رکھتی۔ "عجیب نمونہ لگتی ہو۔ اتارو اس ٹوپی کو۔۔" کرسٹینا نے ایک دن کھینچ کو وہ ٹوپی اسکے سر سے اتار پھینکی۔ مریم جو بھی کہتی رہی وہ ان سنا کیے اسکی ٹوپی بھاگ کر

کہیں چھپا آئی تھی۔

"ہم یہاں اندر کام کرتے ہیں۔ یہاں اتنی سردی نہیں ہوتی۔" دوسری لڑکی نے اسے تسلی دی۔وہ پھر خاموشی سے بوتلیں اٹھاتی رہی۔اسکی رہائش کرسٹینا کے ساتھ تھی۔فیکٹری کے قریب ہی۔کیونکہ وہ الگ رہائش افورڈ نہیں کرسکتی تھی۔

اسکے باس نے اسکا پاسپورٹ ابھی تک نہیں دیا تھا۔پھر اسے بلا کر کہا تھا کہ پاسپورٹ نہیں دے گا۔ہاں ویزہ لگ چکا ہے۔مریم نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔اسکے خیال سے اب وہ محفوظ تھی۔اسے وہاں کام کرتے ایک ماہ ہو چکا تھا۔

کرسٹینا نے نوٹ کیا تھا کہ وہ بس کام میں مگن رہتی تھی۔اور کام کوئی اتنا مشکل نہیں تھا کہ دماغ لڑانا پڑتا۔جسمانی مشقت تھی۔اور وہ بنا شکوہ کیے کرتی رہتی۔

یہاں سے جا کے کمرے میں پڑی رہتی۔زیادہ کبھی دم گھٹتا تو بس کھڑکی کے ساتھ آ کھڑی ہوتی۔جب تھک جاتی تو واپس بستر پر جا بیٹھتی۔پھر ایک دن کرسٹینا اور اسکی ساتھیوں نے بہت منت کر کے چھٹی کے بعد اسے آؤٹنگ کے لیے راضی کیا۔ان کی چھٹی رات کے آٹھ بجے ہوتی تھی۔پہلے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ سے کھانا کھایا تھا۔پھر مریم کو بنا بتائے اسے ایک کلب میں لے آئی تھیں۔وہ جی بھر کر بےزار ہوئی۔اب کئی گھنٹے وہ سب پاگلوں کی طرح ناچنے والی تھیں۔اور اسے بیٹھ کر ان کا انتظار کرنا تھا۔پہلے تو سب نے وہاں جا کر ڈرنکس لیں۔مریم نے سیزنل فریش جوس کا آرڈر دیا تھا۔

باقی لڑکیاں گلاس لیے ڈانسنگ سٹیج کی جانب بڑھ گئیں۔وہ وہیں اپنی کرسی پر بیٹھی رہی۔مڑ کر ان کو دیکھتی رہی۔گلاس ہاتھ میں تھامے تھوڑی دیر بعد اس میں سے ایک سپ لے لیتی۔میوزک بہت تیز تھا۔کوئی مقامی گانا لگا ہوا تھا۔ساری عوام اس گانے پر پاگل ہو رہی تھی۔یقیناً سب کا پسندیدہ تھا۔اس بار میں لال روشنی بہت زیادہ تھی۔باقی رنگ کی روشنیاں بہت کم تھیں۔کسی عکس کی مانند کہیں نظر آ جاتیں۔ورنہ ہر شے لال رنگ میں رنگی تھی۔

پھر دوسرا ٹریک شروع ہو گیا تھا۔عوام نے اس پر پہلے شروع مچایا پھر دوبارہ ناچنا شروع کر دیا۔

"تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں۔۔" اسے اپنے بالکل پیچھے آواز سنائی دی۔اس نے تیزی سے گردن موڑ کر بولنے والے کو دیکھا۔بارٹینڈر دونوں کہنیوں پر زور ڈالے اسکی جانب جھکا ہوا تھا۔مریم کا ہاتھ اپنے بالوں تک گیا۔وہ کھلے ہوئے تھے۔

"اوہ۔۔وہ آج ٹوپی پہننا بھول گئی تھی۔اور جوڑا ابھی کھل چکا تھا۔اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس کاؤنٹر پر رکھ دیا تھا۔اور دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔" ہے۔۔میں نے تعریف کی تم نے شکریہ بھی نہیں کہا۔۔" لڑکے نے اسکے آگے چٹکی بجائی۔" کوئی ہیئر بینڈ ہے تو دو۔۔" مریم نے اسکی بات کو ان سنا کر کے اپنی کہی۔اسے اندازہ تھا اگر وہ یہاں اس پر غصہ کرتی تو نقصان اپنا ہی ہوتا۔اس کے لیے انجان ملک تھا۔اور چیخ چلا کر اپنا ہی تماشہ بناتی۔بہتر تھا کہ سمجھداری سے اسے معاملے کو نپٹانا تھا۔

"بدذوق لڑکی ہو۔۔نہیں ہے میرے پاس۔۔" وہ بدمزہ ہوا۔اس نے اچھا برا کوئی ری ایکشن نہیں دیا تھا۔عجیب عورت تھی۔" جو اپنے بالوں کی اتنی چٹیا بنا رکھی ہیں ایک کھول کر اس کا بینڈ مجھے دے دو۔"

وہ مریم عالم ہی تھی۔لڑکے نے ناک سکوڑی۔" تم نے شکریہ بولا تھا۔۔"

"لیچڑ انسان۔۔۔" وہ اردو میں بڑبڑائی۔" میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تمہارے کھلے بال زیادہ اچھے لگیں گے۔اس لیے ایک پونی مجھے دے دو۔" باقی جملہ وہ انگلش میں بولی۔لڑکا تعریف سن کر خوش ہوا تھا۔اور ایک طرف سے بینڈ اتار کر اسے دے دیا تھا۔وہ بینڈ چھوٹا تھا۔مریم نے جوڑا کھول کر اپنے بالوں کی چٹیا بنا لی۔" واؤ تمہارے بال تو بہت لمبے ہیں۔۔"

"نہ تمہارے پاس اور کوئی کام نہیں ہے۔۔" اس نے گھورا۔" سارے لوگ ابھی ڈانس کر رہے ہیں۔۔ڈرنک کے لیے بس تم ہی بیٹھی ہو تو تمہیں ہی دیکھوں گا۔"

وہ ڈھٹائی سے دانت دکھانے لگا۔مریم نے بال باندھ کر چٹیا کو پھر جوڑے کی شکل میں کر لیا تھا۔" یہاں ہیٹر تو چل رہا ہے۔تو کوٹ اتار دو۔۔اس سے تو گرمی لگ رہی ہوگی۔۔اور تم ڈانس کیوں نہیں کر رہیں۔۔" وہ بارٹینڈر جیسے اسے زچ کرنے کو وہاں آن کھڑا ہوا تھا۔مریم بنا جواب دیے تحمل سے اٹھ کھڑی ہوئی۔اس نے چہرے پر کسی بھی تاثر کو آنے سے روکا تھا۔اسے بس یہاں سے نکلنا تھا۔ایک تو تیز میوزک۔۔لال روشنی اور وہ

لیچڑ انسان۔۔وہ تیزی سے ڈانس کرنے والوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔سٹیج پر ڈانس کرنے کی بجائے عوام راستے تک آ چکی تھی۔وہاں سٹیج درمیان میں تھا۔لیکن کیونکہ عوام زیادہ تھی، جو سٹیج پر نہیں سما رہی تھی۔

اس لیے وہ چھوٹا سا کلب ہر طرف سے انسانی ہجوم سے گھرا تھا۔ایک ہٹا کٹا مرد اس کے آگے سے ہٹنے کے بعد دروازے تک اس کے پیچھے آیا تھا۔وہ اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔تیز میوزک کی وجہ سے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔لیکن وہ سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی اس لیے رکی بھی نہیں تھی۔اسے اس جگہ شدید گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔وہ تیزی سے دروازے کو دھکیلتے باہر آئی تھی۔اور کئی گہری گہری سانسیں لی تھیں۔باقی خواتین ابھی اندر ڈانس میں مصروف تھیں۔

کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ وہاں سے دور جا رہی تھی۔اسے بارٹینڈر کی باتیں یاد آئیں تو جھرجھری کی لہر سی جسم میں دوڑ گئی تھی۔وہ پہلی بار مردوں کے بیچ ننگے سر بیٹھی تھی وہ بھی بال کھولے۔"اگر بابا اور علی کو معلوم ہو جائے تو میرے ٹکڑے بھی نہیں ملیں گے۔۔اور اگر میر حاشر دیکھ لیتا تو۔۔نجانے وہ کیا کر ڈالتا۔۔ہاں بہت غیرت مند جو تھے۔۔"اسکے لبوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔"اور یہاں ان کی غیرت کا ستیاناس ہو رہا تھا۔۔"پہلی بار اسکا دل چاہا وہ کھل کر قہقہہ لگائے۔پتہ نہیں کیوں اس سوچ نے اسے خوشی دی تھی کہ ان غیرت مند مردوں کی غیرت کا ستیاناس کر دیا تھا۔بھلے انجانے میں ہوا تھا۔مگر ہو چکا تھا۔اندر کہیں ٹھنڈک اتری تھی۔جلتے دل پر پھوار کا ایک قطرہ گرا تھا۔

اور پھر وہ ٹوپی سر پر لینا اکثر بھولنے لگی تھی۔وہ ننگے سر باہر جاتی تھی۔بس اتنی عقل ساتھ رکھی تھی کہ بال کھول کر نہیں نکلتی تھی۔اسے معلوم تھا اسکے بال بہت خوبصورت تھے اور کھلے بالوں کے ساتھ وہ اپنے پیچھے کئی مرد لگا سکتی تھی۔اسے غیرت مندوں کی غیرت پر تازیانے لگانے تھے۔اپنے آپ کو مصیبت میں نہیں ڈالنا تھا۔

☆......☆......☆

"سینڈی تمہارا پوچھ رہا تھا۔۔"وہ ایک کارٹن اٹھائے اسے مطلوبہ جگہ رکھنے لگی تھی۔کہ کرسٹینا کی آواز سنائی دی۔مریم نے کارٹن رکھ کر مڑ کر اسے دیکھا۔"کون۔۔"وہ الجھے لہجے میں بولی۔"وہ جس کی بازو پر ٹیٹو تھا۔"

"مجھے واقعی نہیں سمجھ آ رہا تم کس کا پوچھ رہی ہو۔؟"

"وہ جو پرسوں کلب میں تمہارے پیچھے دروازے تک آیا تھا۔اتنا بلاتا رہا تم نے سنا ہی نہیں۔۔کہتا تمہاری دوست بہت روڈ ہے۔۔" مریم نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔"میں اس بندے کو جانتی بھی نہیں۔۔اور وہ مجھے کیوں بلا رہا تھا۔کیا بات کرنی تھی اسے۔۔" اسکا لہجہ خود بخود سخت ہو گیا تھا۔

"اسے تم اچھی لگی تھی۔"

"میں اس سے ٹکرائی تھی اور پھر آگے چلی گئی تھی اتنی دیر میں اسے پسند بھی آ گئی تھی۔۔"

"جب تم اپنا جوس پی رہی تھیں تب سے دیکھ رہا تھا۔پھر بال باندھ کر تم جانے لگیں۔وہ تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔اس نے کہا یہ لڑکی کھلے بالوں میں اس قدر حسین لگ رہی تھی۔۔"

"استغفراللہ۔۔" مریم کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا۔" آج سے پہلے کبھی کھلے بالوں میں لڑکی نہیں دیکھی۔۔"

"سب کے بال اتنے پیارے نہیں ہوتے۔۔اور تم تو پھر ایشین بیوٹی ہو۔"

"ہونگے کیسے۔۔ہر شے حفاظت کے ساتھ ہی اچھی رہتی ہے۔۔" مریم نے طنز کیا۔"اب جاؤ مجھے کام کرنا ہے۔اور اس سنڈی بلا کا میرے آگے پھر ذکر نہ کرنا۔میرا موڈ ویسے ہی خراب ہے ایسا نہ ہو غائبانہ گالیاں کھا بیٹھے وہ۔۔" غصے سے کہتی وہ کرسٹینا کے آگے سے ہٹ گئی تھی۔

کرسٹینا نے اس کے جواب کو سیریس نہیں لیا تھا۔وہ 'سنڈی بلا' فیکٹری میں اس سے ملنے چلا آیا تھا۔مریم نے کوئی رسپانس ہی نہیں دیا تھا۔وہ شکل سے ہی عجیب سا لگتا تھا۔ایک کان میں بالی۔سلیولیس شرٹ سے جھلکتے بازوں پر بنے خوفناک ٹیٹوز۔جب کرسٹینا نے اسے بلا کر اسکا تعارف کروایا۔مریم اندھی ،گونگی اور بہری بن گئی تھی۔اچھا کرسٹینا تم نے مجھے کسی کام کے لیے بلایا تھا؟ کب؟ مجھے یاد نہیں۔مریم اسکی آوازوں پر بہری بنی اپنا کام کرتی رہی۔وہ عجیب ہی لڑکی تھی۔اس کے منع کرنے کے باوجود بھی اس بندے کو اس سے ملانے لے آئی تھی۔وہ چاہتی کیا تھی؟۔۔

مریم کہیں آتی جاتی تو نہیں تھی۔اس لیے وہ سنڈی بلا اسکے آنے جانے کے راستے پر کھڑا دو دن اسے تاڑتا رہا۔تیسرے دن وہ سر جھکائے اپنے گھر جانے کو تھی کہ ذرا فاصلے پر بیٹھا وہ سنڈی بلا اسے آتا دیکھ کر اس تک

آیا۔" ہیلو۔۔ بیوٹی۔۔" مریم نے اسے دیکھ کر قدموں کی رفتار تیز کر دی۔"اب بس مجھ سے مزید صبر نہیں ہوتا۔ پانچواں دن ہیکر سٹینا کو پیسے دیے۔ بتاؤ اور کتنے دن انتظار کرواؤ گی؟"

"جی؟؟؟؟" مریم ٹھٹک کر رکی۔

" کیا کہا؟" اس بے وقوف کو اتنی کھلی بات بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔" میں نے زیادہ پیسے اس لیے دیے کہ تم ایشین بیوٹی ہو۔۔" اس نے پھر آگے بڑھ کر مریم کے بازو سے پکڑ کر اسے اپنے قریب کیا۔ مریم کا سانس رک گیا تھا۔

اس سے اتنی اچھی طرح بات کرنے والی۔۔ خود کو اسکی دوست کہنے والی۔۔ اسکا سودا کر چکی تھی۔۔ بات سمجھ آتے ہی اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ ہٹا کٹا مرد تھا۔ وہ محض پھڑ پھڑا کر رہ گئی تھی۔ اسکی مزاحمت پر وہ ہنسا۔"اس بات کا کیا مطلب سمجھوں۔۔ اور کتنے پیسے چاہیئے تمہیں۔۔ روز کرسٹینا کہتی ہے آج وہ اتنے پیسے مانگ رہی ہے۔۔ پتہ ہے تم میری زندگی کی سب سے مہنگی عورت ہو۔۔" مریم نے اپنے دونوں ہاتھوں کے ناخن اسکے بازو میں گاڑے۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے چھوڑا۔ مریم تیر کی تیزی سے بھاگی۔ اور اپنے گھر کا دروازہ کانپتے ہاتھوں سے کھولنے لگی۔ پیچھے وہ اس کی تڑپتی مچھلی کے جیسی حالت دیکھ کر اونچی آواز میں قہقہے لگاتے آرہا تھا۔ وہ اطمینان سے چلتا اس کے گھر تک آرہا تھا۔ جیسے اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔

اسے کرسٹینا نے کہا تھا کہ وہ گھر چلی جائے۔ کیونکہ آج وہ کہیں باہر گھومنے کا پروگرام رکھتی تھی۔ اسے کرسٹینا کی نظریں یاد آء؟ں۔۔ افف یہ دروازہ کیوں نہیں کھل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔" مریم ہمت نہیں ہارنی۔۔ جلدی کرو۔۔" اس نے خود کو حوصلہ دیا۔ وہ اس کے گھر کے احاطے میں داخل ہو چکا تھا۔

دروازہ کھل چکا تھا۔ مریم نے جلدی سے اندر جا کر دروازہ لاک کیا۔ لیکن وہ جانتی تھی یہ عارضی تھا۔ وہ طاقتور مرد تھا۔ وہ کسی بھی لمحے دروازہ کھول کر اندر آ سکتا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے بستر کے نیچے رکھے اپنے بیگ کو اٹھایا۔ وہ اسے لینے ہی تو آئی تھی۔ اسے کرسٹینا کے ساتھ نہیں رہنا تھا۔ اس بیگ میں اسکے ڈاکومنٹس تھے۔ زندگی کی جمع پونجی۔۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے زپ کھول کر چیک کر رہی تھی۔ اسکی ڈاکومنٹس فائل تھی۔ موبائل

،لیپ ٹاپ اور اسکے کپڑے بھی تھے۔جب کے اسکے پیسے گم ہو چکے تھے۔اسکے حواس مزید اڑے۔دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

"اللہ اب کیا کروں۔۔" اسکے دماغ میں وہ تھانے والی رات آنے لگی۔آج حاشر نہیں تھا جو بچانے آتا۔آج کوئی معجزہ نہیں ہونا تھا۔آج اسے خود اپنے آپ کو بچانا تھا۔دستک تیز ہونے لگی تھی۔اس نے بیگ کو دونوں جانب سے کندھے پر ڈالا۔اور ایک دوپٹہ نکال کر اسے ڈبل کر کے جلدی سے اسے سکارف کی طرح اوڑھا۔وہ تیزی سے کمرے کے چاروں کونوں میں نگاہیں دوڑا رہی تھی۔کچھ ایسا جو اسے بچا سکتا۔۔اب دروازے کو دھکا دیا جا رہا تھا۔

مریم نے ایک طرف رکھا گلدان اٹھا کر اسے ایک دیوار پر لگے آئینے پر مارا۔دونوں ہی لمحوں میں چکنا چور ہوئے تھے۔وہ تیزی سے جھک کر ان ٹکڑوں کو ہاتھوں سے دروازے کے آگے دھکیل رہی تھی۔اگر وہ دروازہ کھول کر اندر آتا تو پہلے اسکے پاؤں زخمی ہوتے۔یہ سب کرتے اسکے اپنے ہاتھ زخمی ہو چکے تھے۔اسے پرواہ نہیں تھی۔اسے خود کو بچانا تھا۔یہ چند لمحوں کی مہلت ضائع نہیں کرنی تھی۔پھر کھڑکی کھول کر اس نے باہر جانا چاہا۔

اب کی بار لگا تھا دروازہ ٹوٹنے کو ہے۔مریم نے نیچے جھانکا۔اس کھڑکی کے نیچے دو کتے بیٹھے تھے۔اس نے خود کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کیا تھا۔پھر جلدی سے کمرے کے ایک کونے میں رکھی چھوٹی ٹیبل اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینکی۔تا کہ کتے وہاں سے ہٹ جائیں۔جب کہ وہ ہٹنے کی بجائے کھڑکی کی جانب رخ کیے زور زور سے بھونکنے لگے تھے۔اب وہ کہاں سے بھاگتی؟اس نے ٹوٹے گلدان کا ایک بڑا ٹکڑا ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔تبھی دروازے کا لاک ٹوٹ گیا تھا۔وہ سنڈی بلا اسے خونخوار نگاہوں سے گھورتا اندر آیا تھا۔اور کئی کانچ کے ٹکڑے اسکے پیروں میں گھس گئے تھے۔وہ چیخ اٹھا تھا۔" تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔۔" وہ ان ٹکڑوں پر چلتا اس تک آنے لگا۔نیچے سے بھونکتے کتے اب جمپ لگا کر کھڑکی کے راستے اندر آنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔مریم کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔مگر یہ وقت کانپتی ٹانگوں پر توجہ دینے کا نہیں تھا اس وقت سامنے کھڑی مصیبت سے جان چھڑانی تھی۔

اور جیسے ہی وہ قریب آیا۔اس نے مریم کو پکڑنا چاہا۔تو اس نے ہاتھ میں پکڑا گلدان کا ٹکڑا پوری قوت سے اسکی سائیڈ میں گھسا دیا۔وہ بلبلا کر جھکا۔مریم تیزی سے بھاگ کر دروازے تک گئی تھی۔اسکی جوتی کے نیچے کئی کانچ آئے تھے۔وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اب دروازے کو لاک لگا رہی تھی۔اسکا اندر کا لاک ٹوٹا تھا باہر کا نہیں۔وہ بپھرا شیر اس زخمی حالت میں جب تک دروازہ توڑ کر باہر آتا وہ اس سے دور ہوتی۔وہ تیزی سے اپنے گھر کی مخالف سمت میں بھاگ رہی تھی۔

اندھیری گلیاں۔۔یہ رستہ اسکے لیے انجان تھا۔وہ جب سے آئی تھی۔بس مخصوص راستوں سے آتی جاتی تھی۔بھاگتے بھاگتے اسے لگا اسکے پاؤں میں کچھ گھسا تھا۔وہ منہ کے بل گری تھی۔"آہ۔۔" وہ درد سے چلائی تھی۔کانچ کے کچھ ٹکڑے جوتے میں پھنس گئے تھے اور بھاگتے ہوئے وہ اوپر ہو کر اسکے پاؤں میں آ لگے تھے۔وہ درد سے کراہتے اٹھی تھی۔پھر دائیں پاؤں سے جوتی نکالنے کی کوشش کی۔شیشے کا ٹکڑا بہت بڑا تھا،اسکے پاؤں کی ہتھیلی اور جوتے کے درمیان ترچھے رخ میں پھنس چکا تھا۔وہ شیشہ نکالتی تو خون نے رکنا نہیں تھا۔نہ نکالتی تو یہیں پڑی رہتی اور اگر وہ پیچھے سے آ جاتا تو۔۔اس نے دونوں لبوں کو بھینچے آدھی جوتی اتاری۔درد بڑھنے لگا تھا۔پیچھے سے کئی آوازیں سنائی دینے لگیں۔کتنا تیز لوگ تھے۔پندرہ منٹ میں اسکے پیچھے ڈھونڈنے کھڑے ہوئے تھے۔مریم نے آنکھوں کو بند کر کے پورا زور لگا کر جوتے کو اتار پھینکا تھا۔خون تیزی سے بہنے لگا تھا۔

پھر دوسرا جوتا اتار کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔درد کے مارے اس نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔اب وہ گلیوں سے نکل کر روڈ پر تھی۔یہ روڈ سنسان تھا۔اور یہاں روشنی بھی کم تھی۔وہ نہیں جانتی تھی وہ بھاگتے بھاگتے کہاں آ چکی تھی۔وہ ویسے بھی اس شہر کے رستوں کو نہیں جانتی تھی۔اب وہ بھاگ نہیں سکتی تھی۔خون بھی بہہ رہا تھا۔پیر زمین پر رکھتے ہی درد کی کئی لہریں پوری ٹانگ میں پھیلنے لگتیں۔وہ لنگڑا کر بھی نہیں چل پا رہی تھی۔اسکا دل چاہا وہ یہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔

اس نے کبھی جسمانی تکلیف نہیں جھیلی تھی۔اسے نہیں پتہ تھا کہ جب جسم میں ایسی انتہا کی تکلیف ہو تو کیسے برداشت کرتے ہیں۔آنسوؤں کی وجہ سے راستہ دھندلا ہو رہا تھا۔چند قدم چل کر وہ پھر بیٹھ گئی تھی۔زخم پر پٹی

کرنی تھی ورنہ بہت سا خون بہہ جاتا۔اس نے بیگ اتار کر اندر سے ایک کپڑے کو ہاتھ مارا۔اسکی قمیض تھی۔مریم نے بیگ کی زپ کو بند کر کے اسے لمبائی میں فولڈ کیا۔

" دیکھو یقیناً اسی راستے سے گئی ہوگی۔۔" ایک آواز ہوا کے دوش پر اس تک پہنچی تھی۔اس نے غور کیا یہ کرسٹینا کی جھنجھلائی ہوئی آواز تھی۔اس نے خوف سے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر چاروں جانب۔۔وہ لوگ اس سے زیادہ دور نہیں تھے۔کیا فائدہ ان زخموں کا اگر اُنکے ہاتھ ہی لگنا تھا تو۔۔اس نے خود کو ہمت دلانے کی کوشش کی۔جلدی سے قمیض کو پاؤں کے گرد لپیٹتی جا رہی تھی۔اور پھر دونوں بازوؤں کو ایک حد تک لپیٹ کر ان سے پاؤں کے اوپر دو گرہیں لگا لی تھیں۔پہلے ہوا ہلکی تھی۔اب ایک دم سے ہوا میں تیزی آنے لگی تھی۔اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ناگوار بو کے بھبکے آئے تھے۔مریم نے ناک پر ہاتھ رکھا تھا گیلے ہاتھ منہ کو لگے تو احساس ہوا۔اسکے ہاتھ بھی زخمی تھے۔

پھر اسی طرح لنگڑاتے قدموں سے پیچھے جا کر اپنے جوتے اٹھائے۔اسیہاتھوں میں لیے پھر آگے کو چلنے لگی۔اسے اپنے وہاں ہونے کا ثبوت بھی نہیں چھوڑنا تھا۔وہ ابھی تک شک میں تھے کہ وہ اسی راستے سے گئی ہوگی تو یہ شک یقین میں نہیں بدلنا چاہیئے تھا۔وہ روڈ کے ایک سائیڈ پر ہو کر چل رہی تھی۔آوازیں اب بہت صاف سنائی دینے لگی تھیں۔اور وہ چار پانچ لوگ آپس میں بول رہے تھے۔مریم کو گالیاں دے رہے تھے اور کرسٹینا کو دھمکیاں۔۔مریم نے رک کر چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔بد بو بڑھتی جا رہی تھی۔نجانے کونسا علاقہ تھا۔شاید شہر سے دور تھا اس نے اندازہ لگایا۔

پھر آگے جا کر اسے دو کچرے کے ڈرم نظر آئے تھے۔روڈ کی دوسری جانب بھی ایسے ہی تین ڈرم رکھے تھے۔وہ درد کی پروا کیے بنا تیزی سے چلتی رہی۔دونوں ڈرم کچرے سے ابل رہے تھے۔اس طرف اندھیرا تھا۔مگر کچرے کی گندی بد بو نے اسے منہ پر ہاتھ رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔روڈ پر ایک ساتھ کئی لائٹس ڈالی گئی تھیں۔وہ اسکے بہت قریب آ چکے تھے۔اس نے کچرے کے ڈرم کو دیکھا۔اور پھر ارد گرد پڑتی لائٹس کو دیکھا۔آخری پناہ گاہ یہی کچرے کے ڈرم تھے۔وہ اونچے ڈرم تھے۔پہلے اس نے اپنا بیگ اندر ڈالا۔پھر دونوں ہاتھوں کو ڈرم کی دیوار کی سطح پر جمائے خود کو بلند کیا۔ہاتھوں میں شدید درد اٹھا تھا۔وہ واپس نیچے

ہوئی۔

لائٹس ابھی بھی ڈالی جارہی تھیں۔اگراس پربھی روشنی آجاتی تو ساراکھیل ختم تھا۔اس نے ہمت کر کے پھر سے ہاتھوں کی مدد سے خود کواوپر کیااور بائیں ٹانگ کواوپر کر کے اندر کیا۔بدبو مارے جارہی تھی۔پھردائیں کو بھی اوپر کر کے اندکیا تھا۔وہ کچرا تھا کوئی ہموار زمین نہیں تھی۔اسکے پاؤں اندر کو دھنستے گئے تھے۔وہ توازن نہیں رکھ پا رہی تھی۔وہ ایک جانب گر پڑی۔تبھی ایک تیز لائٹ اس کچرے کے ڈرم پر پڑی۔مریم نے سانس روک لی تھی۔صرف لمحے کی چوک سے وہ بچ گئی تھی۔

اس نے اپنے دائیں ہاتھ کوسختی سے منہ پراسطرح رکھا تھا کہ اسکی ناک تک جاتی ہوا کا راستہ بھی رک گیا تھا۔لائٹ حرکت کررہی تھی۔مریم نے اپنی پوزیشن کوٹھیک کرنا چاہا۔ہولے سے سر کواٹھائے اٹھی تھی اور بیٹھنے کی کوشش کی۔اور چنداانچ نیچے کھسک گئی تھی۔؟

قدموں کی آوازیں قریب آتی جارہی تھیں۔مریم نے دونوں ہاتھوں سے پاس پڑا کچرا اٹھا کرخود پر ڈالنا شروع کیا۔بدبو۔۔آہ موت تھی جیسے۔۔

وہ اپنی سانسیں روکے تیزی سے ہاتھوں کوحرکت دیے جارہی تھی۔ہاتھ اس کچرے سے بھرکرخراب ہوچکے تھے۔وہ صرف خشک کچرانہیں تھا۔

جب تک ان قدموں کی آوازاس ڈرم کے قریب ہوئی تھی۔تب تک وہ خود کومکمل طور پراس کچرے سے ڈھانپ چکی تھی۔اس نے زندگی میں کبھی اتنی بدبونہیں سونگھی تھی۔اسے اپنے جسم کے بہت سے حصوں پر کچھ نہ کچھ رینگتاہوامحسوس ہونے لگا تھا۔وہ منہ کھول کر چیخ بھی نہیں سکتی تھی۔

"پیچھے روڈ کے درمیان میں خون لگا ہوا۔جیسے اس کے پاؤں زخمی تھے۔۔لیکن چند قدموں کے بعد خون کے نشان گم ہیں۔۔گئی تو گئی کہاں۔۔"اسکے ڈرم سے ذراسے فاصلے سے یہ آوازیں اس تک آرہی تھیں۔خوف کے مارے اسکی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی پھیل گئی تھی۔

یہ گھر میں گزری اس رات سے کئی گنا زیادہ خوفناک رات تھی۔وہ رات کچھ بھی نہیں تھی۔وہ اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کررورہی تھی۔وہ منہ کھول کرنہیں روسکتی تھی۔جسم پر چلتے کیڑے منہ میں نہ گھس جاتے۔اپنی ناک کو

اس نے دبا رکھا تھا۔منہ پر رکھے ہاتھ کی انگلیوں سے کبھی خلا پیدا کر کے ایک لمبی سانس لیتی اور وہ درمیان میں ہی رک جاتی کہ ساتھ کئی گنا تیز بدبو کے بھبکے آتے تھے۔عزت کے جانے کے خوف سے وہ پسینہ پسینہ ہوئے جا رہی تھی۔

اسکے آنسو اسکی آنکھوں میں ہی جم چکے تھے۔" ہوسکتا ہے کسی اور کے خون کے نشان ہوں۔۔وہ یہاں آئی ہی نہ ہو۔۔"

" جس کے بھی خون کے نشان ہیں۔۔وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں جا سکتا۔۔یا تو وہ اڑ کر ہوا میں گھل گئی ہے۔۔یا اسے کوئی اٹھا کر لے گیا ہے۔۔" سب گروپ کی صورت میں ادھر ادھر دیکھتے بول رہے تھے۔

" تمہاری غلطی ہے۔تم نے کہا تھا اسکا آگے پیچھے کوئی نہیں۔۔نا کسی کو فون کرتی ہے نا کوئی اسے۔۔کوئی پوچھنے بھی نہیں آئے گا۔۔آسان لڑکی ہے۔۔" ایک بولتے ہوئے کرسٹینا پر الٹ پڑا تھا۔

" ہاں تو ایسے ہی تھی۔۔میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔۔اتنی معصوم لگتی تھی مجھے کیا پتہ تھا سینڈی کو اتنا زخمی کر کے جائے گی۔۔" اس نے صفائی دی۔۔

" اب جو بھی ہو تم ہمارا نقصان پورا کرو۔۔اس لڑکی کے لیے ہم نے تمہیں بہت پیسے دیے ہیں۔کل تک مال بھیجنا ہے لڑکی گم ہے۔۔اب اسکی جگہ تمہیں بھیج دیں۔۔۔" وہ چلایا تھا۔

" نہیں دیکھو وہ یہیں کہیں ہوگی۔یہاں سے آگے پانچ منٹ کی واک کے بعد سمندر ہے وہ وہاں تک گئی ہوگی۔۔وہاں دیکھ لیتے ہیں۔۔"

" اگر وہ سمندر میں چھلانگ لگا چکی ہوئی تو۔۔۔ہمارا ہرجانہ کون بھرے گا۔"

کرسٹینا کی کراہتی آواز آئی تھی۔شاید ایک آدمی نے اسکے بال پکڑ لیے تھے۔" پہلے کبھی دھوکہ دیا ہے تم لوگوں کو اب دوں گی۔۔" وہ غصے سے چیخ اٹھی تھی۔

مریم کھانسنا چاہتی تھی۔لیکن وہ خود کو حرکت کرنے سے بھی باز رکھ رہی تھی۔کچرے میں ذرا سی بھی ہل جل ہوتی تو وہ چیک کرنے آن پہنچتے۔" ٹھیک ہے پہلے ان ڈرموں کو چیک کر لو۔یہاں نہ چھپ گئی ہو۔۔" ایک آدمی نے کہا۔اور دو آدمی آگے بڑھ کر اسکے ساتھ والا ڈرم چیک کرنے لگے۔تم جاؤ ذرا بیچ تک دیکھ کر آؤ۔"

انکا باس حکم دے رہا تھا۔ وہاں کچرے میں پڑے مریم کی سانسیں بدبو کے مارے رکنے لگی تھیں۔" یا اللہ شاید وقت آخر آن پہنچا ہے۔۔" اس سے اب مزید وہاں سانس نہیں لیا جا رہا تھا۔ وہ مریم کے ڈرم کو چیک کرنے لگے تو انکے باس نے وہاں لائٹ ڈالی اور ڈرم کو دیکھ کو منع کر دیا۔

" ایسے گند میں کون چھپتا ہے۔۔ اور لڑکیاں تو کبھی نہیں۔۔ اس نے کوئی اور راستہ ڈھونڈا ہو گا۔۔ یہاں نہیں ملتی تو کہیں اور گئی ہوگی۔۔" وہ دو مرد کچرے کو یہاں وہاں کرتے رک گئے تھے۔ وہ باس کے پاس آئے۔" سینڈی کے زخمی ہونے کی اطلاع پولیس کو نہیں دے سکتے۔۔ ذرا سی غلطی پر پورا گروپ پکڑا جائے گا۔ ایسا کرو کرسٹینا کو مارو اور اسکی شکایت لکھواؤ۔۔ وہ لیگل ہے۔۔ اسے پولیس نہیں پکڑے گی۔۔ اور ہاں شکایت مریم عالم کے نام کی ہو۔۔ وہ ہے تو یہیں کہیں۔۔ بس یہ ملک چھوڑ کے نہ جائے۔۔ سینڈی اور کرسٹینا کی وجہ سے خوامخواہ اس لڑکی پر پیسہ لگا دیا اس سے اچھا کوئی اور دیکھتے۔۔ ضروری مسلم گرل دیکھنی تھی۔۔ اب دیکھو کیا کچھ بھگتنا پڑ رہا ہے۔۔ ہمیشہ کہتا رہا ہوں۔۔ کمزور لڑکیاں ڈھونڈو۔۔"

" تو مجھے کب پتہ تھا کہ وہ اتنی معصوم دکھنے والی ٹارزن نکلے گی۔۔" دوسری طرف کے ڈرم چیک کر کے کرسٹینا نے آتے ہوئے آخری بات سنی تھی۔ اور جل کر بولی۔ اس وقت وہ خود غصے سے بھر چکی تھی۔ یہ مریم عالم اسے مل جاتی وہ اسے لٹکا دیتی۔

انکی باتوں سے مریم کو اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ مافیا کے لوگ تھے۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس چھوٹے سے ملک میں بھی مافیا ہو سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا دنیا سے پرے تھا تو دنیا سے بہت اچھا تھا۔ مگر یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ اچھے برے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

وہ ملک وقوم کی پہچان سے ماورا ہوتے ہیں۔ وہ کسی ملک وقوم کی پہچان نہیں ہو سکتے۔ انکی اپنی پہچان تھی۔ شیطان کے ساتھی۔۔ جو کسی بھی قوم میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ کسی بھی ملک میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور اگر برائی نہ ہو تو اچھائی کا پتہ کیسے چلے؟ یہ برے لوگ ہی تو اچھے لوگوں کی قدر کرواتے ہیں۔ دنیا پھر انہیں سراہتی ہے کہ تم اچھے ہو۔ تم شیطان کی اولاد سے نہیں ہو۔ تم خوش قسمت ہو۔ جو اپنے وجود کو کسی اور کے لیے تکلیف کا باعث نہیں بناتے۔ جو اپنے دماغ کو لوگوں کے نقصان پر خرچ نہیں کرتے۔

وہ لوگ وہاں سے نہیں ہٹے تھے۔ وہ یہاں وہاں چہل قدمی کر رہے تھے۔ اپنے آگے کے لائحہ عمل تیار کر رہے تھے۔ اور اپنے ان دو ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ جو مریم عالم کو ڈھونڈنے سمندر تک گئے تھے۔

مریم کو جسم پر کیڑوں کی سرسراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اب بند آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ ڈر سے آنکھیں نہیں کھول پا رہی تھی۔ کہیں آنکھ میں نہ کچھ چلا جائے۔ آواز نہیں نکال رہی تھی۔ پکڑی نہ جائے۔ کھل کے سانس نہیں لے رہی تھی۔ بدبو کے مارے دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسکے پیروں کے نیچے نجانے کس قدر گندگی تھی کہ اسے اپنے پیر لتھڑے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اسکے سر پر سکارف تھا تو بالوں میں ابھی تک کچھ نہیں گیا تھا۔ کیونکہ جو کچرا سر پر تھا وہ خشک تھا۔ وہ شاپروں کا انبار تھا مگر گندگی نہیں تھی۔ وہ ساکت پڑے تھک گئی تھی۔ اسے اپنا جسم اکڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن وہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ ذرا سی سرسراہٹ پر وہ اس تک آ جاتے۔ اسے کسی مافیا گروپ کے ہتھے نہیں چڑھنا تھا۔ بھلے اس کچرے میں ہی موت آ جاتی۔ پسینے کی وجہ سے کپڑے جگہ جگہ سے جسم سے چپکنے لگے تھے۔ اور اب کیڑے کاٹ رہے تھے۔

شاید ایک گھنٹے سے اوپر کا وقت ہو چکا تھا۔ مریم کے حواس اب اسکا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ وہ اس سے زیادہ ٹارچر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ان کے جانے کے بعد نکل جائے گی مگر وہ وہاں کھڑے اپنی آگے کی پلاننگ کر رہے تھے۔

"تو میری موت کچرے کے اندر لکھی تھی۔۔" اسکا ذہن ہولے ہولے غنودگی میں جا رہا تھا۔ "میرے اللہ۔۔ بہت بدبو ہے۔۔۔ گھٹن ہے۔۔ سانس نہیں آ رہی۔۔" وہ زندگی اور موت کی درمیانی راہ پر کھڑی تھی۔

"شاید وقت آخر ہے۔۔ اللہ میں مر رہی ہوں۔۔ آپ گواہ رہنا۔۔ میں گواہی دیتی ہوں اللہ آپ واحد ہیں۔۔ آپ طاقتور ہیں۔۔ زمین و آسمان کے مالک ہیں۔۔ بن ستونوں والوں اونچے آسمانوں کے مالک ہیں۔۔ خالق ہیں۔۔ آپ میرے رب ہیں۔۔ میں نے آپ کے سوا کسی کو کبھی شریک نہیں کیا۔۔۔" وہ اپنے آخری کلمات ذہن میں ترتیب سے دہرا رہی تھی۔ ٹھیک ہے موت سامنے تھی۔ مگر ابھی بھی سانسوں کی مہلت تھی۔ اس آخری وقت میں سب سے اہم کام اپنے ایمان کو پھر سے دہرانا تھا۔ بھلے زبان نہیں ہلا سکتی تھی کہ کندھے پر بیٹھے فرشتے لکھتے۔ اسکی بات تو اللہ سے تھی۔ وہ تو دل کی بات بھی سن سکتا ہے۔ تو وہ آخری سانسوں

میں اپنی زندگی کا سب سے آخری کام کر رہی تھی۔ ضروری نہیں یہ مہلت سب کو نصیب ہو۔

"میں گواہی دیتی ہوں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں۔۔ اللہ۔۔" وہ اب اپنے ہوش کھوتی جا رہی تھی۔ ہر جانب بدبو کا راج تھا۔ اور جسم پر کاٹتے کیڑوں کو کھانے کو بہت کچھ مل گیا تھا۔ "امی۔۔ مجھے نیند آ رہی۔۔ ہے۔۔ امی۔۔ ابو۔ جی۔۔ بیگ لینا ہے۔۔ کل بازار۔۔ حاشر میرا۔۔ پاؤں دکھ رہا ہے۔۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ علی تم۔۔ ردا اور ساشا۔۔" اس کے دماغ میں سب کچھ گڈ مڈ ہو رہا تھا۔ کبھی ایک سین دماغ میں ابھرتا اور فوراً ہی دوسرا اسکی جگہ لے لیتا۔ "اللہ میں گواہی۔۔ بدبو۔۔ اوہ۔۔ پاؤں۔۔ میرا سر کہاں۔۔ لا الہ۔۔ لاشریک۔۔" اس الفاظ کے بعد اسکے دماغ نے اسکا ساتھ مکمل طور پر چھوڑ دیا تھا۔ اسکا منہ پر رکھا ہاتھ ڈھیلا ہو کر اسکے منہ سے ڈھلک کر ایک طرف ہو گیا تھا۔ دوسرا ہاتھ گند میں کہیں پھنسا تھا۔ جسم بھی ڈھیلا ہو کر مزید نیچے کو سرک گیا تھا۔

☆......☆......☆

"یہ صبح کے چھ بجے اٹھ کر کہاں جا رہے ہو۔۔" وہ تیار ہو کر اپنی گاڑی کی چابی اٹھانے لگا تھا۔ پیچھے سے اسکی بیوی کی آواز آئی تھی۔ "اگر آج بھی کام پر نہیں گیا تو میری جو اتنی شکایتیں گئی ہوئی ہیں آج نوکری سے نکال دیں گے۔" وہ عجلت میں تھا پھر بھی بیوی کو سکون سے جواب دیا تھا۔ "ٹھیک ہے لیکن جلدی آ جانا۔"

وہ اس شہر کے ایک حصے سے کچرا اکٹھا کرنے پر مامور تھا۔ اسکی سرکاری نوکری تھی۔ اپنی بیوی کی بیماری کی وجہ سے وہ کافی دنوں سے بلکہ اگر مبالغہ آرائی سے کام نہ لیا جائے تو ایک ماہ سے اپنے علاقے سے کچرا نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ اس علاقے سے ذرا ہٹ کے دیہاتی آبادی شروع ہو جاتی تھی۔

شروع میں کسی نے کچھ نہیں کہا مگر وہاں اس راستے پر پھر گزرنا بھی محال ہونے لگا۔ ہر طرف سے اسکی شکایتیں آنے لگیں کہ وہ کچرا نہیں اٹھا رہا۔ وہ بیوی کی بیماری کا کہتا۔۔ اور کہتا کل جاؤنگا آج جاؤنگا۔۔ مگر کل اسے آخری وارننگ جاری کی گئی تھی۔ اس لیے آج وہ ڈیوٹی کا وقت شروع ہونے سے پہلے وہاں سے کچرا صاف کرنا چاہتا تھا۔

وہ اور اسکا ساتھی اپنی کچرا اٹھانے والی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے علاقے میں آ گئے تھے۔ روڈ کی دوسری جانب

رکھے تینوں ڈرم وہ خالی کر چکے تھے۔گاڑی آگے کر کے وہ اب ان دو ڈرموں تک آئے۔" یہ کام ہو تو میری جان چھٹے۔۔میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔" وہ اب گھر جانے کی جلدی میں تھا۔دونوں میں بہت پیار تھا۔

" یہ دیکھو۔۔یہ کیا ہے۔۔" اسکے ساتھی کی تیز آواز سارے میں گونجی تھی۔وہ جلدی سے گیا۔وہاں کچرے میں سامنے ایک لڑکی آڑی ترچھی پڑی تھی۔اسکا نچلا وجود کچرے میں تھا۔دونوں بازو کھلے پڑے تھے۔اور اوپری وجود پر بھی کہیں کہیں گند لگا تھا۔

" یہ کون ہے۔۔"

" جو بھی ہے جلدی اٹھاؤ۔۔" اسکے ساتھی کے کہتے ہی دونوں اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ایک اندر جا کر اس لڑکی کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔تھوڑی سی جدوجہد کے بعد وہ اسے وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

" یہ اسکا بیگ بھی ہے دیکھو۔۔" ایک نے اندر کی طرف جھک کر بیگ بھی باہر نکال لیا تھا۔اسے زمین پر لٹا کر وہ اسکے وجود سے چپکا کچرا ہٹا رہے تھے۔" دیکھو سانسیں چل رہی ہیں۔۔" پھر ایک نے اسکی ناک کے آگے اپنی دو انگلیاں کیں۔" میرا خیال ہے مر چکی ہے۔ایمبولینس بلاؤ۔۔شاید بچی ہوئی ہو۔۔ڈاکٹر ٹھیک طرح سے دیکھے گا۔۔" وہ دونوں بوکھلائے ہوئے تھے۔یہ انکی زندگی کا پہلا واقعہ تھا۔یوں کچرے سے کسی انسانی وجود کا ملنا۔۔یا پھر ایک صحیح سلامت لڑکی کا ملنا جو وہاں سے بھاگ سکتی تھی۔مگر کچرے میں ہی پڑی رہی تھی۔یہ کیا معمہ تھا؟۔

وہ ایمبولینس کو کال کر چکے تھے۔قریبی ہسپتال سے ایمبولینس آنے میں دو منٹ لگے تھے۔یہ وہاں اپنی طرز کا انوکھا واقعہ تھا۔اس چھوٹے سے ہسپتال میں اس وقت ڈیوٹی پر صرف ایک ہی ڈاکٹر تھی۔اسے ہسپتال داخل کرا کے وہ دونوں اپنا کام کرنے چلے گئے تھے۔ڈاکٹر نے کہا تھا ابھی اسکی سانسیں چل رہی ہیں۔لیکن بہت مدھم ہیں۔۔اتنی کہ کسی بھی لمحے سانسوں کی ڈوری ٹوٹ سکتی ہے۔اس لڑکی کا زندہ بچ جانا ایک معجزہ ہوتا۔اسکے وجود سے بو آرہی تھی۔مگر وہ ڈاکٹر اس ناقابل برداشت بو کے باوجود بھی اس کے قریب کھڑی اسے زندہ

رکھنے کے جتن کر رہی تھی۔اور اتنے جتنوں کے بعد بھی وہ جانتی تھی اسکے بچنے کے چانس ایک یا دو فیصد تھے۔یہ چانس بھی اس لیے کہ اسکی سانسیں چل رہی تھیں۔ورنہ یہ امید بھی نہ ہوتی۔اور ڈاکٹر ز اگر اپنے شعبے سے مخلص نہ ہوں تو۔۔کئی گھروں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔

وہ اپنے پیشے سے مخلص تھی۔وہ ایک فیصد کے چانس پر بھی اپنے مریض کے علاج سے مایوس نہیں ہوسکتی تھی۔اسکا کام دوا کرنا تھا۔سو وہ کر رہی تھی۔پھر نرسوں کو بلا کر اس لڑکی کو صاف کروایا تھا۔وہ مر بھی جاتی تو یہ انسانیت کی توہین تھی کہ ایک انسان یوں بدبودار ہو کر مرتا۔

اس کا کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون تھی۔اور وہاں کچرے میں خود گئی تھی کسی نے مار کر ڈالا تھا۔اسکے ہاتھ پیر بھی زخمی تھے۔جسم پر کیڑوں کے کاٹنے کی وجہ سے الرجی ہوگئی تھی۔اور کہیں کہیں سوجن تھی۔اسکے سر کا اسکارف اتار کر اسکے بالوں کو بھی صاف کیا گیا تھا۔ڈاکٹر ایلی کو اسکے بیگ کا معلوم نہیں تھا۔ورنہ اسے کھول کر کچھ دیکھ لیتی۔اسکا بیگ ایک نرس نے صاف کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔اسکے کپڑے پھینک دیے تھے۔اسکا موبائل اور لیپ ٹاپ اور اسکے ڈاکومنٹس۔۔۔

اگر ڈاکٹر کو معلوم ہو جاتا تو وہ ان ڈاکومنٹس کو دیکھ کے سمجھ جاتی کہ وہ پاکستانی ہے۔اسکا آئی ڈی کارڈ تھا اس فائل میں۔وہ پاکستان ایمبسی میں رابطہ کرتی۔اب تو بس پولیس میں رپورٹ درج ہوئی تھی۔پولیس نے بھی زیادہ شور نہیں کیا تھا۔وہ یہاں کی نہیں لگتی تھی۔کوئی سیاح تھی۔اور کون سا ایسا ملک ہے جو اپنے ملک میں آنے والے سیاحوں کے ساتھ ہوئے برے حادثات کو پبلک کرے۔لہذا یہ معاملہ اسکے ہوش میں آنے تک ٹھپ تھا۔اگر مر جاتی تو دفنا دیتے۔

آج چوتھا دن تھا۔اسے ہوش نہیں آیا تھا۔اسکی ڈاکٹر نے اس کے لیے خاص اسکے کمرے میں خوشبوؤں کا انتظام کر رکھا تھا۔چھوٹی سی بہت سی ٹیبلز تھیں کمرے میں جن پر روز مختلف خوشبوؤں کے حامل پھولوں کے گلدستے منگوا کر رکھے جاتے۔وہ ڈاکٹر یہ پیسے اپنی جیب سے لگاتی تھی۔

ہاں دنیا سے ابھی اچھے لوگ نہیں گئے۔ابھی بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو انسانوں سے محبت کرتے ہیں اور اس محبت سے نہیں تھکتے۔صلے کی پروا کیے بغیر محبت کو بانٹتے جاتے ہیں۔ہاں دنیا میں مریم عالم جیسے اور بھی بہت

سے بے وقوف پائے جاتے ہیں جو انسانوں سے محبت کو بہت اعلیٰ سمجھتے ہیں۔

نرسوں نے کہا" ڈاکٹر صاحبہ جس سے صرف ایک فیصد زندگی کی امید ہے اس کے لیے اتنا کیوں کر رہی ہیں۔؟" اور صحیح جواب وہ خود بھی نہیں دے سکتی تھی کہ وہ اتنا آؤٹ آف داوے جا کر یہ سب کیوں کر رہی تھی۔ وہ بہت اچھی ڈاکٹر تھی مگر اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے اسے کسی نے حکم دیا ہو اس کا خاص خیال رکھو۔

وہ کسی کو بتا نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ کسی نے ڈائریکٹ آ کر اس لڑکی کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ یوں جیسے دل پر ایک الہام اترا تھا۔ اس کا بہت خیال رکھنا ہے۔ انسانوں کی بھیڑ میں یہ گم نہ ہونے پائے۔ وہ ڈاکٹر خود کو اپنے دل کے ہاتھوں بے بس پاتی تھی۔ وہ ایک دن میں کئی بار اپنے دوسرے مریضوں سے فارغ ہو کر اسے صرف ایک نگاہ دیکھنے کو بھاگی آتی۔ اسکی چلتی سانسوں کو سنتی۔ مشینوں پر نظریں جمائے رکھتی۔ پھر اپنے کام پر چلی جاتی۔

پھر پورے سات دنوں بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ ڈاکٹر تو ایک طرف اس کے لیے آنے والی نرسیں بھی حیرت اور خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ ایک معجزہ تھا۔ جو رونما ہو چکا تھا۔ جہاں پچاس فیصد کے مریض بھی بعض اوقات نہیں بچ پاتے۔ وہاں ایک فیصد والی نے آنکھیں کھول کر ان سب کو جذباتی کر دیا تھا۔

اس نے کمرے کے ارد گرد نگاہیں ڈالیں۔ کمرہ پھولوں سے بھرا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے کہیں قریب سے تعفن زدہ بو محسوس ہو رہی تھی۔ بہت ناگوار۔۔ ناقابل برداشت۔۔ اس نے میکانکی انداز میں ناک اور منہ ڈھانپا۔" تمہارے لیے میں نے پھول منگوائے ہیں۔ تمہیں انکی خوشبو پسند آئی۔" ڈاکٹر اس پر جھکی نرمی سے کہہ رہی تھی۔" یہاں اتنی بدبو کیوں ہے۔۔" اس کے بولنے پر ڈاکٹر کی مسکراہٹ دھیمی پڑی۔

" شروع میں ایسے ہی محسوس ہوگا۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے ہوگا۔ پھر ٹھیک ہو جائے گا۔"

" کیا میں زندہ ہوں؟" اس نے بے یقینی سے اپنے چہرے کو اب کے چھوا۔ جیسے دماغ اب بیدار ہوا ہو۔" ہاں تم زندہ ہو۔"

" کیا تم بھی زندہ ہو؟؟۔" اس نے ڈاکٹر کو بھی اسی حیرت سے دیکھا۔ حادثات کے بعد آپ ویسے نہیں رہتے۔ آپ کے اندر کا کم یا زیادہ حصہ ضرور متاثر ہوتا ہے۔ مریم کا پورا دماغ جیسے متاثر ہوا تھا۔ اسکے ذہن کی

سلیٹ جیسے بالکل صاف تھی۔ایک دم سے اور۔۔کہیں کوئی نقطہ تک نہیں تھا۔تھا بھی۔اور نہیں بھی۔۔

تھا بھی تو۔۔بہت دور۔۔مدھم۔۔اور بہت قریب کہ آنکھ کھولتے پہلا خیال ہی اسی کا تھا۔۔مگر یاد نہیں بھی تھا۔" ہاں تم زندہ ہو۔بچ گئی ہو۔اور تمہیں پتہ ہے تمہارے بچنے کی بس ایک فیصد امید تھی وہ بھی اس لیے کہ جب تمہیں لائے تھے تو تمہاری سانسیں چل رہی تھیں۔ورنہ یہ ایک فیصد بھی نہ ہوتی۔کیونکہ تمہاری حالت بہت خراب تھی۔معجزہ ہوا ہے۔۔میں اپنی آنکھوں سے اس معجزے کو دیکھا ہے۔"

اس ڈاکٹر نے اسے امید دلانی چاہی۔" معجزہ۔۔وہ کیا ہوتا ہے۔۔کیوں ہوتا ہے۔۔کیا موت کا نہ آنا معجزہ ہوتا ہے۔۔"

وہ ہولے سے بڑبڑائی۔اسکے ذہن کی سلیٹ خالی تھی۔کوئی منظر نہیں بن رہا تھا۔وہ کیا کہتی کیا سوچتی۔اس وقت ڈاکٹر نے اسے آرام کرنے دیا تھا۔لیکن ہوش میں آنے کے بعد کبھی اسے بہت زیادہ بدبو آنے لگتی کہ اسکی سانسیں اکھڑنے لگتیں۔کبھی اسے لگتا اسکے جسم پر کچھ چل رہا ہے۔کبھی کہیں ہاتھ رگڑتی کبھی کہیں۔ہاتھ کے چھوٹے سے زخم ٹھیک ہو چکے تھے۔پاؤں کا تھوڑا سا رہ گیا تھا۔اور جسم پر جو الرجی تھی وہ الگ۔۔اسے خود اپنی ذات ہی ناگوار لگنے لگتی تھی۔

اسکی ذہنی حالت اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔اسکے ذہن سے اسکی پچھلی زندگی جیسے مٹ چکی تھی کچھ یاد تھا تازہ تھا تو بس وہ کچرے میں گزری رات تھی۔رات تو بس ایک ہی گزاری تھی۔مگر وہ ہر روز جسم میں اس اذیت کو محسوس کرتی تھی۔آنکھیں بند کرتے بس وہی کچرے کا ڈرم نظر آتا اور خود کو اس میں پھسلتا دیکھتی۔رات کو دواؤں کے زیر اثر سوتی تو خواب میں خود کو بھاگتا دیکھتی اور کچرے میں گم ہوتا دیکھتی۔اسکی نفسیات بگڑنے کے دہانے پر آ چکی تھی۔ڈاکٹر جانتی تھی یہ بہت بڑا ٹراما تھا اس سے نکلتے وقت لگنا تھا مگر پھر سے اسے اب خود کو سنبھال لینا چاہیئے تھا۔اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جانا چاہیئے تھا۔

" دنیا میں ہر روز معجزے ہوتے ہیں۔صرف تمہارے ساتھ ہی نہیں ہوا۔۔"

" ہر روز کہاں۔۔"

" ہر روز۔۔دنیا بہت بڑی ہے۔۔ضروری نہیں اگر تمہاری آنکھ نے نہیں دیکھا تو وہ معجزہ نہیں ہوا۔تم نے

خود کو دیکھا نہیں تھا۔۔تم جس کچرے میں پڑی رہی تھیں۔۔وہ بہت پرانا کچرا تھا۔اس میں کیسی کیسی بلائیں نہ تھیں۔مگر تمہارے جسم پر صرف ان کیڑوں نے کاٹا جو قابل علاج ہیں۔۔تم بے ہوش تھیں۔اپنا دفاع نہیں کر سکتی تھیں مگر پھر بھی تمہارے کھلے منہ میں کچھ نہیں گیا تھا۔۔نہ ناک میں۔۔اور نہ آنکھ میں۔۔تمہیں نہیں لگتا کہ یہ معجزہ ہے اس کچرے نے تمہارے چہرے کو کوئی نقصان نہیں دیا۔۔سکارف ڈھیلا ہو چکا تھا۔۔مگر تمہارے کان میں کچھ نہیں گیا۔۔جیسے بلاؤں کے منہ سے زندہ بھاگ نکلی ہو۔۔انسانی دماغ ایک حد تک شدید بو برداشت کر سکتا ہے۔پھر اسکی طاقت ختم ہونے لگتی ہے۔۔اور وہاں ساری رات پڑے رہنے کے باوجود بھی تمہیں اپنا بچ جانا معجزہ نہیں لگتا۔۔" وہ اسے ڈپٹ رہی تھی۔بھلا اس ڈاکٹر کو کیا۔وہ جو بھی سوچے۔۔" کیا تم مسلمان ہو؟"

مریم نے ٹھنڈے لہجے میں سوال کیا۔۔

" نہیں۔۔تمہیں میرے مذہب سے مطلب نہیں ہونا چاہیئے۔۔کیا میری باتیں غلط ہیں؟؟"

" تم کون ہو جو معجزوں پر یقین رکھتی ہو۔۔کیا تم نے واقعی میڈیکل سائنس پڑھی ہے؟" اس نے تلخی سے ڈاکٹر کا مذاق اڑایا۔" مجھے افسوس ہو رہا ہے۔خدا نے تمہیں ایک فیصد چانس کے ساتھ دوبارہ زندگی لوٹا دی ہے اور تم اس کا شکر ادا نہیں کر رہی ہو۔ذرا سوچو تو اس نے اتنے برے حال کے باوجود بھی تمہیں کیوں زندہ رکھا؟ وہ تم سے کتنی محبت کرتا ہے۔۔"

" مجھے کبھی اندازہ ہی نہیں تھا کہ زندگی کا ہونا اس خدا کی محبت کی علامت ہے۔۔" اسکا ذہن ابھی بھی وہیں تھا۔ڈاکٹر اسے افسوس سے دیکھتی چلی گئی تھی۔

اور نجانے یہ ناراضگی تھی کیوں اور کس سے؟ اس نے اس رات ایک بار بھی تو اللہ سے مدد نہیں مانگی تھی۔کہ مجھے اس سے بچا لو۔۔اس نے اپنے آخری کلمات کہے تھے مگر مدد نہیں مانگی تھی۔ناراضگی کس بات کی تھی؟ کیا مدد مانگنے پر نہیں ملی تھی؟؟ یہ تو بن مانگے مل گئی تھی۔جس عزت کو وہ خود سے جڑے مردوں کی عزت سمجھ رہی تھی۔اور اس بات پر تسکین محسوس کرتی رہی تھی کہ دوسرے مردوں کی تعریف اس سے جڑے مردوں کے لیے تازیانہ ہے۔تو کیسا طمانچہ لگا تھا۔اسی عزت کو بچانے کے لیے وہ کچرے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی تھی۔عزت کی قیمت تو اسی رات معلوم ہو گئی تھی۔جس کے بچانے کے لیے وہ جان کی بھی بازی لگا گئی تھی۔اور وہ یہ سمجھتی رہی تھی

کہ وہ تو ان مردوں کی عزت تھی؟۔

"کیا واقعی عورت تب تک ہی عزت دار ہے جب تک کسی مرد سے جڑی رہے۔۔باپ، بھائی۔شوہر۔بیٹا۔۔ان سب مردوں کی عزت۔تو جن کے یہ رشتے نہیں ہوتے کیا وہ عورتیں عزت دار نہیں ہوتیں۔" آج وہ اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑی تھی۔

"تو جن عورتوں کی زندگی میں کوئی مرد نہ ہو۔ان کے نام کے آگے کسی مرد کا نام نہ ہو تو کیا وہ قابل عزت نہیں رہتیں۔۔بحثیت عورت اسکی ذات کوڑیوں کے مول ہے کیا؟؟۔" وہ اپنی سوچوں پر جتنا خود کو شرمندہ کرتی کم تھا۔ذہن کی سلیٹ بہت سے منظروں سے بھر چکی تھی۔اور اب اسے سب یاد بھی تھا اور سمجھ بھی آ رہا تھا۔اسکے دماغ میں دورائے پیدا ہو چکی تھی۔

بعض اوقات آپکی ذہانت بھی زندگی کے معاملات کو سلجھانے میں آپکی مدد نہیں کرتی۔اور کچھ لوگوں کی ذہانت بس کتابوں تک ہوتی ہے۔پڑھ لکھ کر محنت کر کے ٹاپ کر لیا۔جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔کہ نصابی کتابیں علم دیتی ہیں مگر انسانوں کی پہچان کے لیے عقل کی آنکھیں کھولنی پڑتی ہیں۔وہاں نصابی کتابیں کام نہیں آتیں۔

مریم نے ساری زندگی ان نصابی کتابوں کو پڑھا تھا۔اس نے دنیا کو اچھا دیکھا تھا۔اسے کیا معلوم تھا لوگ اگر دوستی کا کہتے ہیں تو اسکا مطلب جاں نثاری والی دوستی نہیں ہوتی۔اسکا مطلب اندھا دھند اعتبار نہیں ہوتا۔وہ جھوٹ نہیں بولتی تھی تو وہ سوچتی کہ کوئی کیوں جھوٹ بولے گا۔۔بھلا اس سے کسی کا کیا فائدہ۔۔وہ ٹاپر تھی۔۔مگر کیونکہ وہ دنیا کو اپنی اچھائی کی عینک لگا کر دیکھتی تھی۔اس لیے اتنی ذہانت کے باوجود بھی آستین میں چھپے سانپوں کی پہچان نہیں رکھتی تھی۔

گھر سے نکلنے سے پردیس آنے تک وہ خود کو بتاتی رہی اب اعتبار نہیں کرنا۔نہیں کرونگی۔۔نہیں کرتی۔۔کیا ہوا تھا۔۔دوستی اور اعتبار کے نام پر۔۔اب کی بار بھی اسے بیچا گیا تھا۔پچھلی بار بازار مختلف تھا۔اس بار مختلف۔۔مگر ہر بار اسے بیچنے والی چیز سمجھ کر اسکے ریٹ لگائے گئے تھے۔

حاشر کے گھر سے نکلنے سے لیکر وہ اب تک اس بات کو کبھی بیٹھ کر سوچتی کہ اسے کس نے پھنسایا تھا تو

آنکھوں کے سامنے ہاسٹل کے سب جانے پہچانے چہرے آنے لگتے تھے۔وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔۔نہیں وہ سب تو مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔۔غلط گمان کر کے میں انکی محبت کی توہین نہیں کر سکتی۔۔جن سے محبت ہو ان کے ساتھ ایسا کوئی نہیں کرتا۔اور اگر انہیں مجھ سے محبت نہ ہوتی تو مجھے کیوں کہتیں۔۔جن سے محبت نہ ہو انہیں کون کہتا ہے کہ ہمیں آپ سے محبت ہے۔۔وہ اس خیال کو رد کر دیتی تھی کہ کوئی اسکی جان پہچان والا ایسا کر سکتا تھا۔وہ مریم عالم تھی اندھا اعتبار کرنے والی۔۔تم سے محبت ہے جیسے جملے کو سن کر سچ سمجھنے والی۔۔کہ جنہیں محبت نہیں ہوتی وہ ایسے اظہار نہیں کرتے۔۔

کاش کہ کوئی آتا اور اس شہزادی کو نیند سے اٹھاتا اسے بتاتا کہ بھلے تمہاری راجدھانی میں ہر جانب محبتوں کا رواج تھا۔مگر یہ رواج محل کی دیواروں تک ہوتے ہیں ہر محل کی بھی نہیں۔۔وہ خوش قسمت تھی کہ وہ محبتوں کے سائے اور اعتبار کے سائے میں پروان چڑھی تھی۔۔باہر کی دنیا میں ایسے محبت بھری باتیں اکثر جھوٹ نکلتی ہیں۔وہاں ایسے ہی آنکھیں بند کر کے نہیں رہا جاتا۔آنکھیں کھول کر دوست بنائے جاتے ہیں۔ہر شخص کو اپنا ساتھی چن کر اپنے پہلو میں نہیں بٹھایا جاتا،،آہ کاش۔۔کوئی اسے سمجھاتا۔۔نیند سے جگاتا۔۔

اسکی پہچان میں کرسٹینا ہی پہلا دھوکہ تھی۔اسکے منہ سے سب اعتراف سنے تھے۔اور اگر نہ سنتی؟؟وہ ہر ممکن بات سوچتی مگر یہ کبھی نہیں کہ اسے دوست سمجھنے والی کرسٹینا اسکے ساتھ ایسا کر سکتی ہے۔

جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔پچھلے مجرم کو وہ نہیں جانتی تھی مگر اب کی بار مجرم کو جانتی تھی۔اس بات نے اسے زمین پر لا پٹخا تھا۔ہاں لوگ اعتبار توڑتے ہیں۔وہ جھوٹے اور دغا باز ہوتے ہیں۔۔وہ خود غرض ہوتے ہیں۔۔وہ پیسوں کے لیے دوستوں کے سودے کرتے ہیں۔۔حاشر کے گھر سے نکلنے سے پردیس تک زندگی کا رخ اور تھا۔زندگی دراصل اب بے رحم ہوئی تھی۔۔بہت بے رحم۔۔

ڈاکٹر کو اس نے منت سماجت کر کے پولیس کو اطلاع دینے سے روکا تھا۔پہلے دو دن وہ اسکی ذہنی حالت کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتی رہی۔پھر مریم نے اسے منع کر دیا تھا۔اس نے اپنے بیگ کا پوچھا تو ڈاکٹر نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔پھر نرسوں کو بلا کر پوچھا تو ایک بول پڑی تھی۔۔لیپ ٹاپ موبائل اسے ضرورت تھی وہ خود استعمال کر رہی تھی۔ڈاکومنٹس محفوظ تھے۔مریم کو غصہ آیا تھا۔وہاں ہاسٹل میں بھی تو اس سے انجان لوگ ایسے موبائل لیپ

ٹاپ لے جاتے تھے کہ کہ یہ دن دیکھنا پڑ گیا تھا۔پھر وہ ڈاکٹر خود اپنی گاڑی میں چھوڑ گئی تھی۔فجی میں پاکستانی قونصلیٹ اسی شہر 'سوا' میں تھا۔'Suva'

ساڑھے تین گھنٹے کے اس سفر میں وہ ڈاکٹر اسے مسلسل سمجھاتی رہی۔زندگی کی اہمیت پر اسے لیکچر دیتی رہی۔مریم خاموشی سے سب سنتی رہی۔اسکے ذہن میں کوئی بھی سوچ ٹک نہیں رہی تھی۔وہ ایک ہی نقطہ پر اپنے دماغ کو مرکوز نہیں کر پا رہی تھی۔

سارا راستہ سمندر کا ساتھ رہا تھا۔وہ جیسے کناروں پر سفر کر کے اس شہر جا رہی تھی۔کوئینز روڈ سے یہ سفر ساڑھے تین گھنٹے کا تھا۔مریم سارا راستہ گود میں رکھے ہاتھوں کو تکتی رہی۔اوران ساڑھے تین گھنٹوں میں کوئی دس دفعہ اسے محسوس ہوا تھا کہ اسکے جسم پر کچھ رینگ رہا ہے۔پہلے ایک دو بار اس نے ان نادیدہ کیڑوں کو جھاڑنے کی کوشش کی تھی۔پھر ڈاکٹر کی وجہ سے ضبط کیے رہی۔کہیں اسے پاگل سمجھ کر یہیں بیچ راستے نہ اتار دے۔

مریم کے بیگ میں اس وقت صرف اسکی فائل،موبائل اور لیپ ٹاپ تھے۔سوٹ ایک بھی نہیں بچا تھا۔اور پیسے؟؟سوائے اپنی دعاؤں اور اپنی امیدوں کے اب کوئی سہارا نہیں تھا۔

وہ اسے پاکستانی قونصل خانے کی عمارت دکھا کر چلی گئی تھی۔ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ اس عمارت کے سامنے بیٹھی رہی۔اس عمارت کے اندر ایک حصے میں اسکے ملک کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔اصولاً کسی بھی ملک کی ایمبسی یا قونصلیٹ اسی ملک کی زمین کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔یعنی وہاں اس عمارت کے جس حصے میں قونصل خانہ تھا۔وہاں رہتے پاکستانیوں کے لیے وہ بھی پاکستان تھا۔وہ ڈر رہی تھی کہیں اسکے جرم کی وجہ سے اسے مطلوب تو قرار نہیں دے دیا گیا تھا۔اور وہاں جاتے ہی وہ پکڑی جاتی۔یہ ایک فضول سوچ تھی۔وہ کوئی اشتہاری مجرم نہیں تھی۔لیکن اسے ایسے ہی لگتا تھا جسے پورے پاکستان کی پولیس اسکے پیچھے تھے۔اسکے ابو ،بھائی۔۔اور اب اس ملک کی پولیس۔اسکی ذہنی حالت کی مخدوشی کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا۔اسے بیان کرنے کو الفاظ کم تھے۔

وہ ایک طرف زمین پر بیٹھی بس اسی عمارت کو تکے جا رہی تھی۔یہیں کہیں اسکے ملک کا ایک ٹکڑا تھا۔اسے

امان چاہیئے تھی۔ مگر اسے امان وہاں بھی نہ ملتی۔

اس نے ابھی بھی اسی رات والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ نیلی جینز، وائٹ شرٹ۔ جسکا ریڈ کالر تھا۔۔ یہ اسکا فیکٹری میں یونیفارم تھا۔ اور اسکا بلیک لانگ کوٹ۔ جنہیں ہاسپٹل کے عملے نے دھو کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ ہاسپٹل کے کپڑے چینج کر کے اس نے وہی کپڑے پہن لیے تھے۔ وہ کوئی اور سوٹ پہننا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے بیگ میں ایک بھی نہیں تھا۔ ان کپڑوں کو دیکھ کر اسکے اندر عجیب سا ڈر جاگنے لگا تھا۔ اور پہننے کے بعد کتنی ہی دیر ان سے بو آتی رہی۔ وہ ضبط کیے رہی۔ پھر آہستہ آہستہ بو ختم ہو گئی تھی۔ جب اسے ہاسپٹل لایا گیا تھا تو اسکے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ پھر اس ڈاکٹر نے اسے اپنی ایک چپل دی تھی جو اسکے پاس ہاسپٹل میں رکھی تھی۔ اور اسکا سکارف وہ بہت گندا ہونے کی وجہ سے پھینک دیا گیا تھا۔ پاؤں میں چپل اور سر ننگا۔۔ اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ہولے سے ہاتھ پیچھے کر کے بالوں کا جوڑا کھول لیا تھا۔ بال کھل کر کانوں کو ڈھانپ گئے تھے اور اسکے گالوں کو بھی آدھا چھپا دیا تھا۔ اس وقت بس یہی ہتھیار تھا سردی سے بچنے کو۔۔ نومبر کے شروع ہوتے ہی گرمیوں کا آغاز ہو جانا تھا۔ یہ ستمبر کا وسط تھا۔ سردی تھی۔ مگر اسے بہت زیادہ لگ رہی تھی۔ اتنی کہ اسے لگ رہا تھا وہ فریز ہونے والی ہے۔ اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر ایک دو لوگوں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ گھٹنوں میں منہ چھپا گئی۔ اب اسے اگر کسی سے نفرت تھی تو انسانوں سے تھی۔ اب اسے کسی انسان کی جھوٹی ہمدردی نہیں چاہیئے تھی۔ سب جانور تھے۔ کمزور کو کھا جانے والے۔۔

اس عمارت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ وہ گھٹنوں پر چہرہ ٹکائے انہیں دیکھتی رہی۔ اس میں ہمت نہیں ہوئی کہ اٹھ کر اس کے اندر جائے۔ دوپہر سے شام ہو گئی تھی۔ مغرب کے بعد کا اندھیرا اتر چکا تھا۔ سٹریٹ لائٹس آن ہو چکی تھیں۔ لوگوں کا رش بڑھ گیا تھا۔ کچھ گھروں کو جا رہے تھے۔ کچھ دوستوں کے ساتھ باہر موج مستی کو نکلے تھے۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

اردگرد کے ریستورانوں سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے اسے احساس دلایا کہ اسے بھوک لگی تھی۔ مگر اسکے پاس پیسے نہیں تھے کہ کچھ خرید کے کھاتی۔ وہ لب بھینچے سر جھکائے اس عمارت کے اردگرد چلتی رہی۔ ایک ہی جگہ بیٹھنے سے اب سب کی توجہ کا مرکز بن رہی تھی۔ اس نے سٹریٹ کا نام یاد کر لیا تھا۔ وہاں سے مڑ کر دوسرے

روڈ پر آ گئی تھی۔ پھر الٹا چکر لگا کر پھر سے اس عمارت کے سامنے آ کھڑی تھی۔ پھر رات گئے وہ ایسے ہی کبھی ایک طرف جاتی کبھی دوسری طرف۔ بھوک اور بیماری کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بمشکل ایک قدم رکھتی اور پھر خود کو سنبھالتی۔ جہاں تھکتی وہاں فٹ پاتھ پر ایک طرف بیٹھ جاتی۔ انسانوں کی اس بھیڑ میں وہ اکیلی تھی۔ تنہا اور لاوارث۔۔ رات گئے جب رش کم ہوا تھا وہ پھر سے اسی عمارت کے سامنے آ بیٹھی تھی۔ اب دوسری جگہ پر بیٹھی تھی۔ اردگرد کی دکانیں، آفسز سب بند ہو چکا تھا۔ آکلینڈ سٹریٹ پر اکا دکا لوگ تھے۔ وہ اندھیرے میں بیٹھی تھی۔ اس لیے کسی کی اس پر نظر نہیں گئی تھی۔ رات کے اس وقت سردی کا زور بڑھ چکا تھا۔ اور سمندر قریب ہونے کی وجہ سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ سکڑ کر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

اسے اپنا گھر یاد آ رہا تھا۔ وہاں کبھی بھی اتنی سردی نہیں لگی تھی۔ زندگی تو بس گھر کی چار دیواری میں ہی ہوتی ہے۔ وہ چاردیواری کیا گئی تھی۔ اسکے لیے تو زندگی ہی ختم ہو گئی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی لاوارث رات گزار رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا ابھی آگے ایسی بہت سی راتیں آنی تھیں۔ جو اس رات سے بھی بدتر ہونی تھیں۔

اسے نیند آ رہی تھی۔ مگر بھوک کی وجہ سے پیٹ میں درد تھا۔ جسم میں نقاہت تھی۔ اور جسم پر رینگتے کیڑے۔۔ نیند آ کر بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس نے تھک کر گھٹنوں میں سر دے لیا تھا۔

☆......☆......☆

تنگی والی رات تھی مگر گزر گئی تھی۔ سویر کی چہل پہل کے ساتھ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک قریبی شاپنگ سٹور میں جا کر واش روم استعمال کیا تھا۔ پھر دوبارہ اپنی جگہ پر آ گئی تھی۔ گزری رات اسے زندگی کے نئے سبق پڑھا گئی تھی۔ کوشش کے بغیر ہار نہیں ماننی۔۔ کیا معلوم یہ لوگ مجھے نیا پاسپورٹ بنا دیں۔ (پرانا تو فیکٹری مالک کے پاس تھا۔)

جب دن پوری طرح نکل آیا تھا تو وہ خود کو وہاں اندر جانے کے لیے تیار کر رہی تھی۔ پھر گیارہ بجے وہ ہمت کر کے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی عمارت کے اندر داخل ہوئی۔ اسے اپنی دھڑکن کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ٹانگیں بے جان سی ہو رہی تھیں مگر یہ اسے خود کرنا تھا۔ خود کو بچانے کے لیے۔۔ اپنے بیگ کو سینے سے لگائے وہ قونصلیٹ آفس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ چند لمحوں کے لیے گہری

سانسیں لیں۔پھر اندر داخل ہوگئی تھی۔سامنے کچھ لوگ ڈیسک کے پیچھے بیٹھے کام کرتے نظر آئے۔اسکے ہم وطن ۔۔پردیس نے ہم وطنوں کی اہمیت اچھے سے سمجھا دی تھی۔اسکی آنکھیں نم ہوئی۔ہاں انسانوں کی بھیڑ میں سب جانور تھے مگر وہ تو اسکے اپنے تھے۔وہ اسے اس مصیبت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔اس کا دل پھر سے خوش فہم ہوا لمحوں میں ان کے چہرے دیکھ کر امیدیں باندھ لی تھیں۔بے وقوف مریم۔۔

"میں نے نیا پاسپورٹ بنوانا ہے۔میں پاکستانی ہوں۔میرا پرانا پاسپورٹ گم ہوگیا ہے۔" وہ ایک جانب ایک ڈیسک کے سامنے کھڑی بول رہی تھی۔اسکی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔اسکا دل چاہا وہ اسے بیٹھنے کی آفر کرے۔"بیٹھیں محترمہ۔اپنا تعارف کروائیں۔" اور تعارف پر وہ اسے گھورتا ایک دوسرے کمرے میں بنے آفس میں لے آیا تھا۔وہاں ایک افسر کرسی کے پیچھے بیٹھا عینک لگائے کوئی کاغذات دیکھ رہا تھا۔پھر اسکے تعارف پر وہ بھی سیدھا ہو بیٹھا تھا۔اسکے بعد اسکی خوب کلاس لی گئی تھی۔نادی پولیس اسکے فیکٹری کے مالک سے پاسپورٹ لے کر یہاں انہیں ثبوت دکھا گئی تھی کہ آپکی شہری ہمارے شہری کے ساتھ اتنا برا سلوک کر کے گئی ہے۔اب وہ انہیں مطلوب تھی۔پولیس کے ساتھ ساتھ اسکے قونصل خانے والے بھی اسے اس شہر میں ڈھونڈتے رہے تھے۔یہ صرف اسکی خوش قسمتی تھی کہ جہاں سے اسے ہسپتال لے گئے تھے وہاں سی سی ٹی وی کیمرے نہیں لگے تھے۔وہ رات کے اندھیرے میں اندھیری گلیوں سے نکل کر روڈ پر آئی تھی۔اس لیے اسکا سراغ نہیں ملا تھا۔خود قونصل خانے والے حیران تھے کہ وہ لڑکی گئی تو کہاں گئی تھی۔جاتے وقت اپنے وجود کا ہر ثبوت مٹا گئی تھی۔کیا واقعی وہ کوئی عادی مجرم تھی۔حالانکہ یہ صرف اتفاق تھا کہ اسکی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں رہا تھا۔ورنہ سب سے پہلے تو اسے وہ مافیا والے ہی ڈھونڈ نکالتے۔

پھر مریم انہیں آنسو ضبط کرتے اپنی کہانی سناتی رہی۔" کیا ہی بے وقوف لڑکی واقع ہوئی ہیں آپ۔۔کوئی ایسے بھی کسی کا اعتبار کرتا ہے۔اور اتنے دن رہیں اس لڑکی کے رنگ ڈھنگ سے نہیں لگا کہ وہ مافیا سے ڈیلنگ کرتی ہے۔عورتوں کی حس تو اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے۔کیسی عورت ہو تم۔۔" قونصلر پھٹ پڑا تھا۔" تمہاری وجہ سے یہاں رہتے سب پاکستانیوں کی عزت داؤ پر لگ گئی۔پہلے وہ خبیث لوگ آتے تھے۔جھوٹے بابوں کا ڈھونگ رچا رچا کر عوام کے پیسے کھا کر بھاگ جاتے تھے۔اور فجی کی عوام جب ان کی

شکایت درج کرتی تو پہلی بار اس انسان کی شکایت تھی۔ مگر تیسری بار وہ پورے پاکستانیوں کی شکایت تھی۔ پہلے جو پاکستانی بغیر ویزے آجاتے تھے۔اس کی مہربانی سے اب پاکستانیوں کو ویزہ لے کر آنا پڑتا ہے۔کیوں کہ پاکستانی اس قابل نہیں کہ انہیں اعتماد کے ساتھ اپنے گھر میں بنا پوچھ گچھ کے داخل کر دیا جائے۔ پتہ نہیں کیوں تم لوگ اتنے خودغرض ہوتے ہو بس اپنا کام نکلوا لیا بھلے تمہارے عمل سے پوری قوم اور ملک کا نام ہی خراب ہو جائے تمہاری جوتی کو بھی پروا نہیں ہوتی۔" مریم کے آنسو ٹھٹھر گئے تھے۔وہ ہکا بکا انہیں دیکھ رہی تھی۔" چند پاکستانی ہی رہتے ہیں یہاں۔۔تمہیں کیا لگا تم جرم کر کے بھاگ جاؤ گی تو پتہ بھی نہیں چلے گا۔۔"

" جرم میں نہیں کیا۔۔میرے ساتھ یہاں ظلم ہوا ہے۔یہاں کے شہری نے میرے ساتھ ظلم کیا ہے۔مظلوم میں ہوں۔یہ نہیں۔۔" وہ صدمے سے بولی۔پھر چند لمحے وہ اسے دیکھتے رہے۔" ٹھیک ہے۔میں اس پولیس کیس کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔اس لڑکی کو مرنے کی حد سے ذرا ادھر چھوڑا گیا ہے۔ابھی بھی اسکی حالت نہیں سنبھلی۔اگر جو مافیا کا ہی کام ہے تب بھی تمہارے پاس اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔لڑکی کو لانے والے نے کہا وہ اس کا گواہ ہے اور لڑکی نے بھی ہوش میں آکر تمہارے خلاف سٹیٹمنٹ دیا ہے۔ بتاؤ اب کیا کیا جاسکتا ہے۔"

" مجھے پولیس کے پاس نہیں جانا۔۔میں نے کچھ نہیں کیا۔۔میرے پاس کبھی بھی اپنی بے گناہی کے ثبوت نہیں رہے کیونکہ مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ میرے ساتھ رہنے والا مجھے دھوکہ دینے لگا ہے۔۔۔"

" یہاں پاکستان سے اتنی دور تمہیں گھر والوں نے آنے کیسے دیا۔چلو آ بھی گئی۔۔گھوم پھر بھی لیا۔۔پھر چلی جاتی یہاں ویزے کے لیے اپلائی کرنے کو کس نے کہا تھا۔پاکستان میں نوکریاں نہیں ملتیں کیا۔۔" وہ اسکی ابو کے عمر کے تھے۔اور ابو بن کر ہی غصہ کر رہے تھے۔"اگر پاکستان میں ہی رہ سکتی تو یہاں کبھی نہ آتی۔۔ہر انسان کو اپنے حالات کا پتہ ہوتا ہے۔مجھے اب اس ملک سے نکلنا ہے۔آپ کسی اور نام سے میرا پاسپورٹ بنوادیں۔مجھے یہاں نہیں رہنا۔۔" وہ ناراضگی سے بول رہی تھی۔پھر بہت دیر وہ اسے قانونی باتیں سمجھاتے رہے۔وہ سر جھکائے سنتی رہی۔دو گھنٹے بعد وہاں سے نکل آئی تھی۔انہیں کہا تھا کہ ان سے خود رابطہ کرے گی۔یہ نہیں کہہ سکی تھی کہ رابطے کی جگہ نہیں رہی۔میں گلیوں میں رہتی ہوں۔اور میرے پاس کھانے کو بھی کچھ نہیں

ہے۔۔نہ سر ڈھکنے کو کپڑا۔۔وہ نہیں کہہ سکی تھی۔۔اسے بے عزتی محسوس ہو رہی تھی۔وہاں سے نکل کر اس کا دل چاہا کہیں جا کر خودکشی کر لے۔کم از کم ایسی زندگی تو چھٹکارا مل جاتا۔مایوسی کی آخری حد پر تھی۔

چلتے پھرتے وہ بیچ کی طرف آنکلی تھی۔وہ جس جانب آئی تھی۔وہاں عموماً کوئی نہیں ہوتا۔وہ ایک سنسان بیچ تھا۔اس وقت وہ دنیا کے آخری کونے پر کھڑی تھی۔اور وہاں کھڑی واحد انسان تھی۔اس سے آگے بے انت سمندر تھا۔اس کونے سے آگے پھر کوئی انسانی آبادی نہیں تھی۔اگر تھی بھی تو بس چند انسانوں پر مشتمل۔

لامحدودیت کیا حساس نے اسکے دل پر رعب طاری کر دیا تھا۔لہریں اچھل کود کر رہی تھیں۔پانی کا شور اس ویرانے میں گونج رہا تھا۔وہ ذرا فاصلے پر کھڑی ان پانیوں کو تکتی جا رہی تھی۔خدا ہی جانتا تھا یہ پانی کہاں جا ملتا تھا۔اسکا کنارہ کہاں تھا۔وہ جو وہاں اس کنارے خودکشی کا سوچ کر آئی تھی کہ خود کو ان لہروں کے سپرد کر دوں گی۔۔اور ایسی زندگی سے جان چھڑا لوں گی۔۔پانی کو دیکھتے اسکے دماغ میں سوچوں کی لہریں اُمڈ رہی تھیں۔

"اگر میں یہاں اس پانی میں کود جاؤں تو کسی کو معلوم بھی نہیں ہو سکے گا کہ میں مر گئی۔" اس سوچ نے دماغ پر عجیب اثر ڈالا تھا۔

"کسی انسان کو یاد نہیں رہونگی۔مگر اس خدائے واحد کو معلوم ہو گا۔ہاں صرف اسے ہی۔۔میرے وجود کو بس وہی یاد رکھے گا۔کہاں ڈوبا۔۔کس جانور نے کھایا اور۔۔"اس کا دل بھر آیا تھا۔"سب بھول جاتے ہیں۔وہ تو نہیں بھولتا۔کروڑوں کی بھیڑ میں بھی نہیں بھولتا۔۔بس وہی ایک سچا اور مخلص ساتھی ثابت ہوتا ہے۔جو مرنے کے بعد بھی آپکی خبر رکھتا ہے۔" اسکے آنسو بہنے لگے تھے۔وہ روتے روتے بیٹھ گئی تھی۔اسکے کھلے بال تیز ہوا سے اڑ رہے تھے۔" مجھے کیوں نا انسانوں کی پہچان ہو سکی؟؟۔۔کیوں؟؟۔۔سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔۔اور آپ میرے لیے معجزے کرتے رہے۔۔اوہ۔۔میرے اللہ۔۔میری بد نصیبی کے دنوں میں میرے لیے خوش قسمتی پیدا کرتے رہے۔۔برے دنوں کو بد ترین ہونے سے بچاتے رہے۔۔" بے انت پانیوں کے شور میں اسکے رونے کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔

"لوگوں کی مجھے ختم کرنے کی سر توڑ کوششوں کے آگے میرے لیے ڈھال بناتے رہے۔کبھی کون تو کبھی کون۔۔اپنے ملک میں ساتھ رہنے والوں نے لوٹ لیا اور یہاں آپ مجھے انجان ڈاکٹر سے محبت دلواتے

رہے۔۔میرے اللہ۔۔" وہ بال مٹھیوں سے پکڑے روئے جا رہی تھی۔" میں بھوکی ہوں۔ پیاسی ہوں۔ بے گھر ہوں۔بے سہارا ہوں۔اکیلی ہوں۔کئی دشمنوں میں گھری ہوں۔دوست دشمن کی پہچان نہیں رکھتی۔۔" وہ اپنے دل کے زخم کھول رہی تھی۔کسی چھوٹے بچے کی مانند بلکتے ہوئے رو رہی تھی۔کتنی دیر رونے کے بعد اسکی سوچوں نے سمت بدلی تھی۔

" مگر پھر بھی میں آپ پر یقین رکھتی ہوں۔جو رب اس بے انت سمندر میں میری ہونے والی موت کو یاد رکھے گا وہ مجھے کروڑوں کے مجمع میں نہیں بھولے گا۔۔میں نے آپ پر یقین کیا اللہ۔۔سب ساتھ چھوڑیں گے آپ نہیں چھوڑیں گے۔۔میرے سب دردوں کو ایک ایک کر کے ختم کریں گے۔۔مجھے آپ پر یقین ہے۔۔" وہ لامحدودیت کے رعب تلے خود کو ایک چھوٹے سے زرے سے بھی کمتر سمجھ رہی تھی۔اس لا محدودیت نے اس مشکل وقت میں اسکے دل میں ایمان کو اور مضبوط کر دیا تھا۔

آج بھی تو دو آپشن تھے۔یا اس سمندر میں ڈوب کر مر جاتی۔۔کسی کو اسکی وجہ سے شرمندگی نہ اٹھانی پڑتی نہ پاکستان میں رہتے رشتے داروں کو نہ پردیس میں رہتے پاکستانیوں کو۔۔اور دوسرا راستہ صبر کا تھا۔اور اپنی جنگ پھر سے خود اکیلے لڑنے کا تھا۔اور وہ جانتی تھی برے وقت میں سوائے اپنی ذات کے اور کوئی ہتھیارِ جنگ نہیں ہوتا۔خود آپ ہی اپنے کام آسکتے ہیں۔اپنی زبان کو اپنے لیے خیر بنا کے۔۔اپنے عمل کو اپنے لیے خیر بنا کے۔۔اور اپنی عقل کے بند پردوں کو ہٹا کے۔۔اس دنیا میں آپ پھر سے 'وجود' حاصل کر سکتے ہیں۔یہ سب بہت صبر آزما تھا۔اگر اتنا صبر تھا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت من چاہے نتیجے کو نہیں روک سکتی تھی۔وہ مر جانے کی خواہش لیے اس آخری کنارے آئی تھی۔مگر اب وہاں سے اپنی عقل کے بند پردوں کو کھول کر خیر لیے جا رہی تھی۔اسے لڑنا تھا۔اکیلی تھی۔پھر بھی اپنے وجود کے لیے لڑنا تھا۔۔کسی کے لیے اہم نہیں تھی۔۔اپنے خدا کے لیے تھی کہ وہ اسکے لیے معجزے کر رہا تھا۔تو وہ اپنے لیے بھی اہم ہونی چاہیئے تھی۔اب پوری دنیا بھی کھڑی ہو کر کہتی تم مجرم ہو وہ اکیلی کھڑی ان سب کا صبر سے مقابلہ کر سکتی تھی۔ہاں وہ کر سکتی تھی اور کرنے والی تھی۔۔کہ برے اور مشکل دن تو اب آنے تھے۔۔ایمان لانے کے بعد آزمائے جانے کے دن۔۔

☆......☆......☆

ڈھلتی شام سے پہلے وہ پھر وہاں گئی تھی۔ وہ اسکے کیس کو فالو کر رہے تھے۔ اور کیونکہ کرسٹینا کی حالت ابھی بھی نازک تھی۔ تو یہ مشکل بہت بڑی تھی۔ قتل کا گناہ سر آنے والا تھا۔ اس آفیسر نے صاف لفظوں میں اسے سب بتا دیا تھا۔ بس اسکی اتنی مہربانی تھی کہ اسے ہم وطن سمجھ کر اسکی باتوں پر اعتبار کر کے اسے پولیس کے حوالے نہیں کیا تھا۔ پولیس کو بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ انکے پاس آئی تھی۔

اگر اس لڑکی کے سر قتل کا الزام آ جاتا تو بنا جرم کے کئی سال اس پر قید آ جانی تھی۔ آفیسر اس سے تو سخت لہجے میں بات کرتا رہا مگر خود دل میں بہت پریشان تھا۔ وہ لڑکی سچی لگتی تھی اور دوسری طرف۔۔

پھر اس نے مریم سے نئے پاسپورٹ کی فیس مانگی تو وہ رو دینے کو ہوئی۔ "میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"تو میں کیسے تمہارا کام شروع کرواؤں؟ جب تمہاری پاس پیسے ہی نہیں ہیں۔۔ بتاؤ کس بنا پر۔۔"

"میرے پاس آپ کو دینے کے لیے صرف اللہ کا نام ہے۔ اسی کے لیے میرا کام کر دیں۔ آفیسر کی ماتھے کی رگیں پھڑکنے لگی تھیں۔" کوئی چیریٹی ہو رہی ہے یہاں۔۔ اتنی اوقات نہیں تھی تو یہاں اس ملک میں آئی کیوں تھی؟۔۔" جب کہ وہ شرمندگی سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار کچھ مانگ رہی تھی اور وہ بھی اللہ کے نام پر۔ نئی پہچان چاہیے تھی اللہ کے نام پر۔ لیکن ہمارے ہاں پھر یہ نام اتنا قیمتی نہیں سمجھا جاتا کہ اس نام پر مانگنے والے کو دے ہی دیا جائے۔ ہر شخص کی اپنی چوائس ہوتی ہے۔ کسی کے لیے اس نام کا سن لینا کافی ہوتا ہے۔ اور وہ سب دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ کسی کے لیے اس نام کا احساس کافی ہوتا ہے اور بن مانگے ہی اس کے نام کے احساس کے ساتھ دیے جاتا ہے اور کچھ لوگ۔۔۔ ان کے دل میں نہ احساس ابھرتا ہے نہ نام لیے جانے پر اندر ہلچل ہوتی ہے۔ خدا جانے کیسے جیتے ہیں وہ اتنی سختی کے ساتھ۔

مریم آج کی رات بھی باہر تھی۔ اب وہ قونصلیٹ کی عمارت سے ٹیک لگائے اسکے اندھیرے کونے میں بیٹھی تھی۔ یہیں اندر اسکے ملک کا ایک ٹکڑا تھا۔ دنیا سے پرے ایک زمین کا ٹکڑا۔۔ جہاں شاید اسکے لیے امان تھی۔ آج بھی وہ بھوکی تھی۔ مگر پھر بھی سر جھکائے وہیں بیٹھی رہی۔ اسے مانگنے کی عادت کب تھی کہ اٹھ کر کسی سے کہتی مجھے بھوک لگی ہے کچھ کھانے کو دو۔ اسی خدا کے نام پر ہی سہی جس خدا کو مانتے ہو۔ مگر خدا کے لیے مجھے کچھ کھانے کو دو۔ وہ خاموشی سے پڑی رہی۔ اگلے دن وہ نقاہت سے آنکھیں بھی نہیں کھول پا رہی تھی۔ جسم

کی الرجی ابھی تک نہیں گئی تھی کہ اسکے پاس علاج کے پیسے نہیں تھے۔ڈاکٹر تو سمجھ رہی تھی اپنے لوگوں میں جا رہی تھی۔ٹھیک ہی رہتی۔مگر بنا دوائیوں کے رہ رہی تھی۔صبح کے سویرے میں وہ کسی معذور کی طرح اٹھ کر وہاں سے دور جا بیٹھی تھی اسطرح کہ اپنا پاکستان نظروں کی حدود میں تھا۔مگر یہاں وہ کسی کی نظروں میں نہیں تھی۔بس اکا دکا بندہ گزرتے ہوئے ایک نظر ڈال لیتا۔پھر شام کے اندھیرے میں وہ اس عمارت کے ساتھ آ بیٹھی تھی۔

رات کی رونقیں تھیں۔ہر طرف خوشی تھی۔مگر اسکی طرف اسکا احساس بھی نہیں تھا۔وہ بند ہوتی آنکھوں کو نیم وا کر کے دیکھتی اور پھر تھک کر آنکھیں موند لیتی۔

ابھی رات کی شروعات تھی۔اس سردی میں اس عمارت کے آگے ایک گاڑی رکی تھی۔مریم نے آواز پر بند آنکھیں کھولی تھیں۔ایک شاندار عورت اس سے اتر رہی تھی۔قیمتی لباس تھا۔اور ہاتھ میں پکڑے قیمتی پرس سے موبائل نکال کر اسے کان سے لگا لیا تھا۔بولتے ہوئے ارد گرد دیکھ رہی تھی۔

مریم جو قدرے اندھیرے میں تھی۔پاس سے گزرتی ایک گاڑی کی لائٹس نے اسکے وجود کو روشن کر کے واضح کیا تھا۔اور اس خاتون کی نگاہ اس پر پڑ گئی تھی۔وہ حیرت سے پھر سے اندھیرے میں جاتی اس جگہ کو دیکھنے لگیں۔پھر موبائل کو دوبارہ پرس میں ڈال کر تجسس سے وہاں گئی تھیں۔" کون ہو تم۔۔"اسکے سر پر کھڑے وہ سوال پوچھ رہی تھیں۔مریم نے سر اٹھا کر دیکھا۔وہ شلوار قمیض میں تھیں۔یعنی اسکی ہم وطن۔۔

"میں مریم ہوں۔۔" اس نے پورا زور لگا کر اپنی آواز نکالی تھی۔

"یہاں ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ پاکستانی ہو؟" وہ تشویش سے اسے دیکھنے کو جھک گئی تھیں۔

"ہاں پاکستانی ہوں۔اور جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔سوائے اس دیوار کے جو میرے ملک کے ایک ٹکڑے پر بنی ہے۔۔"

اس عورت کو اسکی بات نے پریشان کر دیا تھا۔یہاں چند ہی تو پاکستانی تھے۔اور وہ بھی اتنے برے حال میں ہوں تو فائدہ کیا تھا یہاں رہنے کا۔پھر وہ اسکا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی تھیں۔مریم نے دیکھا وہ قونصلیٹ میں داخل ہوئی تھیں۔" مجھے اب ان لوگوں سے کوئی مدد نہیں چاہیئے۔" وہ کسی بچے کی مانند ناراضگی سے بولی۔" کیا کیا ہے ان لوگوں نے؟" وہ حیران ہوئیں۔

"اس وقت قونصلیٹ میں ایک افسر تھا اور وہ اسکی بیوی اسے لینے آئی تھی۔" میرا پاسپورٹ گم ہو گیا ہے۔ نیا نہیں بنا کے دے رہے۔" اسکی آواز اسکی سانسوں کی طرح مدھم ہونے لگتی۔ بس پہلا لفظ ہی بلند ہوتا پھر طاقت ختم ہونے لگتی۔

"چلو میرے ساتھ۔۔ دیکھتی ہوں کیا مسئلہ ہے۔" پھر شوہر کی ٹیبل کے سامنے وہ اسکا کیس لڑ رہی تھیں۔ مریم حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑی شدومد سے اس کا کیس لڑ رہی تھیں۔ کیوں؟ پھر اسے اپنی ڈاکٹر یاد آئی۔ جب جب اس پر ناقابل برداشت مصیبت آئی وہ اللہ کیسے اسکے لیے مدد بھیج دیتا تھا وہاں سے جہاں سے امید بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ افسر اسکی ساری کہانی بیوی کو سنا رہا تھا۔ اور وہ پوچھنے لگیں کہ وہ پاکستان کیوں چھوڑ آئی تھی۔ چلو آ ہی گئی تھی تو اب کہیں اور کیوں جانا تھا پاکستان کیوں نہیں۔ اور مریم نے نگاہیں جھکا کر کہا تھا کہ وہ غیرت کے نام پر قتل کے لیے مطلوب تھی۔ اس عورت کی ہمدردی اور بڑھ گئی تھی۔ اور پھر چار بیٹوں کا فخر شوہر کو سنا رہی تھیں۔ اور پیسوں کی بات پر بے ساختہ کہہ اٹھیں۔ "میرے لیے اللہ کا نام اتنا قیمتی ہے کہ میں اس کے لیے اسکے مظلوم بندے کی مدد کر دوں۔ میں اپنے زیور بیچ کے دے دوں گی۔"

سوائے رب کے کون سی ذات ہے جو کسی کے دل میں دوسرے کے لیے رحم ڈالے۔ وہ دونوں آپس میں بحث کر رہے تھے۔ پھر وہ اسے اپنے گھر لے گئی تھیں۔ وہ افسر منع کرتا رہا۔ چار بیٹوں کی ماں نے ان سنا کر دیا تھا۔ اس پر تو، اللہ کے نام پر مدد کا جنون چڑھ گیا تھا۔ اس نے اس لڑکی کو کھلایا پلایا تھا۔ اسکے لیے دوائی منگوائی تھی۔ اور بہت سے خطروں کے باوجود مریم میر کے نام سے اسکا نیا پاسپورٹ اور آئی کارڈ آ گیا تھا۔ یہ سپیلنگ ترک لڑکیاں استعمال کرتی تھیں۔ فجی کو **Meryem** نام کے سپیلنگ میں فرق تھا۔ مریم کے سپیلنگ جیسی لڑکی درکار تھی۔ **AalamMariyam**

جس دن وہ ملک چھوڑنا تھا اس خاتون نے اسے اپنے تین سوٹ دیے تھے۔ مریم رو پڑی تھی۔ ساری زندگی دیتی آئی تھی۔ لیتے وقت عزت نفس پر کیسے کیسے چرکے لگ رہے تھے۔

"یہ سب ادھار رہا۔ میرے پاس جب بھی پیسے آئے تو میں یہ قرض اتار دوں گی۔ میں اللہ کو گواہ بنا کر وعدہ کرتی ہوں۔ آپ کے سارے پیسے لٹا دونگی۔"

اسکے پاس اب کچھ پیسے تھے۔جس ملک میں جانا تھا وہاں کے بنک سٹیٹمنٹ کا انتظام بھی انہوں نے خود کیا تھا۔لیکن وہ اتنا جانتی تھی کہ وہ پیسے اس نے خرچ نہیں کرنے تھے وہ کسی اور کے تھے۔اور آگے کی سوچی پلاننگ تو تب کام آتی جب اس ملک کو چھوڑتی۔پچھلی بار وہ دوپٹے کے ساتھ تھی۔اب کی بار اس نے حلیہ مختلف کر رکھا تھا۔اس سب کے باوجود بھی پکڑے جانے کا احتمال تھا۔اس آفیسر نے کہا تھا کہ وہ سب سنبھال چکا ہے۔اور شاید وہ سب ہی کبھی نا کبھی ایک دوسرے کے کام سنبھال لیا کرتے تھے۔اس لاوارث لڑکی کے لیے ایسے انتظامات تو وہ اللہ کروا رہا تھا۔

'سوا' کے ائیر پورٹ پر گلاسز لگائے وہ اندر سے سخت بے چین تھی۔۔اسکے پاسپورٹ پر مہر لگاتے وہ افسر اسے سرسری دیکھ کر اپنے کام میں لگ گیا تھا۔وہ دل میں ان گنت بار آیت الکرسی کا ورد کیے جا رہی تھی۔جب تک اسکا جہاز اس ملک کی سرزمین کو نہیں چھوڑتا تھا۔اس نے بے چین رہنا تھا۔بے چین۔۔اور کچھ ہو جانے کے خوف میں مبتلا۔۔

بلآخر اس کا جہاز فضا میں بلند ہو گیا تھا۔اور پکڑے جانے کے ڈر سے چار فلائٹس بدل کر وہ اپنی نئی منزل پر پہنچی تھی۔تھکن حد سے سوا تھی مگر یہاں اسکے پاس ہوٹل بھی نہیں تھی۔جہاز سے اترنے کے بعد وہ اس وسیع ملک میں ایک بار پھر سے لاوارث بننے والی تھی۔

رشیا کی سرزمین پر پہنچ کر اس نے آزاد سانس خارج کی تھی۔ائیر پورٹ سے پہلے وہ مقامی پولیس اسٹیشن گئی تھی۔وہاں جا کے اپنی آمد رجسٹر کروائی تھی۔یہ ان کا اصول تھا۔چھوٹے سے پروسز کے بعد وہ باہر آ گئی تھی۔

روس میں خزاں کا موسم تھا۔سردیوں کی آمد آمد تھی۔ہوا میں خنکی تھی۔مریم کو لگ رہا تھا کہ اب اسکے نصیب میں بس سردیاں ہی ہیں۔اور سردی سے بچنے کے لیے کوئی گرم چیز نہیں تھی۔نہیں تھی تو کیا ہوا آ جانی تھی۔وہ نئے ملک اور نئے شہر میں پر اعتماد تھی۔

اب اسکے بیگ میں اتنے پیسے تھے کہ یا تو کچھ کھا لیتی۔یا ماسکو سب وے کو استعمال کر کے شہر کے مرکز میں جاتی۔اور اپنے لیے کوئی نوکری تلاش کرتی۔ماسکو سب وے اتنی مہنگی نہیں ہے۔بلکہ سستی ہے۔مسئلہ یہ تھا اسکے پاس اب چند روبل ہی تھے۔پاکستانی کرنسی اور رشین کرنسی میں بہت کم فرق تھا۔ایک دو روپے کا۔

مریم نے بیگ سے نکال کران چند روبلز کو گنا۔دو سے تین بار گنا شاید اسطرح زیادہ ہو جائیں۔مگر وہ اتنے ہی رہے۔اس نے پاس گزرتے ایک راہ گیر کو روک کر نزدیکی میٹرو سٹیشن کا پوچھا۔وہ انگلش نہیں جانتا تھا۔دو تین لوگوں سے بات کرنے کے بعد اسے اندازہ ہو رہا تھا یہاں رشین زبان سیکھے بغیر گزارہ نہیں تھا۔

پھر ایک لڑکی جو کہ پڑھی لکھی لگ رہی تھی۔اس نے انگلش میں بات کی تھی۔پھر اسے سب وے کے روٹ سمجھاتی رہی۔شروعات اچھی تھی۔پہلے دن ہی انجان ملک میں مدد مل گئی تھی۔اسکا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔وہ اس لڑکی کے بتائے نقشے کے حساب سے چلتی بیس منٹ کے بعد ایک سٹیشن کے سامنے کھڑی تھی۔اور وہ بہت خوبصورت تھا۔میٹرو اسٹیشن انڈر گراونڈ تھے۔ٹکٹ لے کر وہ کتنی دیر اس اسٹیشن پر غور و فکر کرتی رہی۔وہ اس قدر خوبصورت اور شاہانہ تھا کہ وہ دیکھتی ہی رہی۔جیسے کسی بادشاہ کے محل میں آنکلی ہو۔

تھکن شدید تھی۔مگر اب اس نے ان باتوں کو نہیں سوچنا تھا۔ارد گرد لوگ آ جا رہے تھے۔سب کو جانے کی جلدی تھی۔پھر ٹرین کے آتے ہی اور زیادہ رش ہو گیا تھا۔وہ جلدی سے ٹرین میں داخل ہو گئی۔وہ نئی زندگی کے لیے نئی امیدیں لیے بیٹھی تھی۔

اچانک اسے محسوس ہوا اسکی پیٹھ پر کچھ رینگ رہا ہے۔اسکی ساری سوچیں ایک دم سے منتشر ہوئیں۔اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کیا۔وہ ہاتھ کو اوپر نیچے کر کے رینگنے والی چیز کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔مگر اب وہ گم تھی۔اس نے ہاتھ کو آگے کر لیا۔دماغ ایک دم سے اس چیز میں الجھ گیا تھا۔کیا تھا بھلا؟ کچھ تھا بھی یا وہم تھا۔اور چند منٹ بعد اسے اپنے بازو پر کچھ محسوس ہوا۔وہ ڈر گئی تھی۔اس نے ارد گرد دیکھا۔سب اپنے آپ میں مگن تھے۔اور پھر بیک وقت اسے اپنے جسم کے کئی حصوں پر سرسراہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔اس کے جسم میں لرزش ہونے لگی تھی۔

وہ جانتی تھی یہ صرف اسکا وہم تھا۔اس رات کے بعد کے آفٹر شاکس۔۔

مگر پھر بھی وہ خود کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔اس نے مضبوطی سے پکڑے بیگ پر دونوں ہاتھوں کو بھینچ لیا تھا۔اسے اب کسی کیڑے کو نہیں ہٹانا تھا۔ہاتھ روکنا تھا۔کیونکہ یہ اسکا وہم تھا۔اسکی زندگی میں آیا اطمینان بس کچھ گھنٹوں کا تھا۔وہ پھر سے الجھے ذہن کے ساتھ اب سر جھکائے کھڑی تھی۔ٹرین رک گئی تھی۔

وہ اپنی سوچوں سے باہر نکلی۔لوگ ٹرین سے اتر رہے تھے۔وہ بھی اتر آئی تھی۔پھر وہ اس ایریا کے قریبی شاپنگ سنٹرز میں جاب کے لیے جاتی رہی۔پہلے تو وہ اسے حیرت سے دیکھتے۔اوران میں سے اکثر کو انگلش بس تعارف کی حد تک ہی آتی تھی۔جب ان کی زبان نہ بول سکتی تھی نہ سمجھ سکتی تھی۔وہ کیسے وہاں کوئی جاب لے سکتی تھی۔آنے والے کسٹمرز بھی تو مقامی آبادی تھی۔اسی کوشش میں دن سے رات ہوگئی تھی۔

فلائٹ میں کھایا تو کب کا اتر چکا تھا۔تھکن،بھوک اوراب دوبارہ سے بے گھری کا سامنا تھا۔وہ اندر ہی اندر اپنے آپ سے تنگ آنے لگی تھی۔کیسی زندگی جینی پڑ رہی تھی۔

سب بل بورڈز پر لکھا بھی رشین میں تھا۔اسے اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ وہ اب کہاں تھی۔بیگ تو کندھے سے لٹکانے کا خیال وہ چھوڑ چکی تھی۔اب اسکی جمع پونجی بس یہی تھا۔اوراتنا اسے معلوم تھا کہ وہ ایک ایسے ملک میں آچکی تھی جہاں کا مافیا پوری دنیا میں مشہور تھا۔بیگ کو سینے سے لگائے وہ ایک فٹ پاتھ پر بیٹھی سامنے سے گزرتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔یہ بہت مصروف شاہراہ تھی۔دن کی شروعات اچھی تھی مگر اختتام پھر سے مایوس کردینے والا تھا۔کاش کے زندگی اس طرز پر چلتی کہ ایک دن مصیبت آئی ہے تو پھر کئی دن نہیں آئے گی۔مگر زندگی ہماری خواہشوں پر نہیں چلتی۔یا پھر ایسا ہی ہوتا ہے کہ مصیبت تو ایک دن ہی آتی ہے مگر اس سے نکلتے نکلتے اتنا وقت لگ جاتا ہے کہ ہر دن یوں لگتا ہے،آج پھر نئی بلا سر پر آن گری ہے۔

جب برے دن شروع ہوتے ہیں تو پھر لمبے ہوجاتے ہیں۔اسے نہیں معلوم تھا اسکا برا وقت کب ختم ہونے تھا۔بس حوصلے سے اب اس وقت کو گزارنا تھا۔

وہ پھر سے ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔کسی پرسکون گوشے میں بیٹھ کر رات گزارنی تھی۔چلتے چلتے وہ ایک فوڈ سٹریٹ میں آگئی تھی۔نام دیکھنا چاہا مگر سب رشین میں لکھا تھا۔ہر طرف سے خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔

اس نے کبھی رشین کھانے نہیں چکھے تھے۔مگر اس وقت ان خوشبوؤں سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دنیا کے بہترین کھانے تھے۔چھوٹے سے ریسٹورنٹس۔۔بیکریز۔۔اور فروٹس شاپ۔وہ ایسے مرد مومن کی طرح وہاں سے گزر جانا چاہتی تھی جو خوبصورت عورت کو دیکھ کو نظریں جھکائے گزر جاتا ہے۔لیکن وہ مرد مومن نہیں تھی۔وہ بہت بھوکی تھی۔

وہ نظریں اٹھاتی اور وہاں ہنستے بولتے کھاتے لوگوں کو دیکھتی۔اور پھر خود کو ڈپٹ کر نگاہیں جھکا لیتی۔جیسے کوئی گناہ کرنے کے بعد انسان خود کو ڈپٹ دیتا ہے۔اور پھر خود کو سو صلواتیں سناتے اس نے اب نگاہیں نہیں اٹھائی تھیں۔

اگر وہ بھوک کی کچی نہ ہوتی تب بھی اتنے وقت کے بعد ہر نارمل انسان کو بھوک لگنا شروع ہو جاتی ہے۔اور وہاں سے جاتے ہوئے وہ خود کو بھوک پر قابو پانا سکھا رہی تھی۔حالانکہ ابھی بھی جا کر کسی سے چھینتی نہیں تھی۔مگر خود اسے اپنا دوسروں کو کھاتے دیکھنا پسند نہیں آیا تھا۔وہ اپنے آپ سے ناراض ہونے لگی تھی۔خود کی نظروں میں جو عزت تھی۔اسے ٹھیس پہنچی تھی۔

اس فوڈ سٹریٹ سے چلتے وہ دوسری جانب نکل آئی تھی۔جیسے جیسے رات بڑھ رہی تھی۔لوگ گھروں کو جا رہے تھے۔اور پھر آدھی رات تک وہ اپنے لیے ایک جگہ ڈھونڈ چکی تھی۔ایک چھوٹا سا سبز قطعہ تھا۔جو روڈ سے ہٹ کر بنا تھا۔وہاں ایک بنچ رکھی تھی۔اور جو اسے چاہیئے تھا۔وہ تھا اندھیرا۔۔اس جگہ پر کوئی بھی لائٹ نہیں تھی۔

وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی اس بنچ تک آئی تھی۔ایک دل چاہا۔اسکی آڑ میں چھپ کر سو جائے۔پھر اس خیال کو رد کر دیا۔نیچے اگر کچھ ہوتا تو؟اس نے بیگ کو بنچ کے ایک جانب رکھا۔اور پھر اس پر سر رکھ کر ٹانگیں سمیٹ لی تھیں۔آنکھیں بند کیں۔تو پھر سے وہ رات یاد آنے لگی۔اس نے بے چین ہو کر آنکھیں کھول دیں۔اور سیدھی ہو کر آسمان کے اندھیروں کو تکتی رہی۔شاید چاند کی آخری تاریخیں چل رہی تھیں۔آسمان کا اندھیرا بہت گہرا تھا۔

نجانے کونسا پہر تھا کہ اسکی آنکھ لگی تھی۔پھر تھوڑی دیر بعد کھل گئی تھی۔اسے سردی لگ رہی تھی۔اس نے اٹھ کر بیگ کھولا۔اور ایک دوپٹہ نکال کر اوڑھا۔وہ ابھی تک جینز شرٹ میں تھی۔اور اسکا لانگ کوٹ۔۔دوپٹے کو منہ تک لپیٹ کے وہ پھر سو گئی تھی۔

وہ نیند میں تھی کہ اسے لگا کوئی اسکے سر پر کھڑا آوازیں دے رہا ہے۔"علی سونے دو۔۔بہت تھکی ہوئی ہوں۔۔"نیند بھری آواز میں بولی۔مردانہ آواز پھر بھی آ رہی تھی۔

"مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔۔کبھی تو سکون سے سونے دیا کرو۔۔"اب کی بار اس نے غصے سے دوپٹہ

ہٹا کر آنکھیں کھولیں۔اسکے سر پر پولیس والا کھڑا تھا۔اسکی بھک سے نیند اڑی تھی۔جھٹکے سے اٹھی تھی۔اردگرد دیکھا تو یاد آیا کہ گھر نہیں تھی۔پھر گہری سانس لے کے دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیرا۔

وہ سامنے کھڑا مرد اس سے رشین میں کچھ کہہ رہا تھا۔مریم نے بے زاری سے اسے دیکھا۔"پہلے سر پر مصیبتیں کم ہیں۔آؤ تم بھی آن پڑو میرے سر پہ۔۔" وہ اردو میں بڑبڑائی۔وہ اب غصے سے اسکی جانب جھکا۔مریم نے اسے ہاتھ اٹھا کر منع کرنے کے انداز میں دیکھا۔پھر بیگ سے پاسپورٹ نکال کر اسے دکھایا۔"میں ٹورسٹ ہوں۔پاکستانی ہوں۔کل آئی ہوں۔"وہ انگلش میں بولی۔

اس نے نو انگلش نو انگلش کا نعرہ لگایا۔"اب تمہارے لیے رشین سیکھ کے آؤں۔۔"وہ جھنجھلائی تھی۔

"ٹورسٹ۔۔"اب وہ اسے سمجھانے کے انداز میں ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے بول رہی تھی۔جب کہ وہ یہ پوچھ رہا تھا۔تم اپنے ہوٹل کیوں نہیں گئی۔یہاں کیوں سو رہی ہو۔اب نہ اسے اتنی رشین آتی تھی کہ اسے سمجھا سکتی۔نہ اسے اتنی انگلش آتی تھی کہ سمجھ سکتا۔پاس سے گزرتے ایک امریکی کو اس نے روکا۔اور انگلش میں کہا کہ اس سے پوچھو یہ کیا کہہ رہا ہے۔

اس نے بھی رشین زبان بولنے سے معذرت کی تھی۔پھر موبائل میں ایک ایپ کھولی۔اور موبائل اسکے آگے کیا کہ اس میں بولو۔مریم نے ناسمجھی سے اسکی بات مانی۔وہ پولیس والا بھی ساتھ ہی کھڑا تھا۔یہ صبح کے چھ کا وقت تھا۔اکا دکا لوگ تھے باہر۔ابھی شہر پورا نہیں جاگا تھا۔مریم نے انگلش میں بات کی تو موبائل سے مشینی آواز میں رشین میں اسکی بات دہرائی گئی تھی۔مریم سمجھ گئی تھی۔اس نے پھر اپنی بات وہاں دہرائی۔اور پولیس والے نے اپنا سوال دہرایا۔

"میں تو یہاں اپنے دوست کے انتظار میں بیٹھی تھی۔وہ آیا نہیں تو مجھے نیند آ گئی۔۔" مریم نے جان چھڑانے کو جھوٹ بولا۔رشین پولیس کی ریپوٹیشن بھی پاکستانی پولیس کی مانند تھی اور کارکردگی بھی۔جو ایماندار تھا تو بس تھا ورنہ ہر بندہ پیسے لے کے کام کرتا تھا۔

کچھ دیر وہ اس سے بحث کرتا رہا۔مریم نے پھر اس کے جذبات پر ہاتھ ڈالا تھا جیسے۔"دیکھیں میں ایک ٹورسٹ ہوں۔یوں اسطرح سے مجھ سے سوال پوچھ کر آپ اپنے ملک کی بے عزتی کر رہے ہیں۔یہ میرے

ساتھ امریکی کھڑا ہے۔ یہ ویسے بھی یہی کہتے ہیں رشین مہمان نواز نہیں ہوتے۔" اب امریکہ اور رشیا کے تنازعے کا تو اسے پتہ تھا۔ پولیس والے نے ایک دم سے امریکی کو گھورا۔ وہ مریم کی بات انگلش میں سن چکا تھا۔ پولیس والے کی گھوری پر فوراً ہاتھ کھڑے کیے۔

"میں ایک امن پسند امریکی ہوں۔ میرا اس سب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا موبائل دیں۔ میں نے جانا ہے۔" پھر مریم کے ہاتھ سے موبائل لے کر وہ ایک طرف چل پڑا تھا۔ مریم نے جتاتی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔ دیکھا کہا نا امریکی رشین کی تعریف نہیں سن سکتے۔ پھر وہ رشین زبان میں امریکیوں کی شان میں گستاخی کرتا رہا۔ مریم اپنا بیگ پیک کرتی مسکرا کر اسے ہاتھ ہلاتی نکل آئی تھی۔

"توبہ۔۔" کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ پھر سے فکر معاش کی تلاش میں تھی۔ آج تو سب وے استعمال کرنے کے پیسے نہیں تھے۔ چلتے چلتے ٹانگیں جواب دے جاتیں، تو وہ بیٹھ کر کچھ دیر آرام کر لیتی تھی۔ اسکے سامنے چند بلند بلڈنگز تھیں۔ اس نے پہلی بار کسی اچھی جگہ نوکری کا سوچا۔ وہ ہمت کر کے سامنے ایک کمپنی کے اندر داخل ہوئی۔ پہلے اس نے واش روم میں جا کر اپنا حلیہ درست کیا اور پھر فائل نکال کر اسے سینے سے لگائے باہر آ گئی تھی۔ حسب معمول بالوں کو باندھ رکھا تھا۔

یہ ایک رشین کار برینڈ کی کمپنی تھی۔ اسکی انگلش سن کر ریسپشنسٹ نے فوراً ہی اندر کال کی تھی۔ رشین لوگ انگلش زبان کو سیکھنے کا کوئی شوق نہیں رکھتے اور سیکھ لیں تو بوقت ضرورت بولتے ہیں۔ انگلش کے ساتھ باقی تین زبانوں کو ملا کر انکی یونیورسٹی میں ایک ہی ڈگری دی جاتی تھی۔ یعنی لسانیات کی۔

وہ اعتماد سے چلتے اندر آئی تھی۔ سامنے والا بھی اس سے انگلش میں ہی گفتگو کرتا رہا۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی کہ وہ اسے جاب پر نہیں رکھ سکتے تھے۔

بھلا ایک کیمیا دان کا بزنس میں کیا کام تھا۔ بہت خوبصورتی سے معذرت کر لی گئی تھی۔ وہ دلبرداشتہ ہوئی تھی لیکن پھر بھی دو تین اور قریبی بلڈنگز میں گئی تھی۔ وہ سب کاروبار اسکی ڈگری سے ہٹ کے تھے۔ کوئی اسٹاک مارکیٹ سے ریلیٹڈ تھی۔ کوئی آئی ٹی کی تھی۔

وہ مکمل طور پر مایوس ہو چکی تھی۔ اور نوکریاں کونسا پلیٹ میں سجی مل جاتی ہیں۔ آپ خواہش کریں وہ حاضر

ہوں۔رشیا میں یہ حال تھا کہ پڑھے لکھے زیادہ تھے اور نوکریاں کم۔۔اور پھر چھوٹے شہروں سے لوگ بڑے شہروں کو بھاگتے۔ماسکو تو پھر مرکز تھا۔بہت سخت مقابلہ تھا۔نوکریاں کم اور ایک سے بڑھ کر ایک قابل امیدوار۔۔ایسے میں جب کہ وہ انکی زبان بھی نہیں جانتی تھی۔کہاں ملنی تھی اسے نوکری۔اسے ایک ہی دن میں معلوم ہوگیا تھا۔یہاں نوکری ملنا معجزہ تھا۔

سارا دن چل چل کر پیروں میں جیسے چھالے ہوگئے تھے۔پرانے زخم بھی تنگ کرنے لگے تھے۔سائیڈ کا زخم۔پاؤں کا زخم۔۔جسم کی الرجی۔تنگی در تنگی تھی۔اور اس تنگی میں جو آسانی تھی۔وہ بس اسکے دل کی امید تھی۔کہ وہ ایک دن ضرور اس سب سے نکل آئے گی۔حالانکہ اس کا اب ایک فیصد چانس رہا تھا۔۔چلتی سانسوں کی وجہ سے۔۔ورنہ اچھے حالات کا آنا تو اس وقت یوں ناممکن تھا جیسے سورج کا مغرب سے نکل آنا۔لیکن وہ دن بھی تو لکھا گیا ہے نا کہ سورج مغرب سے نکلے گا۔تو بس مریم کو یقین تھا اسکے بھی برے دن بدلیں گے۔۔وہ اب صرف اپنی امید،اپنے یقین کے بل بوتے پر زندہ تھی۔

آج وہ کسی پارک میں جانے کی بجائے رہائشی کالونیوں میں گھوم پھر رہی تھی۔رات کو کسی گھر کے آگے بنی کسی آڑ میں سو جاتی۔

دن پر دن گزر رہے تھے۔حاصل وصول کچھ نہیں تھا۔وہ رات کے وقت ایک گھر کے سامنے مخصوص وقت کو پہنچ جاتی تھی۔اور وہاں ایک بلی بھی اسی ٹائم پر آتی تھی۔اسکے منہ میں اکثر آدھی ڈبل روٹی ہوتی۔جو وہ اسکے آگے آ کر رکھ دیتی تھی۔

پہلے دن جب وہ بلی اسے ملی تھی۔تو اسکے منہ میں پھنسی ڈبل روٹی کو اس نے حسرت سے دیکھا تھا۔وہ بلی نیچے رکھ کر اسے نوچ نوچ کر کھا رہی تھی۔اس نے فوراً رخ پھیر لیا تھا۔اسکا دل بس چاہ رہا تھا وہ بلی سے چھین کے خود کھا لے۔اب کیا جانوروں سے لے کے کھاؤ گی؟اس نے اپنے آپ کو شرمندہ کیا۔اور وہ بلی اسکے رخ پھیرنے پر دوسری طرف سے اسکے سامنے آ بیٹھی تھی۔

اور ڈبل روٹی منہ سے نکال کر اسکے آگے رکھ دی۔مریم نے اس کے دو ٹکڑے کیے۔ایک اس کو دیا اور دوسرا خود کھانے لگی۔اس دن وہ تین دن کی بھوکی تھی۔پھر اس دن سے وہ شہر میں جہاں بھی گھومتی رات کے وقت

وہیں واپس آتی۔ پھر بلی اور وہ مل کے ڈنر کرتے۔سارے دن میں وہی آدھی ڈبل روٹی ہی اسکی خوراک تھی۔اس نے بھوک پر قابو پانا سیکھ لیا تھا۔ایک دو رشین سکولوں میں جاب کے لیے گئی تو مسئلہ زبان کا تھا۔اور نہ ہوتا تو کیا اسے رکھ لیتے؟نہیں۔۔ان کے پاس بہت سے امیدوار تھے۔

اب گھر والے یاد نہیں آتے تھے۔اب اپنا گھر بنانے کی دھن سوار تھی۔

حال یہ تھا کہ ہاتھ پلے کچھ نہیں۔۔

☆......☆......☆

وہ آجکل رشین سیکھنے میں لگی تھی۔لوگوں کو بولتے ہوئے غور سے دیکھتی رہتی۔آہستہ آہستہ تھوڑے بہت لفظ پلے پڑنے لگے تھے۔مسلسل بھوک کی وجہ سے اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتی جا رہی تھی۔آنکھوں کے گرد حلقے۔وہ پھر بھی ہمت نہیں ہارتی تھی۔اچھے دن آنے تھے۔رات کٹ جانی تھی۔نیا سورج نکلنا تھا۔

سردیاں آ گئی تھیں۔اور روس کی سردی کو کون نہیں جانتا۔۔جھیلیں جم جاتی ہیں۔برفباری کے طوفان سے آنے لگتے ہیں۔ایسے میں مریم کا دل چاہتا کوئی آگ کی جنت میں لے جائے۔اسکے ایک پروفیسر نے کہا تھا کہ ہر آدمی کی جنت جدا ہوتی ہے۔ہر وہی چیز جنت سمجھی جاتی ہے۔جو پہنچ سے دور ہو۔تب اسے ان کی باتوں سے اختلاف ہوا تھا۔مگر آج اسے احساس ہو رہا تھا۔آگ زندگی تھی۔جنت تھی۔کاش کہ اسے یہ جنت نصیب ہو۔

دن کو وہ مختلف شاپنگ مالز،شاپس میں ونڈو شاپنگ کے بہانے گھسی رہتی۔وہ سب گرم ہوتے تھے۔مگر رات کو ہر جگہ بند کر دی جاتی تھی۔وہ بیگ سے دو دوپٹوں کو نکال کر انہیں سکارف کی طرح ڈبل کر کے اوڑھ لیتی تھی۔مائنس درجہ حرارت کی سردی میں یہ سب ترکیبیں ناکام جاتی تھیں۔

اس سردی میں یہ پاکستانی کپڑے اسکے کام کے نہیں تھے۔ان سے بہتر یہ جینز تھی۔جسے وہ ہر دوسرے دن پہن لیتی۔شاپنگ مالز کے واش روم میں کپڑے چینج کر لیتی تھی۔مگر دھونے کا انتظام کہاں سے کرتی۔مختلف لانڈریز کو تاڑ لیا تھا۔جب وہاں سیل لگتی کہ اتنے پیسوں کے ساتھ اتنے کپڑے فری دھوئے جائیں گے۔وہ ان سے کہتی یہ جینز شرٹ دھو کر دیں اگر اچھا ہوا تو سارے یہیں سے دھلواؤں گی۔جو اسکی باتوں میں آتے وہاں کام

بن جاتا تھا۔ورنہ سوکھا منہ لیے باہر آ جاتی۔

اس گند میں گزری رات کی وجہ سے جو اسے کبھی کبھار بدبو کے بھبکے آتے تھے اسکا علاج اس نے فری پرفیومز میں ڈھونڈ لیا تھا۔مختلف برانڈز میں ٹرائی کرنے کے بہانے وہ اپنا کام چلا رہی تھی۔کبھی نہ مانگنے والی کی عزت نفس یوں خیرات پر پلتے تار تار ہو چکی تھی۔

اسے خود پر ترس آتا تھا کہ وہ کسی فقیر کی مانند خیرات پر پل رہی تھی۔اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی میں اس چیز کا بھی خرچہ ہو سکتا ہے۔ہر بار نئی بات اسے پتہ چلتی اور وہ اپنے گھر کی چیزوں کی لسٹ میں اضافہ کرتی،جب اپنا گھر بناؤں گی تو یہ بھی لوں گی۔

وہ کھانے کی شاپس سے اب سو میل کے فاصلے سے گزرتی۔وہ اپنا اتنا امتحان نہیں لے سکتی تھی۔اور سب سے تکلیف دہ چیز۔۔مرد کی ذہنیت۔۔وہاں بھی ایسے مرد تھے جو عورت کو تنگ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔وہ آہستہ آہستہ ان سے نپٹنا بھی سیکھ رہی تھی۔وہ سب سیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

آج کا دن بھی بہت ٹھنڈا تھا۔وہ اب گلی میں بلی کے پاس نہیں جاتی تھی۔اسے خود سے شرمندگی ہوتی تھی کہ وہ ایک جانور کا حصہ لے کر خود کھا جاتی ہے۔وہ انسان تھی وسیلہ ڈھونڈ سکتی تھی۔وہ جانور کہاں جاتی۔خیر اس کی اپنی حالت تو اس بلی سے بھی گئی گزری تھی۔کہ اسے جانور سمجھ کر اس پر ترس کھا لیا جاتا تھا۔انسانوں کی خبر رکھنا تو عرصہ ہوا انسان چھوڑ چکے۔مگر پھر بھی اسے جانور پر یہ ظلم نہیں کرنا تھا۔اس کا دل دکھتا تھا۔

شروع میں برداشت کی اتنی عادت نہیں تھی۔بلی سے لے کر کھا لیا تھا۔پھر عادت بھی بنا لی تھی۔مگر اب اور نہیں۔

آج چوتھا دن تھا۔ان چار دنوں میں اس نے ایک بار پھر،ایک دوسری بیکری سے جا کر بڑی منتوں سے دو کپ کیکس ادھار لیے تھے۔وہ نہیں دے رہا تھا۔پھر اس نے اپنی طرف سے خیرات سمجھ کر دیے تھے۔اور اس نے ادھار سمجھ کر لیے تھے۔اس نے اپنے ذہن میں اس بیکری کا نام محفوظ کر لیا تھا۔

وہ گرمائش کے لیے آج غلطی سے ایک ریسٹورنٹ میں آ گئی تھی۔اس کا دل چاہا مالک سے کہے کہ آج

کے لیے ادھار دے۔ مگر چپ کر کے شیشے کے ساتھ والی ٹیبل پر بیٹھی رہی۔ شیشے کے پار سڑک پر گری برف نظر آرہی تھی۔ وہاں سے گزرتی اکا دکا گاڑیاں۔ آج کے دن ٹریفک کم تھی۔ وجہ سردی کا معمول سے زیادہ ہونا تھا۔

ویٹر نے آکر اسکا آرڈر لینا چاہا تو اس نے ساتھی کے انتظار کا کہہ کر اسے واپس بھیج دیا۔ کچھ دیر گرمائش میں بیٹھنا تھا اسے تو۔۔

پھر اسکی ٹیبل کے گرد کرسی کھینچ کر ایک پختہ عمر کی عورت آبیٹھی۔ مریم نے ایک نظر دیکھ کر پھر باہر دیکھنا شروع کردیا تھا۔ وہ کب سے اس لڑکی کو تکے جارہی تھی۔ بھوک، افلاس اسکے چہرے کا حصہ بن چکی تھی۔ اسکے کپڑے بھی پرانے تھے۔ شکار اچھا تھا۔ اس نے دو سوپ کے پیالوں کا آرڈر کیا۔ پھر مریم کی طرف متوجہ ہوئی۔

" کہاں سے ہو؟" مریم نے آواز پر مڑ کر دیکھا۔ سامنے بہت خوبصورت عورت تھی۔ بہت قیمتی لباس میں۔ وہ چند لمحے خاموشی سے اسے تولتی نگاہوں سے تکتی رہی۔ پھر بنا جواب دیے دوبارہ باہر دیکھنے لگی۔ اسکی اب تک کی انسانوں کی پہچان کہہ رہی تھی وہ اسکے لیے اچھی نہیں تھی۔

شکر کہ وقت نے اسے یہ سکھا دیا تھا۔

" تم مجھے اچھی لگی ہو۔ میں نے سوچا آج تمہارے ساتھ بیٹھ کر سوپ پیوں۔ سردی بہت ہے۔ ہے ناں؟" بول کر اس نے تائید چاہی۔ مریم نے پھر سے اسے دیکھا۔ اس عورت نے چہرے پر بے ریا مسکراہٹ سجا لی تھی۔ مریم الجھ گئی تھی پہلا تاثر غلط تھا یا پھر یہ۔ تھوڑی دیر میں گرم گرم فش سوپ آگیا تھا۔ مریم کو اسکی خوشبو نے صبر کی دوسری حد پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس عورت نے اس لمحے کے تاثر کو اپنی زیرک نگاہوں سے دیکھ لیا تھا۔ اس لڑکی نے جانے کب سے صحیح طرح کھانا نہیں کھایا تھا۔

" مجھے عادت ہے جب بھی کسی ریسٹورنٹ میں جاتی ہوں۔ اکیلے بیٹھ کر کھانے سے میں کسی کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دیتی ہوں۔ لو پیو۔ یہاں کا فش سوپ بہت مزے کا ہوتا ہے۔۔"

" شکریہ۔ مجھے طلب نہیں ہے۔" اس نے سلیقے سے انکار کیا۔ " میرا دل رکھنے کو پی لو۔ بہت مزے کا ہے۔" اس نے کہہ کر سوپ کا ایک چمچ بھر کر پیا تھا۔ اور آنکھیں بند کر کے اس سے لطف لیا تھا۔

مریم خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سامنے سوپ صرف ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ ہاتھ بڑھاتی اور پی

لیتی۔اپنی سردی اور بھوک کا علاج کرتی۔ویسے بھی وہ خاتون اپنی نیک دلی کا کہہ رہی تھی۔اس نے اپنی بھوک مٹانے کو اس پر اعتبار کا سوچا۔اب اسے اس سے کیا لالچ ہو سکتی تھی۔کوئی جاب کہے گی تو نہیں کرونگی۔وہ کرسٹینا والے واقعے کو سوچتے ہوئے دہرا رہی تھی۔بھوک جیت گئی تھی۔ایک اور ادھار اس نے اپنے کھاتے میں جمع کیا تھا۔اور ہاتھ بڑھا کر ایک چمچ بھر کر پیا تھا۔وہ بہت ذائقہ دار تھا۔مریم نے آنکھیں بند کر کے اس نعمت کے ذائقے کو روح تک محسوس کیا تھا۔

"ویسے تم بہت خوبصورت ہو۔بہت کمزور لگ رہی ہو۔مگر پھر بھی خوبصورت ہو۔" مریم نے دوسرا چمچ منہ میں ڈالا۔کبھی معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ فش سوپ بھی اتنا مزے کا ہو سکتا ہے۔مریم سلیقے سے سوپ پینے کی کوشش کر رہی تھی۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ جلدی جلدی کے چکر میں وہ بدتمیز لگے۔

" کیا تم اکیلی رہتی ہو۔؟"

مریم نے سر ہلا دیا تھا۔" جاب ڈھونڈ رہی ہو؟" اب کے اس حلق میں نوالہ اٹک گیا تھا۔وہ عورت جواب کا انتظار کیے بغیر بولنے لگی۔" میرے پاس ایک اچھی جاب ہے تمہارے لیے۔۔تم تو بہت خوبصورت لڑکی ہو۔حیرت ہے کسی نے نہیں پوچھا ابھی تک۔خوبصورت عورت تو اپنے لیے ایک خزانہ ہے۔جب چاہے کیش کرا لے۔" وہ انگلش میں بات کر رہی تھی۔اور اسکا مفہوم بنا کسی جھجک کے اسے سمجھ آ گیا تھا۔اس نے چمچ کو پیالے میں چھوڑ دیا۔

" کیا غلط کہہ رہی ہوں۔۔۔" وہ آگے بھی بول رہی تھی۔مریم نے انگلی اٹھا کر اسے وارننگ کے انداز میں اسے دکھائی۔" مجھ سے دور رہو۔مجھے تمہاری آفر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" کرسی دھکیل کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔بھوک کے مارے ایک زور کا چکر آیا تھا۔وہ پھر بھی اس عورت کو غصے سے گھورتی جانے لگی۔" غرور کس بات کا ہے۔اتنی اوقات نہیں ہے کہ کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر سوپ پی سکو۔کس بات کی اکڑ دکھا رہی ہو۔" اس عورت نے طنز کیا تھا۔"اور جب بھوک شدید تھی۔تب بھی تم میرا مقصد جانتی تھی۔اس وقت کیوں سوپ پی لیا اگر اتنی ہی اکڑ تھی۔" وہ عورت بہت بدصورت بول رہی تھی۔مریم نے افسوس سے اس عورت کو دیکھا۔انسان کیوں انسانوں کا احساس نہیں کرتے۔اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی تھی۔

پھر ریسٹورنٹ سے باہر نکل کر وہ حلق میں انگلیاں ڈال کر خود کو قے کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔لمحوں میں سب باہر تھا۔قے کرتے اسکی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔وہ عورت حیرت سے شیشے کے پار اسے روڈ کے ایک طرف پڑے کچرے کے ڈرم پر قے کرتا دیکھ رہی تھی۔وہ پاگل تھی کیا؟

"پاگل عورت اسے اکڑ نہیں کہتے اسے ایمان کہتے ہیں۔۔جو اللہ مجھے فجی کے آخری کنارے پر ڈوبتا دیکھ کر یاد رکھنے والا تھا۔وہ اب بھی نہیں ڈوبنے دے گا۔ادھار سہی مگر کھا رہی ہوں۔کم سہی مگر پیٹ بھر رہی ہوں۔پاگل عورت اتنا نہیں جانتی ناک پیٹ سے اوپر ہے۔عزت ہر شے سے بڑھ کر ہے۔سمجھتی ہے بھوک سے ہر انسان کو خریدا جا سکتا ہے۔آؤ میری بھوک کا مول لگاؤ۔۔"

وہ اپنے آپ سے بولتے ہوئے چلتی جا رہی تھی۔آنسو بھی بہہ رہے تھے اور مسلسل بولے جا رہی تھی۔غصے نے سردی کے احساس سے ماورا کر دیا تھا۔آج بھی وہ غصے میں چل رہی تھی تب تک چلنا تھا جب تک غصہ کم نہیں ہونا تھا۔

چلتے چلتے وہ ایک الیکٹرونک شاپ کے سامنے تھی۔وہ ایک نظر دیکھ کر آگے چلی گئی تھی۔پھر ایک دم سے الٹے قدموں واپس آئی تھی۔اسکا لیپ ٹاپ بے کار تھا اس کے لیے۔وہ اپنے غصے کو دفع کرتے اس شاپ میں آ گئی تھی۔

لیپ ٹاپ نیا تھا۔اس نے استعمال ہی کب کیا تھا اسے۔اچھے داموں میں بک گیا تھا۔اس نے بے ساختہ خدا کا شکر ادا کیا تھا۔شاید وہ اسی دن کے لیے لیا تھا اس نے۔۔دنیا میں کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔پردیس بھی نہیں۔۔مگر بغیر پیسوں کے ہونا بغیر سانسوں کے ہونا تھا۔۔پردیس میں پیسہ ہی سانسوں کا کام دیتا ہے۔وہ پردیس کی مشکلات کو سمجھ گئی تھی اور جھیل بھی لیا تھا۔

فجی میں شروع میں ہاتھ میں پیسہ تھا۔وہ آرام سے پچھلی باتوں پر گھنٹوں اداس بیٹھ سکتی تھی۔رو سکتی تھی۔مگر بھوک لگنے پر کھانا خرید سکتی تھی۔سردی لگنے پر گرم کپڑا۔۔اور رہنے کو سر پر چھت تھی۔اور سونے کے لیے آرام دہ بستر۔۔تکلیف صرف پچھلی باتوں کی تھی اور تو کوئی تکلیف نہیں تھی۔روح چھلنی تھی۔جسم کو پھر بھی راحت تھی۔اور اب یہ سب نہیں تھا تو اسکے پاس اب اداسی کا وقت نہیں تھا۔

اسے اپنی ضروریات زندگی پوری کرنی تھیں۔اب صرف روح تکلیف میں نہیں تھی۔جسم کواب مشقت مل رہی تھی۔اور جسم کی تکلیف اسقدر دلدوز ہوتی ہے کہ جہنم میں بھی سزاؤں کے لیے جسم کا ہی انتخاب کیا گیا ہے۔صرف روح کا نہیں۔۔

ان پیسوں کو ہاتھ میں لیے وہ ایک جگہ پر بیٹھ گئی تھی۔اسے رونا تھا بہت سا۔کھل کے۔اسے خود کو ملامت کرنی تھی۔یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا تھا۔مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اسکے بعد اسکے پاس موبائل تھا اور پھر اپنا آپ۔۔

ان پیسوں کو ہاتھ میں لیے اس نے ہر برے خیال کو جھٹک دیا تھا۔ابھی بس اس اچھی امید کو سلیبریٹ کرنا تھا۔خوشی کے آنسوؤں نے اسکے چہرے کو ڈھانپ لیا۔وہ پیسے نہیں اسکی عزت تھی۔اسکی عزت اسے واپس مل گئی تھی۔آج جب اسکی ہمت ختم ہوئی تھی تو اللہ نے یوں مدد کی تھی کہ عقل پر پڑے ایک اور پردے کو ہٹا دیا تھا۔وہ ساٹھ ہزار روبلز تھے۔لیپ ٹاپ کی قیمت اس سے بھی زیادہ تھی۔

پہلے اس نے اٹھ کر ایک ٹیکسی کی۔پھر ایک شاپنگ مال میں جاکر اپنی ضرورت کی چیزیں خریدی تھیں۔پھر وہیں ایک ریسٹورنٹ میں جی بھر کر کھانا کھایا تھا۔پھر اس نے ہوٹل میں کمرہ لینے کا سوچا۔لیکن یہ مہنگا کام تھا۔پیٹ بھرا تھا تو دماغ بھی تیزی سے چلنے لگا تھا۔رہائش بہت مہنگی تھی۔اسکی پہنچ سے بہت دور۔۔وہ رات کے لیے کہیں بھی گزارہ کرسکتی تھی مگر اب اسے بھوک کے لیے کوئی کمپرومائز نہیں کرنا تھا۔ہر تکلیف سے بری تکلیف پیٹ کی تکلیف تھی۔

اس نے موبائل سم لے کر اس میں نیٹ پیکج کیا تھا۔دردر رلنے کی بجائے یہ کام ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر بھی کیا جاسکتا تھا۔پھر ایک سستے سے ہاسٹل میں ایک ہفتے کی بکنگ کی تھی۔باقی کے پیسے روز کے ایک وقت کے کھانے کے لیے رکھ دیے تھے۔اور پھر آنے والے دنوں میں اسکی بری حالت سنورنے لگی تھی۔اس نے دوماہ کے لیے میٹرو کارڈ بنوالیا تھا۔وہ ایک ایک کر کے اپنی ساری ضروریات پوری کر رہی تھی۔اسکے چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی۔گزرے دوماہ زندگی کے بدترین دن تھے۔

وہ میٹرو سٹیشن میں بیٹھی اپنی ٹرین کا انتظار کر رہی تھی۔وہ دوبارہ نئ ہمت کے ساتھ جاب ڈھونڈ رہی

تھی۔ایک خاتون اسکے ساتھ بیٹھی ایک رشین اخبار پڑھ رہی تھیں۔مریم نے اس اخبار کو دیکھا۔کاش کہ رشین پڑھنے آتی تو اس میں سے نوکریاں ڈھونڈتی۔اس نے مایوسی سے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

پھر ایک دم سے دوبارہ گردن موڑ کر اخبار کو دیکھا۔نیچے اسکے ایڈ والے حصے میں ایکطرف بریکٹ میں اردو لکھی تھی۔اس نے گردن جھکا کو اس کو دیکھا۔باقی سب رشین میں تھا۔بس اردو لفظ ہی بریکٹ میں تھا۔"ایکسکیوزمی؟"اس نے خاتون کو متوجہ کیا۔

"یہ کیا لکھا ہوا ہے؟"اس خاتون نے اخبار موڑ کر اسکی مطلوبہ جگہ کو دیکھا۔"مجھے اسکا انگلش میں ترجمہ کر کے بتائیں۔یہ کیا لکھا ہوا ہے؟"وہ بے تابی سے بولی۔

"آپ فارنر ہیں؟" خاتون نے سوال کیا۔اس نے گردن ہلائی۔پھر اس نے ترجمہ کر کے بتایا کہ یہاں انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز میں اردو پروفیسر کی ضرورت تھی۔مریم کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اسے جاب مل جائے گی۔پھر وہاں دیے گئے فون نمبر کو اپنے موبائل میں محفوظ کر لیا تھا۔ان کے پتے کو وہاں کسی سے کاغذ لے کر نوٹ کر لیا تھا۔وہ جہاں جاب کے لیے جانے کا سوچ بیٹھی تھی۔ارادہ کینسل کر دیا تھا۔وہیں بیٹھ کر اس نے وہاں کال کی۔تو پتہ چلا اس جاب کے لیے کال کرنے والی وہ پہلی تھی۔انہیں پی ایچ ڈی اردو کی ضرورت تھی۔پی ایچ ڈی نہ سہی۔۔ایم فل ضرور ہو۔مریم نے یہ سن کر بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔انہیں کل آنے کا کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔کل کیوں؟ کیونکہ وہ اردو پروفیسر نہیں تھی۔اسے اردو گرامر اور باقی چیزوں کے لیے کم سے کم ایک دن تو لازمی چاہیئے تھا۔یہ نہ ہو کہ وہ بہت دنوں بعد جاتی اور آگے سیٹ پر ہوتی۔

اس نے وہ سارا دن اور پھر رات گئے تک پوری اردو کو چھان مارا تھا۔یہ تو اسکا پسندیدہ کام تھا۔کتابوں کو پڑھنا،انہیں یاد کرنا۔گرامر،ضرب المثال۔۔غالب کے اشعار کو یاد کرتی رہی۔اردو میں جو جو بندہ اہم تھا۔اسکے بارے میں پورا نہیں پڑھ سکی تھی تو تھوڑا بہت ضرور یاد کر رہی تھی۔

اردو ادب ایک دن میں تو سمٹنے سے رہا۔مگر وہ ہمت نہیں ہار رہی تھی۔صبح اٹھ کر ایک شلوار قمیض استری کی تھی۔خالص پاکستانی حلیے میں جانا تھا۔اچھا امپریشن پڑتا۔اب تک اپنا ایک ہی بیگ ساتھ لے کے جاتی تھی۔اتنی اچھی جاب کے لیے اسطرح نہیں جا سکتی تھی۔جانے سے پہلے وہ شاپنگ سنٹر سے ایک خوبصورت

پاؤچ لیتی گئی۔موبائل، پیسے اور میٹرو کارڈ اس میں ڈال دیا تھا۔ڈاکومنٹس فائل کو سینے سے لگائے وہ تیار تھی۔خالص پاکستانی، ایک خوبصورت اور باوقار لڑکی کے روپ میں۔۔

گیارہ بجے اسکا انٹرویو تھا۔وہ دھڑکتے دل کے ساتھ وہاں بیٹھی اپنے بلاوے کا انتظار کر رہی تھی۔وہ دل ہی دل میں پوچھے جانے والے متوقع سوالات کو دہرا رہی تھی۔پھر اسکا بلاوا آ گیا تھا۔اس نے ایک نگاہ آفس پر ڈالی۔وہ ایک وسیع کمرہ تھا۔پورے آفس میں براؤن کلر کا راج تھا۔فرش بھی جیسے لکڑی کا تھا۔اور دیواریں بھی یوں ہی محسوس ہو رہی تھی۔اندر آفس میں بس دو لوگ تھے۔ایک سربراہی کرسی پر بیٹھا تھا۔پچاس کے لگ بھگ تھا۔اسکی لمبی ٹیبل کے آگے دو سنہرے رنگ کی کرسیاں تھی۔آمنے سامنے۔۔اور ان کے درمیان بھی ایک لکڑی کی ٹیبل تھی۔جسکی اونچائی دوسری ٹیبل کے برابر تھی۔آفس کی سجاوٹ ترک آفسز سے ملتی جلتی تھی۔

مریم نے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ سجا کر انہیں سلام کیا تھا۔دونوں نے سر ہلا کر چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ سجالی تھی۔"آئیں بیٹھیں۔۔"سنہری کرسی پر بیٹھا بندہ ساٹھ یا پینسٹھ کا تھا۔مریم اسکے سامنے والی خالی سنہری کرسی پر بیٹھ گئی۔اپنا پاؤچ اس نے اپنے سامنے ٹیبل پر رکھا۔اور فائل سے سی وی نکال کر ان کے آگے کی۔پھر فائل اپنی سمت سے رکھ دی۔وہ دونوں ٹانگوں کو بائیں رخ سمیٹ کے بیٹھی تھی۔اس نے ٹانگ پر ٹانگ نہیں چڑھائی تھی۔سامنے بیٹھے آدمی کے چہرے پر اسکی سی وی پڑھتے ہوئے متاثر کن تاثرات آ گئے تھے۔وہ بلاشبہ ایک بہترین تعلیمی کیریئر رکھتی تھی۔

"آپ بہت قابل سٹوڈنٹ رہی ہیں۔لیکن شاید آپ نے پڑھا نہیں تھا کہ ہمیں اردو کے لیے استاد چاہیئے۔"انہوں نے اردو میں کہا۔مریم جانتی تھی ان کا پہلا اعتراض یہی ہوگا۔لیکن وہ ہمت کر کے آئی تھی۔اس کے حق میں جو بات جاتی تھی تو صرف یہ کہ وہ پاکستانی تھی۔اور اسکی قومی زبان اردو تھی۔تو بھلا اس سے بڑھ کر کوئی اور غیر ملکی کیسے اچھا پڑھا سکتا تھا۔"جی بالکل میں یہ بات جانتی ہوں۔اور میں اردو پڑھانے ہی آئی ہوں۔کیونکہ میں پاکستانی ہوں۔اور آپ کو معلوم ہے اردو پاکستان کی قومی زبان ہے۔گھر سے لیکر باہر کالج، یونیورسٹی اور ہر جگہ اردو زبان بولی جاتی ہے۔"

"آپ کی بات ٹھیک ہے۔لیکن ہمیں اردو ادب کے لیے استاد چاہیئے۔آپ ایک سائنسی مضمون پڑھ چکی

ہیں۔آپ ادب کو کیسے سمجھ سکتی ہیں۔۔" ان کا لہجہ اسقدر خوبصورت تھا۔ذرا بھی گمان نہ ہوتا تھا کہ اردو انہوں نے بعد میں سیکھی تھی۔مریم دل ہی دل میں متاثر ہوئی۔

" سر ادب سے محبت کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں ہوتی۔اور نا ہی ایسا ہے کہ اگر کسی سائنسی مضمون کو پڑھ لیا جائے تو ادب میں کشش محسوس نہیں ہوتی۔میری ڈگری بھلے کیمسٹری میں ہے۔لیکن مجھے ہمیشہ سے اردو ادب سے محبت رہی ہے۔۔۔" اب وہ اردو ادب سے محبت کے جھوٹ کو یوں پختہ کر رہی تھی کہ انہیں غالب سے لیکر فیض تک ،اور میر امن دہلوی سے لیکر عصمت چغتائی تک اپنے اردو کے عشق کو بیان کر رہی تھی۔

اب پیپر تو نہیں تھا کہ وہ ساری اردو آج ہی سن لیتے۔ہر سٹوڈنٹ کی طرح آتے ہوئی اس نے کئی بار دعا کی تھی کہ بس انٹرویو میں وہی پوچھا جائے جو اسے آتا ہو۔آج اسکی خوش نصیبی ساتھ تھی۔وہ اس سے وہی بات کر رہے تھے جو وہ جانتی تھی۔

اور جب انہوں نے ترنگ میں اسے غالب کا کوئی شعر سنانے کو کہا تو وہ پہلے گڑبڑا گئی تھی۔پھر رات جو آسان شعر یاد کیے تھے۔ان میں سے ایک سنا دیا۔

کھلتا کس پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

وہ تو جھوم رہے تھے۔انہیں عرصے بعد کوئی اردو سے محبت کرنے والا ملا تھا۔اتنے پیارے انداز میں اردو میں بات کر رہی تھی وہ لڑکی۔وہ تو اس سے متاثر ہو رہے تھے۔

وہ ازبک تھے۔انہوں نے ماسکو یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی تھی۔پھر بعد میں یونورسٹی میں اردو کا شعبہ ختم ہوا تھا۔اور وہ اب یہاں پڑھا رہے تھے۔روس میں کوئی اردو بولنے والا ڈھونڈنا سمندر میں سوئی تلاش کرنے جیسا تھا۔پاکستان گورنمنٹ کو تو اس بات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی کہ انکی زبان وہاں پڑھائی جاتی کہ نہیں۔استاد نہیں تھا تو مہیا کرتے۔

اردو کا استاد انڈیا سے آجاتا تھا مگر روس میں وہ یقیناً پہلی پاکستانی اردو کی استاد لگنے والی تھی۔وہ اب اس سے اپنے پاکستان کے دوروں کا ذکر کر رہے تھے۔سربراہی کرسی پر بیٹھے شخص کو اردو سمجھ تو نہیں آتی تھی

لیکن اندازہ ہو گیا تھا کہ اردو کے لیے نئی استاد مل گئی تھی۔

خیر سب اتنا بھی اچھا نہیں تھا۔ کیونکہ اسکی ڈگری اردو کی نہیں تھی تو طے یہ پایا تھا کہ جب تک پی ایچ ڈی اردو کوئی نہیں آتا وہ پڑھاتی رہے گی۔ اور مریم نے آنے والے وقتوں میں سب سے زیادہ یہی دعا کی تھی کہ کوئی پی ایچ ڈی اردو وس نہ آئے۔

کیونکہ وہ اب اس ادارے سے ریٹائرڈ ہو رہے تھے۔ اور اردو کے استاد کے انٹرویو کے لیے ان سے بہتر کوئی نہیں تھا۔ سو ان کے فائنل کرنے پر اسے وہاں جاب مل گئی تھی۔ پھر سیلری وغیرہ فائنل کر کے اسے کل سے آنے کے لیے کہہ دیا گیا تھا۔ وہ لوگ بہت خوش تھے کہ اشتہار دینے کے صرف دو دن بعد انہیں پاکستانی اردو استاد مل گئی تھی۔ اور وہ زمانے کی ٹھوکروں کے بعد پاؤں تلے زمین آنے کا جشن منا رہی تھی۔

☆......☆......☆

پہلی تنخواہ ملنے کے بعد وہ ہر اس دکان پر جا رہی تھی۔ جہاں سے ادھار لیا تھا۔ جاتے ہوئے کچھ نا کچھ کھانے کی چیز بھی لیتی گئی۔ وہ لوگ اسکے ہاتھ میں تحفہ دیکھ کر شرمندہ ہوتے۔ اور پھر پیسوں کے لیے انکار کر دیتے کہ انسانیت کے ناطے مدد کی تھی۔ لیکن مریم کو کسی کے احسان نہیں چاہیئے تھے۔

وہ بہت خوش اخلاقی اور احسن طریقے سے انہیں ان کے قرض لوٹا رہی تھی۔ کسی کے پاس دو کپ کیک کھائے تھے۔ کہیں سوپ پیا تھا۔ لمبے چوڑے ادھار نہیں تھے۔ لیکن ان کے اتارتے وقت اسے یوں لگ رہا تھا کندھوں سے بھاری بوجھ ہٹتا جا رہا ہو۔

وہ جب مسکرا کر انہیں ادھار رقم کے ساتھ تحفہ پیش کرتی تو وہ شرمندہ ہو اٹھتے۔ وہ انکی بداخلاقی کے زہر کے اپنے اچھے اخلاق سے ختم کر رہی تھی۔ کچھ دکانیں ایسی بھی تھیں۔ جہاں کی وہ ریگولر بھکارن کسٹمر تھی۔

اپنے لیے شاپنگ کر کے اس نے بہت کچھ بلیوں کے لیے لیا تھا۔ راستے میں کہیں بلی نظر آتی۔ وہ محبت سے اسکے آگے کھانے کی چیز رکھ دیتی۔ وہ اس جانور کا احسان کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ پھر سے اس گلی میں گئی تھی۔ اور رات گئے تک اس بلی کا انتظار کیا تھا۔ وہ نہیں آئی تھی۔ وہ اداسی سے اٹھ آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ رکھے گی۔

اس نے اپنا اپارٹمنٹ لینے کا سوچ رکھا تھا۔روس میں تقریباً ہر چیز گورنمنٹ کی ہے۔لیکن پھر بھی پرائیویٹ سیکٹر تھا۔اور ماسکو کیونکہ بڑا شہر تھا۔سو پورے ملک سے لوگ اچھی جابز کے لیے وہیں آتے تھے۔اور پھر رہائش بھی چاہیئے ہوتی ہے۔تو وہاں رہائش بہت زیادہ مہنگی تھی۔لیکن مریم کو اپنا گھر چاہیئے تھا۔۔

وہاں کے ہوٹل اور ہاسٹل بھی مہنگے تھے۔اگر وہاں رہائش رکھتی تو اپنا گھر نہیں بننا تھا۔وہ ہفتے کے چند دن کسی ہاسٹل میں بکنگ کر لیتی تھی۔ورنہ ویسے بھی اسے باہر رہنے کا خوب تجربہ ہو چکا تھا۔وہ پیسے بچ کر اپنا گھر بنانے والی تھی۔پھر ادارے میں ایک فرنچ ٹیچر نے کہا کہ کسی رشین فیملی کے پاس پے انگ گیسٹ بن جائے۔مریم کو اس بات کا پتہ نہیں تھا۔ان کے کہنے پر وہ اب ایک بڑی سی فیملی کی مہمان تھی۔

اور وہاں رہتے وہ رشین کلچر کو دیکھ رہی تھی۔عموماً پاکستانی فیملیز کی طرح بڑی فیملیز تھیں۔پانچ چھ بچے۔۔دادا دادی کا ساتھ رہنا۔۔

جوائنٹ فیملیز۔۔یہ رہائش مہنگی ہونے کی وجہ سے بھی تھا۔پہلے جلد شادیوں کا رواج تھا اب یہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ایک طرح سے وہ مشرق ہی تھا مگر مغرب کے رنگ دکھاتا ہوا۔لباس کے معاملے میں پورا مغرب تھا۔اور روایات کے حساب سے مشرق۔۔

وہ اصل روس کو اب دیکھ رہی تھی۔ایک مڈل کلاس فیملی کے ساتھ رہتے۔اور اسے وہ لوگ بہت پسند آئے تھے۔جب اچھا وقت آتا ہے تو پھر لوگ بھی اچھے ہو جاتے ہیں۔

اگر وہ امریکیوں کی رائے پر جاتی تو روسی ذرا سنجیدہ مزاج تھے۔یا پھر ہر کسی کو دیکھ کے مسکراہٹ سے نوازنے والے۔۔خیر ایسا نہیں تھا۔اسکی ذاتی رائے کے مطابق وہ اچھے لوگ تھے۔مہمان نواز۔۔اور بہت حد تک اپنے ملک اور شہر میں خوش رہنے والے۔۔

پھر اس نے فجی قونصلیٹ میں کال کر کے اپنے کیس کا پتہ کیا تھا۔کرسٹینا بچ گئی تھی۔اور یہ کیس بھی اس کے سر سے ہٹ گیا تھا۔وہ بے حد و بے حساب خوش تھی۔دیر سے سہی مگر اچھا وقت لوٹ رہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ اپنے آپ کو اس جاب کے لیے اچھا امیدوار ثابت کرنے کے لیے بھرپور محنت کر رہی تھی۔اس کے پاس

صرف تیس سٹوڈنٹ تھے۔ان کی اور اسکی عمر میں زیادہ فرق نہیں تھا۔تقریباً ہم عمر تھے۔تو پہلے پہل اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ ان کے ساتھ کیسا تعلق قائم کرے۔پھر وہ انکے لیے دوست بن گئی تھی مگر۔۔جب ایسا ہوتا ہے تو اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ شاگرد اس دوستی کی آڑ میں لحاظ اور احترام کے پردے کو ختم کر دیتا ہے۔وہ احترام کی حدوں سے نکل جاتا ہے۔

مریم کے لیے پہلا تجربہ تھا اپنے کسی شاگرد سے کوئی بھی ایسی بات سننا۔وہ غصے میں تھی۔سٹاف روم میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ویسے تو ہر استاد کا اپنا آفس تھا۔لیکن کبھی کبھار سب اس کمرے میں مل بیٹھ کے باتیں کیا کرتے تھے۔اس نے شاگرد کو تو کچھ نہیں کہا تھا۔اب بیٹھ کے اپنے آپ کو سنا رہی تھی۔

اس وقت سٹاف روم میں ایک سینیئر استاد داخل ہوئے۔مریم نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔سر البرٹ تھے۔روسی ادب میں پی ایچ ڈی تھے۔وہ انہیں دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔اسے دیکھ کر انہوں نے مسکراہٹ اچھالی۔اور ایک جانب رکھے صوفے پر جا بیٹھے۔اور سامنے میز پر رکھا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگے۔مریم نے چند گہری سانسیں لیں تا کہ غصہ کم ہو۔ابھی واپس کلاس میں جانا تھا۔

" کیسی ہیں آپ میس (مس) مریم؟"رشین میں مس کو میس بولا جاتا ہے۔جیسے ایم کے بعد آئی کی بجائے ای لگا دیا جائے۔

انہوں اخبار کے ایک کونے کو فولڈ کر کے اسے دیکھا۔مریم نے ان سے زیادہ خوبصورت رشین زبان کسی کو بولتے نہیں سنا تھا۔ایک ٹھہراؤ تھا انکے انداز میں۔وہ زیادہ تر رشین میں ہی بات کرتے تھے۔مریم کی رشین اب اتنی اچھی ہو گئی تھی کہ وہ آرام سے بات چیت کر لیتی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔آپ کیسے ہیں سر؟"اس نے بھی لفظ سر کو رشین انداز میں کہا۔وہ ہنس دیے۔" آپ میں سیکھنے کی بہت صلاحیت ہے۔بہت جلدی آپ ہماری زبان سیکھ گئی ہیں۔"انہوں نے سراہا۔

" لیکن مشکل لفظ ابھی بھی بولنے نہیں آتے۔جب آپ بولتے ہیں تو پتہ چلتا ہے۔میں نے ابھی بھی کچھ نہیں سیکھا۔"وہ اسکی تعریف پر مسکائے۔

" لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا۔آپ میں سیکھنے کی صلاحیت ہے۔کہیں ایک دن آپ یہاں کھڑی ہو کر ہمیں

رشین زبان نہ پڑھا رہی ہوں۔"

"ارے نہیں سر رہنے دیں۔آجکل کے سٹوڈنٹس قدرے بدتمیز ہیں۔میں کبھی بھی دوبارہ ٹیچر نہیں بننا چاہوں گی۔"اسکا لہجہ تلخ ہوا۔

" کیوں کیا ہوا؟"انہوں نے ابرواچکایا۔انہوں نے اخبار کو فولڈ کر کے اسے ٹانگوں پر رکھا۔

"ہوا تو کچھ نہیں۔بس میں نے نوٹ کیا ہے آجکل کے سٹوڈنٹس اپنے ٹیچرز کی عزت نہیں کرتے۔" وہ یہ تو کبھی بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ میرے شاگرد میری عزت نہیں کرتے۔

"اس میں پہلی غلطی خود استادوں کی ہے۔ہمارے زمانوں میں معلّمی پیشے کو صرف وہی اپناتا تھا جسے شوق ہوتا تھا۔مگر آج بہت سے ایسے استاد ہیں۔جنہیں شوق تو کچھ اور بننے کا ہوتا ہے مگر بن استاد جاتے ہیں۔کیوں؟ کیونکہ جب انہیں کوئی نوکری نہیں ملتی تو پیسہ بنانے کے لیے یہاں آجاتے ہیں۔پھر جس کا شوق نہ ہو وہ کام اچھے سے ہوتا بھی نہیں ہے۔کیونکہ اس میں انسان کا خلوص نہیں ہوتا۔جب تک آپ اپنے پیشے سے مخلص نہ ہوں۔وہاں عزت نہیں ملتی۔پیسے کے لیے جاتے ہیں تو بس پھر پیسہ ہی ملتا ہے۔پھر یہاں چاند سورج کی مثال دی جاسکتی ہے۔اکٹھے نہیں آسکتے وہ۔ایسے ہی بنا خلوص کے لیے آنے والوں کو معلّمی پیشے سے صرف پیسے ہی ملتے ہیں عزت نہیں۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں اسے سمجھانے کے لیے آسان الفاظ میں بات کر رہے تھے۔اور مریم کی حالت تو یوں تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔کیا وہ جانتے تھے کہ وہ پیسے کے لیے آئی تھی۔یا ایسے ہی رینڈملی بات کر رہے تھے۔

"سر اسکا مطلب اگر انسان معلّمی پیشہ اختیار کرے تو پیسوں کی تمنا نہ کرے۔پھر اسکی معاشی ضروریات کیسے پوری ہونگی؟"اسکی بات سن کر وہ یوں ہنس دیے جیسے کسی نادان بچے کی بات پر ہنسا جاتا ہے۔

" آپ میری بات کو سمجھی نہیں ہیں۔جب آپ کسی پیشے کو اپنا شوق بنا لیتے ہیں تو وہاں سے عزت کے ساتھ پیسہ بھی ملتا ہے۔کہ محنت کبھی ضائع نہیں جاتی۔استاد کو سوچنا چاہیئے کہ ماں باپ اپنی اولاد کو جب آپ کے پاس بھیج رہے ہیں۔وہ دن کا بہت سا حصہ استاد کے ساتھ گزار رہا ہے۔تو ایسے میں صرف نصاب نہیں

پڑھایا جاتا۔ انکی تربیت کی ذمہ داری بھی استاد پر آجاتی ہے۔ گھر کی نسبت بچہ تعلیمی ادارے میں زیادہ وقت گزارتا ہے۔ اور یہاں آکے استاد وہ ملتے ہیں جو پیسے کے لیے آئے ہوتے ہیں۔ جنہیں کسی اور پیشے میں اچھے پیسے ملیں تو فوراً وہاں بھاگ جاتے ہیں۔ جن کی زندگی کا مقصد صرف خود کو کسی مقام پر لے جانا ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے لیے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں جو ملتا ہے، تو اڑ جاتے ہیں۔ پھر وہ یہ پروا نہیں کرتے کہ کسی کے جگر گوشے ان کے پاس تربیت کے لیے آئے بیٹھے ہیں۔ یاد رکھو ایک لالچی کبھی اچھا استاد نہیں بن سکتا۔ یہ دنیا کا سب سے مقدس کام ہے۔ اس میں اگر محبت اور خلوص نہ ہو تو پھر ایسا حال ہوتا ہے۔ جیسا آج کل ہو رہا ہے۔ ایسے استاد پھر ایسے ہی شاگرد بنا سکتے ہیں۔" مریم بالکل چپ بیٹھی تھی۔ پھر چہرے پر زبردستی پھیکی مسکراہٹ سجائے وہاں سے اٹھ آئی تھی۔

رات کو وہ اکیلے بیٹھ کر اپنا احتساب کر رہی تھی۔ ٹھیک ہے وہ اپنی معاشی ضروریات کے لیے گئی تھی وہاں۔ لیکن وہ اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کسی کی زندگی سے اچھے استاد کا حق نہیں چھین سکتی تھی۔ اگر وہ اچھی استاد نہیں بن سکتی تھی۔ اسکے اندر اس معلّمی پیشے کا خلوص اور احترام نہیں تھا تو اسے چھوڑ دینا چاہیئے تھا۔ کوئی نہیں چند دن اور مشکل ہو جائیں گے۔ مگر کئی انسانوں کو اس سے بہتر استاد مل سکتا تھا۔ صرف اپنے بھلے کے لیے کسی اور کی زندگی کو خراب نہیں کرنا چاہیئے۔ "میں پڑھی لکھی ہوں۔ دیر سے سہی مگر اپنے کسی شعبے میں کوئی کام مل ہی جائے گا۔ کیا میں اپنے موجودہ پیشے سے مخلص ہوں؟" وہ اپنی عدالت میں کھڑی تھی۔ اور وہ کڑی جج تھی خود کے لیے۔

"ٹھیک ہے میں پیسے کے لیے گئی تھی۔ مگر میں نے ہر دن انہیں پڑھانے کے لیے محنت کی ہے۔ میں اب تک خود کو اس نوکری کے لیے اچھا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اب میں خود کو اچھی استاد بنانے کے لیے محنت کرونگی۔ میں اپنے پورے خلوص سے اس پیشے کو اپناؤنگی اور جی جان لگا دونگی۔ معلّمی پیشہ ایک پیغمبری پیشہ ہے۔ میں اسکی حرمت پامال نہیں کرونگی۔ کبھی نہیں۔۔" وہ خود سے عہد کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

پورا ایک سال پیسے جوڑ جوڑ کر وہ آج اپنا گھر لینے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا۔ وہ

ایک سال کے ایگریمنٹ پر ایک پرائیویٹ بلڈنگ میں اپارٹمنٹ لینے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اور اس وقت وہاں کوئی سامان نہیں تھا۔ سارے پیسے وہ اسے لینے میں لگا چکی تھی۔ وہ خوشی سے اسکے ایک ایک کونے کو دیکھ رہی تھی۔

"میرا گھر۔ کتنا سکون ہے یہاں۔۔" اس نے درمیان میں کھڑے ہو کر آنکھیں بند کر کے بازو پھیلا لیے۔ پھر اسکے بعد سے وہ اس گھر کے لیے ایک ایک چیز جوڑتی رہی۔ زندگی میں خوشیاں تو نہیں آئی تھیں۔ مگر اب وہ اتنے میں ہی خوش تھی کہ وہ عزت کے ساتھ رہ رہی تھی۔

وہ دودنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ کوئی اسکا پیچھا کرتا ہے۔ وہ اندر سے ڈر گئی تھی۔ اب آ کے تو زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں ہوئی تھی۔ مزید اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ کسی مصیبت کو جھیل سکتی۔ ایک دو بار چپکے سے گردن موڑ کر اس نے دیکھا تھا مگر کوئی نہیں نظر آیا تھا۔ " کہیں فجی مافیا والے تو نہیں تھے؟ انہیں کیا معلوم میں کہاں ہوں۔۔ ابو یا علی۔۔۔ ناممکن۔۔ وہ بس پاکستان تک ہی ڈھونڈیں گے۔۔ ان کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ مریم کبھی ملک چھوڑ سکتی ہے۔۔ حاشر۔۔" آخری نام ذہن میں آتے چند لمحے کو سانسیں رکی تھیں۔" وہ طلاق دے چکا ہے وہ کیوں آئے گا۔۔ اسکا کیا واسطہ۔۔" وہ اپنی ہر سوچ کو خود رد کر رہی تھی۔ پھر اس نے تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔ ان گزرے ڈیڑھ سالوں میں وہ ماسکو کی گلیوں سے خوب واقف ہو چکی تھی۔

بہت سی گلیاں عبور کر کے وہ ایک ٹیکسی کر کے گھر آ گئی تھی۔ لیکن یہ کوئی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اگر وہ کل بھی یوں ہی اسکے پیچھے آیا۔ کہیں گھر تک نا پہنچ جائے۔۔ وہ سوتے سے اٹھ کر جلدی سے بھاگی۔ ساری کھڑکیاں چیک کی تھیں۔ دروازے کے آگے گھسیٹ کے ایک بھاری چھوٹی الماری دے دی تھی۔ مگر پھر بھی اس رات اسے خوف سے نیند نہیں آئی تھی۔

اگلے دن گھر سے نکلنے سے پہلے وہ سوچتی رہی۔ اپنے بچاؤ کے لیے کیا ترتیب اختیار کرے۔ اس نے فریج کھولا اور کتنی دیر وہاں رکھی چیزوں کو دیکھتی رہی۔ مالٹوں پر نظر پڑتے ہی اس کے دماغ میں آئیڈیا آیا۔ اب وہ تیزی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ پھر نکلنے سے پہلے وہ نادیدہ دشمن سے لڑنے کے لیے اچھی طرح تیار ہو کے نکلی تھی۔

آج رات کو اس نے مسز اینا کے گھر ڈنر پر جانا تھا۔اور بھی ٹیچرز مدعو تھے۔وہاں جاتے ہوئے راستے میں اسے پھر محسوس ہوا تھا۔کوئی اسکے پیچھے ہے۔اس وقت وہ ایک رش والے ایریا سے گزر رہی تھی۔

رات کو دس بجے وہاں سے فارغ ہو کر جب وہ نکلی تو ایک ٹیچر نے اسے ڈراپ کرنے کی آفر کی تھی۔اس نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔بہار کا موسم تھا۔بہت خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔اس کا پیدل چلنے کا موڈ تھا۔وہ اپنے پیچھے آنے والے بندے کو بھول چکی تھی۔اس ڈنر نے اسکا موڈ اچھا کر دیا تھا۔وہ ابھی پر رونق علاقے سے گزر رہی تھی۔جیسے ہی وہ اپنے گھر جانے کے لیے کم روشن گلی میں گئی۔اسے اپنے پیچھے واضح قدموں کی چاپ محسوس ہوئی تھی۔

وہ مسکرائی۔جو بھی ہو آتے رہو۔آج تو تمہیں خوب سبق سکھاؤنگی۔وہ جو بھی تھا یا تو بے وقوف تھا یا پھر اسے ڈرانا چاہتا تھا۔ورنہ قدموں کی آواز پیدا کیے بنا آتا۔مریم نے کندھوں پر لٹکے بیگ کو اتار کر سامنے کر لیا تھا۔اب وہ اس میں سے کچھ نکال رہی تھی۔دوسرے ہاتھ میں موبائل نکال کر پولیس کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔کال ملائی نہیں تھی۔

اور اسی وقت پیچھے سے آتے شخص نے ایک دم سے جھپٹ کر اس کے بیگ کو دبوچنا چاہا۔مریم نے ایک مٹھی میں سے نمک مرچ کا مکسر اسی تیزی سے اس کے منہ پر اچھالا۔

" آہ۔۔" وہ تیزی سے پیچھے ہوا تھا۔اور اپنے منہ کے آگے دونوں ہاتھوں کو پنکھے کی طرح جھل رہا تھا۔یہ مکسر اسکی آنکھوں میں گیا تھا۔مریم نے جلدی سے دوسری مٹھی بھر کر آگے بڑھ کر اسکے کھلے منہ میں ٹھونسی۔وہ کوئی غیر ملکی تھا۔

اور انہیں انڈین مرچوں کی تیزی کا کیا معلوم۔ہاں بھلا انہیں کیا معلوم۔۔وہ تھو تھو کر رہا تھا۔ایک تو آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں اور منہ میں مرچیں بھر گئی تھیں۔مریم نے جلدی سے پولیس کو کال ملائی۔وہ چیخ رہا تھا۔اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔مریم نے بیگ سے ایک تیز چھری نکال کر اب اسکی جانب بڑھائی ہوئی تھی۔اگر اب بھی وہ کچھ کرتا تو وہ اسے زخم دے دیتی۔مگر وہ بچارا ان مرچوں سے ہی نہیں نکل پا رہا تھا۔" پانی۔۔پانی۔۔۔" مرچوں کی وجہ سے بے چارا توتلا ہو رہا تھا۔

"اب کیوں پانی پانی۔۔کوئی نہیں ملنا پانی۔۔" وہ اسی طرح چھری بڑھائے کھڑی تھی۔" خبردار بھاگنے کی کوشش کی۔۔چھری تمہارے پیٹ میں ڈال کے پھر اس پر بھی نمک مرچ ڈال دوں گی۔۔بیٹھے رہو آرام سے۔۔" وہ نیچے گرا اب بے حال ہو رہا تھا۔مریم کی رشین زبان میں دی دھمکی اسے خوب سنائی دی تھی۔

جلتی بجھتی آنکھوں کے ساتھ وہ بھاگنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔وہ خونخوار لڑکی اس کے پیٹ میں بھی وہ مکسر گھسا سکتی تھی۔تھوڑی دیر گزری تھی۔پولیس وہاں آگئی تھی۔پھر وہ دونوں ہی پولیس اسٹیشن میں تھے۔

"اس نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔اس نے سمجھا میں اکیلی ہوں تو آسان شکار ہوں۔لیکن میں نے اپنا بچاؤ کرلیا۔"

"یہ زہریلی عورت ہے۔۔ہائے کوئی پانی پلاؤ۔۔میں مرجاؤنگا۔۔" وہ کب سے یہی صدائیں لگا رہا تھا۔پولیس والوں نے اسکی نہیں سنی تھی۔اس نے غصے سے اسکی زہریلی عورت کی صدا پر اسے گھورا تھا۔وہ بیس یا اکیس سال کا لڑکا تھا۔سر کے بال ہلکے بھورے تھے۔اور بہت گوری رنگت تھی۔قد مریم کے برابر تھا۔

وہ بولتا جارہا تھا۔اسے دوسری جانب لے گئے تھے۔اب مریم ایک افسر کے سامنے بیٹھی اپنا بیان دے رہی تھی۔" کیا پہلے اس لڑکے نے آپ کو تنگ کیا ہے؟"

"میں کافی دنوں (دو دن) سے نوٹ کر رہی تھی۔کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔لیکن جب مڑ کر دیکھتی تو کوئی نہیں ہوتا تھا۔آج میں اپنی ایک کولیگ کے گھر سے ڈنر کر کے جارہی تھی کہ اس نے اندھیری گلی کا فائدہ اٹھا کر میرا بیگ چھیننا چاہا۔" ایک جانب اسکے بیگ کی تلاشی ہو رہی تھی۔جہاں سے دو کتابوں اور لیکچر نوٹس کے ساتھ ساتھ مالٹے،امرود اور ایک کاغذ کی پڑی سے نمک مرچ کا مکسر نکلا تھا۔

اور ایک تیز دھار چھری۔تھی وہ سبزی کاٹنے والی۔مگر تیز تھی بہت۔پھر وہ ساری چیزیں ایک افسر نے آگے بڑھ کر اسکے سامنے ٹیبل پر رکھ دیں۔" کیا یہ سب آپکا ہے؟"

"جی۔"اس نے اعتماد سے جواب دیا۔" چھری کیوں ہے؟اور نمک مرچ کا مکسر۔۔" وہ کڑے تیوروں سے پوچھ رہا تھا۔" دیکھیں۔مجھے مالٹے اور امرود بہت پسند ہیں۔ٹیچر ہوں آدھا دن باہر گزرتا ہے تو کچھ اور کھانے کی بجائے اپنے فیورٹ فروٹس کھاتی ہوں۔اور میں بہت مہذب لڑکی ہوں۔فروٹس کو کاٹ کر کھانا پسند

کرتی ہوں۔اس لیے چھری ساتھ رکھتی ہوں۔اور جیسا کہ آپ نے میرا پاسپورٹ دیکھا میں پاکستانی ہوں تو مجھے بتانے دیں کہ ہمارے ہاں امرود اور مالٹے کاٹ کران پر یہ مکسر لگا کر کھایا جاتا ہے۔یونو ہم لوگ تیکھا کھاتے ہیں۔"مریم کا اعتماد دیکھنے کے قابل تھا۔

"تو وہ اس لیے چیخ رہا تھا آپ نے اس پر یہ مکسر ڈالا تھا۔"

"میں اس وقت مالٹے کاٹ کر کھانے والی تھی۔اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔پھر بندہ اپنے بچاؤ کے لیے جو اسکے ہاتھ میں ہوتا ہے کرتا ہے۔"اسکی معصومیت پر اس وقت فدا ہوا جا سکتا تھا۔

مگر وہ پولیس والے اس سب میں آنے والے نہیں تھے۔وہ اسی طرح کڑے تیوروں سے اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔

"میں یہاں ایک استاد ہوں۔میری معاشرے میں ایک عزت ہے۔اگر روس میں اسکے استادوں کو تحفظ نہیں دیا جا سکتا تو آپ بتا دیں۔کوئی بھی غیر ملکی آ کر کسی استاد کو ہراساں کرتا ہے اور پھر اس انسان کو غلط کہنے کی بجائے استاد کو غلط کہہ کر انٹروگیٹ کیا جاتا ہے۔واہ میں تو روس کے قانون کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی مجھے کیا معلوم تھا یہاں باہر سے آئے مہمان اور استاد کی کوئی عزت نہیں ہے۔"ان کے مسلسل سوالوں کے بعد وہ بالآخر جھنجلا کر بول اٹھی تھی۔اور پھر اس کے سامنے بیٹھا افسر ایک دم سے سیدھا ہو بیٹھا تھا۔"

نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ہم بس جرم کی روک تھام کے لیے اسطرح سے سختی سے سوال کرتے ہیں۔"

"تو مجرم سے کریں۔"اس نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

پھر مریم نے اپنا ایک الگ سٹیٹمنٹ دیا تھا۔کہ اسے اس شخص سے خطرہ تھا۔آنے والے وقتوں میں اگر اسے کوئی بھی جانی و مالی نقصان پہنچا تو اسکا ذمہ دار وہ شخص ہوگا۔اور اگر وہ شخص اسے مارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر وہ اپنے قاتل کے لیے ایک ہی سزا تجویز کرے گی کہ اسے کوبرا سانپ سے ڈسوایا جائے۔نیچے اپنا نام لکھ کر اس نے کاغذ افسر کی جانب بڑھایا۔جو زیرلب ہنستے اس پاگل لڑکی کا بیان پڑھ رہا تھا۔آخری لائن پر اس نے بمشکل اپنا قہقہہ روکا تھا۔وہ ایسے پاگلوں سے روز نمٹنے کے عادی تھے۔اس جیسے کئی نمونے پھرتے تھے وہاں۔

پھر اسکے اٹھنے سے پہلے اس لڑکے کو وہاں لے آئے تھے۔اسکی حالت اب بہتر تھی۔مریم نے نخوت سے منہ پھیرا۔ہونہہ مجھے زہریلی عورت کہا۔۔اب تم خود کو برا کے زہر سے مرو گے۔

"اس نے جان بوجھ کے مجھ پر نمک مرچ ڈالی ہے۔یہ زہریلی عورت ہے۔۔" وہ پھر سے چلایا تھا۔مریم جو اٹھنے لگی تھی۔اس نے بیگ کندھے سے اتار کر اس میں سے ایک مالٹا نکالا۔

"رکیں میں اپنی سچائی ثابت کر کے جاؤنگی۔" اس نے مالٹے کے دو حصے کیے۔پھر پڑی سے مکسر نکال کر اسے چٹکیوں میں بھر کر مالٹے کے دونوں حصوں پر لگایا۔اور ایک حصہ اٹھا کر اسے اپنے منہ کے قریب لے جا کر نچوڑا۔" آئی۔۔۔"

رس بہت کھٹا تھا اور مرچ کی تیزی نے اسکی زبان پر جیسے آگ لگا دی تھی۔لیکن وہ ضبط سے مسکرائی۔" دیکھا ہمارے ہاں مالٹے ایسے کھائے جاتے ہیں۔" زبان جل رہی تھی۔پھر وہ بنا کچھ کہے مڑی۔" مس اپنے مالٹے کا دوسرا حصہ بھی لیتی جائیں۔" افسر نے مسکرا کر پکارا۔وہ پلٹی۔اور زبردستی مسکرائی۔جھک کر مالٹے کا دوسرا حصہ اٹھایا۔اور تیزی سے وہاں سے نکلنے لگی۔" خدا کرے تم سب کے سب مر جاؤ۔۔"

وہ باہر نکل کر ایک دیوار سے ہاتھ ٹکائے انہیں کوس رہی تھی۔مرچوں نے زبان کا برا حال کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

تین دن کے بعد وہ لڑکا اس کے پھر پیچھے تھا۔مریم کے بیگ میں ہاتھ جاتے دیکھ کر وہ چلا کر اسکے سامنے آیا تھا۔" مت کرو مت کرو۔۔میں اب چوری کرنے نہیں آیا۔میں تو تمہاری حفاظت کے لیے آیا ہوں۔۔"

" تمہیں کس نے کہا تم میری حفاظت کرو۔۔" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

" جو تم وہاں بیان دے کے آئی ہو۔اس کے بعد تو میں نے آنا ہی تھا۔یعنی تمہاری کہیں بھی دشمنی چل رہی ہو مگر نام تم میرا دے آئی ہو۔اسکے بعد میں اپنے بچاؤ کے لیے اور کیا کر سکتا تھا۔یہی کہ تمہاری حفاظت کروں تا کہ نا تم کسی مصیبت میں پھنسو۔نا ہی میں۔۔چالاک عورت۔۔" مریم اب رک کر اسے گھور رہی تھی۔وہ اس سے عمر میں چھوٹا تھا مگر تو تڑاخ کے ساتھ بات کر رہا تھا۔" روسی ہو؟"

"نہیں۔۔آذربائیجان سے ہوں۔"

"روسی زبان کیسے جانتے ہو؟"

"جیسے تم۔۔"وہ لڑکا اس سے جلا ہوا تھا۔" تمہیں کس نے میرے پیچھے لگایا تھا۔"

"میری بدنصیبی نے۔۔تم نے مجھ سے میری آزادی بھی چھین لی۔میں کہیں بھی چلا جاؤں اور پیچھے تم مر گئی تو مجھے کو برا سانپ سے ڈسوایا جائے گا۔

"اب کے مریم کو ہنسی آ گئی تھی۔"

دیکھو تم بہت اچھی لڑکی لگتی ہو۔میرے خلاف کمپلین واپس لے لو۔میں نے اور بھی کام کرنے ہیں۔ہر وقت تمہاری حفاظت نہیں کر سکتا۔۔"

"اتنے بے وقوف ہو کہ بننے کی کوشش کر رہے ہو۔۔"

"تمہیں بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"تمیز سے بات کرو۔"وہ سر جھٹک کر چلنے لگی۔

ایک تو عمر میں چھوٹے لوگ جب تو تڑاخ کریں دل چاہتا ہے ایک تھپڑ رسید کیا جائے تا کہ ان کے ہوش ٹھکانے آئیں۔اب وہ بھی اسکے برابر چل رہا تھا۔مریم نے رک کر اسے گھورا۔

"میرے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اور پھر چلنے لگی۔وہ ڈھیٹ پھر بھی ہم قدم تھا۔تین بجے کا وقت تھا۔ٹریفک رواں دواں تھی۔اور وہ پیدل چلنے کی شوقین اگلے سٹاپ پر میٹرو استعمال کرنے والی تھی۔چلتے چلتے وہ اب سورج کے سامنے تھی۔اس نے ہاتھ کی آڑ بنالی تھی تا کہ دھوپ آنکھوں میں نا جائے۔

"ویسے میں نے تو سنا تھا پاکستانی لڑکیاں بہت ڈرپوک ہوتی ہیں۔لیکن تم نے تو میرا ستیاناس کر دیا تھا۔"

" کس سے سنا ہے؟"اردگرد ٹریفک کا شور تھا۔

"میرا ایک پاکستانی دوست تھا اس سے۔وہ کہتا تھا پاکستانی لڑکیاں کاکروچ سے ڈرتی ہیں۔چھپکلی دیکھ لیں تو چیخیں مار کے بھاگ جاتی ہیں۔۔سنو کیا تم واقعی پاکستانی ہو؟" وہ مشکوک انداز میں اسے دیکھتا جا رہا تھا۔مریم نے دھوپ سے تنگ آ کر بیگ سے سن گلاسز نکال کر لگ لیے تھے۔

"تم نجانے کن زمانوں کی بات کر رہے ہو۔شاید سن اٹھارہ سو اسی میں ایسا ہوتا ہو۔پاکستان کی لڑکیاں بہت بہادر ہوتی ہیں۔اپنا ہر کام خود کرتی ہیں۔اور ڈر۔۔۔یہ چھری چاقو چلانا تو ہمیں بچپن میں ہی سکھا دیا جاتا ہے۔کاکروچ اور چھپکلیاں۔۔۔یہ چیز ہی کیا ہیں۔ہمیں تو سانپ سے ڈر لگتا ہے نہ مگرمچھ سے۔۔۔پتہ نہیں تم کونسے زمانوں کی بات کر رہے ہو۔۔۔" وہ مریم عالم تھی۔جو اپنے آپ میں لوٹ آئی تھی۔

"لیکن پاکستان تو انیس سو سینتالیس میں بنا تھا۔" اس لڑکے نے جیسے اسکا جھوٹ پکڑا۔مریم نے کندھے اچکائے۔"یہی تو کہہ رہی ہوں۔پاکستان میں تو کبھی ڈرپوک لڑکیاں پیدا ہی نہیں ہوئی ہیں۔تم شاید اٹھارہ سو اسی کی بات کر رہے ہو۔تب تو پاکستان بنا ہی نہیں تھا تو ایسی لڑکیاں کیسے ہوسکتی ہیں؟ اس زمانے میں ایشیا کی لڑکیاں سنا ہے ایسے ہی ڈرتی تھیں۔کسی بھی چھوٹی سی بات پر بہت بڑی چیخ مارنا۔پھر پورے گھر کو اکٹھا کرنا۔ایک چھپکلی دیکھ کر رونا دھونا۔۔۔" وہ مزے سے اسے بتائے جا رہی تھی۔

اور وہ دل ہی دل میں اپنے پاکستانی دوست کو کوس رہا تھا۔جس نے کہا تھا پاکستانی لڑکیاں بہت ڈرپوک ہوتی ہیں۔اس لیے وہ دو تین دنوں سے اس لڑکی کا پیچھا کر رہا تھا۔کنفرم کر رہا تھا کہ اکیلی ہی ہے۔پھر اس کا بیگ چوری کرے گا۔اور کیونکہ وہ پاکستانی لڑکی تھی۔چیخنے کے بعد بے ہوش ہو جاتی۔مگر نہیں اسکے دوست پر لعنت تھی جس نے اس سے غلط بیانی کر کے اسے پھنسا دیا تھا۔

وہ اسے اپنے پیچھے آنے کی وجہ بتا چکا تھا۔بھوکا تھا۔اس لیے اسے پیسے چاہیئے تھے۔ایک دن میٹرو میں اسے دیکھا۔لباس سے پہچان گیا تھا کے پاکستانی لڑکی ہے۔پھر اسے ہی ٹارگٹ کرنے کا سوچا۔کیونکہ آسان ہدف تھی وہ۔اسے بھی پہلے چوری کا تجربہ نہیں تھا اس لیے دو دن صرف اسکا پیچھا کرتا رہا۔

"تم کیوں آئے ہوروس۔۔" وہ دونوں اب میٹرو میں تھے۔مریم نے جان لیا تھا۔وہ لڑکا اس کے لیے بے ضرر تھا۔اور اگر نقصان پہنچانے کی غلطی کر بھی لیتا تو کوبرا زندہ باد۔۔

"چاچا کے گھر پلا بڑھا تھا۔اسکی بیوی نے چوری کا الزام لگا کر نکال دیا تھا۔پھر پیسے کچھ نہیں تھے۔ایک ٹرک میں چھپ کر یہاں آ گیا تھا۔اور جیب خالی ہونے پر چوری کا سوچا تھا۔" اس لڑکے نے چند جملوں میں اپنا درد بیان کر دیا تھا۔پھر مریم نے اسے اتنے پیسے دیے تھے کہ آرام سے کئی دن کھا لیتا۔

اور نا چاہتے ہوئے بھی عادت سے مجبور ہو کر اپنی ایک کولیگ کی مدد سے اسے ایک سٹور میں جاب دلوا دی تھی۔انسان جو بھی کر لے عادت بدلتی ہے فطرت نہیں۔۔مریم عالم ایسی ہی ہمدرد فطرت لے کر پیدا ہوئی تھی۔دوسروں کے غم سن کر اپنے دکھ بھرے مشکل دن بھلا دیے تھے۔ہاں ٹھیک ہے اس نے اس پر اعتبار نہیں کیا تھا مگر اسکی مدد کرنے سے بھی خود کو نہیں روک پائی تھی۔وہ اپنے آپ میں لوٹ رہی تھی۔

☆......☆......☆

حاشر مریم کو چھوڑ کر دوبارہ پولیس کے آئی ٹی ڈپارٹمنٹ آ گیا تھا۔آج پھر نئی فائلز کھل رہی تھیں۔اسکے ساتھ پکڑے جانے والی اور لڑکیوں کے ڈیوائسز سے بھی بہت کچھ نکل رہا تھا۔وہاں بیٹھے مرد حیران تھے۔عورت اس حد تک بھی گندگی میں جا سکتی ہے۔وجہ کچھ بھی رہی ہو۔یہ جرم تو نا قابل معافی تھا۔باقی لڑکیوں کے لیے کوئی آیا بھی نہیں تھا۔حیرت انگیز طور پر وہ سب لڑکیاں لاوارث تھیں۔پولیس ان سے پوچھ پوچھ کر تھک چکی تھی۔

پھر اسکے بعد پولیس نے ایک دو اور جگہوں پر چھاپے مارے تھے۔مردوں کے ساتھ بہت سی خواتین بھی پکڑی گئی تھیں۔ایک نئے آنے والوں میں سے بول پڑی تھی۔"یہ سب مریم عالم کے کہنے پر ہوتا تھا۔" وہ اتنی مار کھانے کے بعد اپنا منہ کھول چکی تھی۔حاشر تو پاگل ہوا اٹھا تھا۔وہ اندر جا کر اس عورت کا منہ توڑ دینا چاہتا تھا۔مگر پولیس والوں نے اسے باہر بھیج دیا تھا۔

"اب بتائیں میر صاحب۔اب گواہیاں بھی ملنے لگی ہیں۔" ایس پی طنز سے اسے دیکھتے کہہ رہا تھا۔

"پوری دنیا بھی کھڑی ہو کر کہنے لگے تب بھی نہیں مانوں گا۔یہ جرم اس نے کیا ہے۔میں انسانوں کی اتنی پہچان رکھتا ہوں کہ ان کے چہروں کے پیچھے چھپی اصلیت جان لوں۔سات ماہ۔۔سات ماہ تک وہ میری بیوی رہی ہے۔اگر ایسی کوئی بھی بات ہوتی تو مجھے پتہ چل جاتا۔"

" صحیح بات تو آپ نے خود کہہ دی۔صرف سات ماہ سے اسے جانتے ہیں۔ہو سکتا ہے۔اس نے آپ کو ٹارگٹ کیا ہو۔آپ کی معاشی حیثیت کو دیکھ کر آپ کو بھی پھنسانے کی کوشش کی ہو۔"

"ایس پی میں تمہارا منہ توڑ دونگا۔اسے میری آخری وارننگ سمجھو۔یاد رکھو وہ عورت جب تک میرے نکاح

میں ہے۔وہ میری عزت ہے۔" وہ غصے سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

ایس پی اسکے غصے کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔اب تک اسے اتنا تو معلوم ہو گیا تھا۔اس کا بہت اثر ورسوخ تھا۔اور اس سے پنگا لینے کا مطلب اپنا خاندان تباہ کرنا تھا۔بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں لے جا کر مارتا تو بچانے بھی کسی نے نہیں آنا تھا۔۔

حاشر اپنے کمرے میں یہاں سے وہاں ٹہل رہا تھا۔اسے کسی طور سکون نہیں تھا۔خدا جانے زندگی میں سکون پھر کب آنا تھا۔زندگی میں کبھی اتنی بے بسی محسوس نہیں ہوئی تھی جواب ہو رہی تھی۔یوں تھا کہ جیسے کسی نے زندگی کے پر سکون تھال کو الٹ کر رکھ دیا ہو۔ہر چیز بکھر رہی تھی۔اسکا دل جل رہا تھا۔

ابھی تک تو وہ اپنے خاندان کو نہیں بتا پایا تھا۔یہ بتانے کی بات تھی بھی نہیں۔اسکی غیرت کو گوارہ نہیں تھا کہ اسکی بیوی پر لگے جھوٹے الزامات کی بھنک بھی کسی کو پڑے۔مگر یہ ناممکن تھا۔ایک ماہ کے اندر بابا جان کو پتہ چل گیا تھا۔انکے اپنے ذرائع تھے۔پھر اسکے باقی بھائیوں کو بھی اپنے مختلف ذرائع سے بات پتہ چل گئی تھی۔وہ خاندان کے سارے مرد سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔حاشر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنسائے بہت بے چین بیٹھا تھا۔وہ سب اسے تسلیاں دے رہے تھے۔اس مسئلے کا حل سوچ رہے تھے۔اسکا ایک بھائی بول اٹھا تھا۔" ادا ہوسکتا ہے وہ واقعی آپ کو پھنسانے آئی ہوں۔ایسے بھی تو کئی واقعات ہیں دنیا میں۔۔"

" حیدر۔۔۔" وہ ضبط سے اسے دیکھنے لگا۔" حیدر تم چپ رہو۔" اسکے بڑے بھائی نے اسے ڈانٹا۔حیدر چپکا ہو گیا۔لیکن وہ یہی سوچ رہا تھا کہ سات ماہ پہلے ملنے والی لڑکی ہوسکتا ہے جان بوجھ کر ٹکرائی ہو۔ان کے خاندان کا نام خراب کرنے کے لیے ان سے رشتہ جوڑا ہو۔مگر وہاں تو کوئی اسے بولنے نہیں دے رہا تھا۔

" تم پریشان نہ ہو۔ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" اسکے ایک سوتیلے بھائی نے آگے بڑھ کر اسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔حاشر نے اسکے کندھے پر رکھے ہاتھ کو تھپتھپایا۔" خواتین تک یہ بات نہیں جانی چاہیئے۔" اٹھنے سے پہلے اس نے آخری بات کہی تھی۔

☆......☆......☆

ان کے خاندان کا پہلا واقعہ تھا۔انکے گھر کی عورت کا یوں تھانوں میں نام آیا تھا۔اس پر انویسٹی گیشن ہو

رہی تھی۔اور اگر جرم کی نوعیت کوئی پوچھ لیتا تو پھر موت تھی۔۔

کوئی سوچ رہا تھا کہ اسے اپنوں کو چھوڑ کر غیروں میں شادی کرنی ہی نہیں چاہیئے تھی۔غیروں کا کیا معلوم کیسے ہوں۔۔وہاں بیٹھے ہر شخص کی اپنی رائے تھی۔مگر پھر بھی وہ اسکے ساتھ تھے۔کیونکہ وہ بھی اسی خاندان کا حصہ تھے۔انکی بھی عزت تھی وہ۔

نیناں اور ناز جب اگلے سمسٹر کے لیے وہاں پہنچی تھیں تو حاشر نے انہیں ہاسٹل جانے سے منع کر دیا تھا۔گھر کے قدرے الگ حصے میں دونوں کے لیے روم سیٹ کروا دیا تھا۔

اور جس دن وہ یونی پہنچیں تو انہیں معلوم ہوا کہ انکا بھائی شادی کی تاریخ آگے کرنے کو کیوں کہہ رہا تھا۔جب بھی اماں کہتیں کہ چلو اب شادی کی تاریخ لینے چلیں۔وہ اپنی مصروفیت کا بہانہ کر دیتا۔ابھی شادی کے لیے ٹائم نہیں۔بابا جان بھی ان کا ساتھ دیتے تھے۔انکے ہاسٹل کی ایک لڑکی مل گئی تھی۔جس نے بتایا۔

"مریم کو پولیس لے گئی تھی۔بہت گندے الزام لگا رہے تھے اس پر۔کہ وہ اچھی نہیں ہے۔اور۔۔" بولتے ہوئے اسکی آواز سرگوشی میں تبدیل ہوتی گئی۔اسکی بات کے بعد نیناں نے اسے وارن کر دیا تھا کہ یہ بات اور کسی کو نہ بتائے۔اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔کہ مریم ایسی تھی۔اگر تھی بھی تو انکے خاندان سے جڑی تھی۔یوں ہر دوسرا شخص اگر اسکے بارے میں سرگوشیاں کرتا رہتا تو انکے خاندان کی عزت کا جنازہ نکل جانا تھا۔

ایک بات تو بچپن سے انکی گھٹی میں ڈال دی گئی تھی۔اپنے خاندان کی عزت کا ہر صورت خیال رکھنا ہے۔ذاتی اختلافات کے باوجود باہر کے کسی شخص کو اپنے خاندان کے فرد پر بات نہیں کرنے دینی۔وہ لڑکی اسکی وارننگ سے ڈر گئی تھی۔"میری بات سنو۔دوبارہ یہ بات تم کسی سے نہیں کہو گی۔"

"سارے ہاسٹل کو پتہ ہے۔۔"

"یونی کو تو پتہ نہیں ہے۔۔اور اگر کسی کو ہے بھی تو میں اسے بھی دیکھ لوں گی۔اگر اس نے بھی کہیں اور جا کر سرگوشیاں کیں۔تو میں اسے بتا دوں گی نیناں میر کس کو کہتے ہیں۔غور سے سنو مریم عالم میری بھابھی ہے۔میرے خاندان کی عزت۔۔جو میرے خاندان کی عزت کو سر عام اچھالے گا اسے پھر اسکی اوقات بتا دی جائے گی۔اپنا منہ سی لو۔۔جا کر ان سب کو بتا دو جنہیں معلوم ہے۔"

اس کے بعد ان دونوں سے وہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔حاشر کو بلا لیا تھا۔انہیں گھر جانا تھا۔ناز چپ تھی۔جب حاشر لینے آیا تو نیناں کے پوچھنے پر وہ ایک جھٹکے سے مڑا تھا۔انہیں کس نے بتایا۔پھر پوری بات پتہ چلنے پر حاشر لب بھینچ کر رہ گیا تھا۔اس نے تھانے سے نام نکلوا لیا تھا جو دیکھ رہے تھے انکی زبانوں کا تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"ادا آپ فکر نہ کریں۔یہاں یونی میں،میں دیکھ لوں گی۔" حاشر نے محبت سے بہن کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ایسی محبتیں نایاب ہوا کرتی ہیں بہت نایاب۔۔وہ مریم کے لیے اس لیے لڑ کر آئی تھی کیونکہ وہ اسکے بھائی کی بیوی تھی۔جن سے محبت ہو ان سے منسلک لوگوں سے بھی محبت رکھنا۔سب کے بس کی بات نہیں ہوتی۔مگر یہ انکے خاندان کا شیوہ تھا۔

اتنے ٹینشن بھرے دنوں میں بس یہی ایک اچھی بات ہوئی تھی۔" آپکی بھابھی سے بات ہوئی۔وہاں تو آپ کو پتہ ہے موبائل نہیں ہوتا ہمارے پاس۔۔کوئی رابطہ ہی نہیں ہو سکا۔"

" نہیں۔اس کا موبائل یہیں ہے۔اسکے گھر والوں سے رابطہ ہے۔ٹھیک ہے وہ۔" پھر بہنوں کو گھر ڈراپ کر کے وہ آفس آ گیا تھا۔

☆......☆......☆

اور پھر ہوا یوں کہ انکے خاندان میں یہ بات پھیل گئی تھی۔حاشر تو غصے سے پاگل ہونے کو تھا۔اماں،ادی زہرہ،رقیہ سب ادھر آن پہنچی تھیں۔وہ نیناں سے پوچھ رہا تھا۔گھر والوں کو کس نے بتایا تھا۔وہ بھائی کو غصے میں دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ناز تو تھر تھر کانپنے لگی تھی۔کیونکہ اس نے صرف اپنی ماں کو بتایا تھا۔انہوں نے فٹ سے سوتن کو طعنہ دے ڈالا تھا۔اور ادی زہرہ کو بھی بتا دیا تھا۔

پھر رہا کیا تھا۔گھر کی عورتوں سے لے کر ملازماؤں تک بات پھیل گئی تھی۔اور ان سے پھر ان کے پورے علاقے میں۔کوئی انکے پاس افسوس کے لیے آ رہا تھا۔کوئی یہ بتانے کہ "انہیں یقین ہی نہیں آیا۔سوچا خود جا کے پوچھیں۔" ہاجرہ بی بی تو رونے لگ گئی تھیں

۔پھر اپنے سوتیلے بیٹے کے ہمراہ وہ سب اسلام آباد آئی تھیں۔یہ کام بس دو دن میں ہوا تھا۔صحیح بات ہے

عورتوں سے زیادہ تیز سروس دنیا میں کوئی پیدا نہیں ہوئی۔حال یہ کہ گولی اندر دم باہر۔۔حاشر تو ویسے ہی مصروف تھا۔بزنس کو تو سرسری دیکھ رہا تھا آجکل۔لیکن پھر بھی آفس جا رہا تھا۔وہاں سے پولیس اسٹیشن۔سیاسی کاموں کو سٹاپ کیا ہوا تھا۔اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔عورتوں نے کیا کام کر دکھایا تھا۔جب خبر ہوئی۔پانی سر سے اونچا جا چکا تھا۔علاقے کے کمی کمین بھی اسکی بیوی پر باتیں کر رہے تھے۔دبے لفظوں میں سہی۔اسکی بیوی کا نام مردوں میں آ گیا تھا۔وہ مر جانے کو تھا۔یہ آخری حد تھی۔

وہ اپنے کمرے میں دونوں ہاتھوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔بس آنسو نہیں چھلکے تھے۔باقی تو کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔محبت کی اتنی بڑی سزا مل رہی تھی۔اتنی ذلت اور رسوائی۔۔پھر نیناں نے آ کر بتایا تھا کہ ناز نے اپنی ماں کو بتایا تھا۔

پھر انہوں نے جان بوجھ کر پورے خاندان میں اور نوکروں تک میں پھیلا دیا تھا۔نیناں کا چہرہ ستا ہوا تھا۔وہ رو رو کر آئی تھی۔اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ناز انکے ساتھ ایسا کر سکتی ہے۔اور ناز روئے جا رہی تھی کہ اسے کیا معلوم تھا اسکی ماں بات کو اتنا پھیلا دیں گی۔سوتن کو نیچا دکھانے کے لیے اپنی بہوؤں کو ساتھ بٹھا کے گھر کے نوکرانیوں کی اسی کمرے میں مختلف ڈیوٹیاں لگا کر انہوں نے ہاجرہ بی بی کو خوب ہی ذلیل کیا تھا۔مقصد بات پھیلانا تھا۔

دیکھو میری بہوئیں اچھی ہیں۔تم غیروں تک چلی گئیں۔مگر گند اٹھا لائیں۔

حاشر دونوں ٹانگوں کو مسلسل حرکت دیے جا رہا تھا۔نیناں بھائی کو بتا کر ضبط کرتے باہر آ گئی تھی۔ان کا خاندان برباد ہو چکا تھا۔اسکے سردار بھائی کی پگ میلی ہو گئی تھی۔ان کے خاندان کی عورتوں کے تو نام بھی باہر پتہ نہیں چلتے تھے۔آج نام کے ساتھ لگے داغ بھی باہر چلے گئے تھے۔بس اسی کو موت کہتے ہیں۔کیا موت اس سے زیادہ بدصورت ہو سکتی ہے؟وہ کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

اماں اسکے کمرے میں آئیں۔تو انکی حالت بھی خراب تھی۔روئی روئی آنکھیں تھیں۔وہ انہیں دیکھتے اٹھ بیٹھی تھی۔

"نیناں میرے بیٹے کو مار دیا اس نے۔۔اسکی حالت نہیں ہے۔۔مجھ سے اسکیچہرے پر نہیں دیکھا جا

رہا۔۔میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔یہ کیا ہو گیا ہے ہمارے ساتھ۔۔" ان کے گھر موت کا ہی سماں تھا۔جیسے کسی کی میت گھر پڑی ہو اور گھر والے تکلیف کے مارے رو رو کر نہ تھکتے ہوں۔"اماں بھابھی ایسی نہیں ہیں۔ان کو کسی نے پھنسایا ہے۔۔"وہ ماں کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"ارے بھاڑ میں جائے جیسی بھی ہے۔میرے بیٹے سے تو منسوب نہ ہوتی۔وہ رقیہ کا بیٹا باہر کہہ رہا تھا کہ سب ثبوت اس کے خلاف ہیں۔بس حاشر ہی نہیں مان رہا۔۔" ان کے پھر سے آنسو بہنے لگے تھے۔" کتنی بار منع کیا تھا۔سوتیلی بہن ہیا سے ہمدرد نہ سمجھو۔۔موقع ملتے وار کر دیا اس نے۔۔اور وہ سب باہر میرے بیٹے کو قصوروار کہہ رہے ہیں۔ادی زہرہ کہتی ہے میری آہ لگی ہے۔۔تمہارا بیٹا کبھی خوش نہیں رہے گا۔اپنوں کو چھوڑ کر غیروں میں بھاگی تھیں۔اب صلہ مل گیا۔۔"ان کا رونا جاری تھا۔

حاشر نے ناز کو اپنے سامنے آنے سے منع کر دیا تھا۔نیناں نے اپنا کمرہ اس سے الگ کر لیا تھا۔اب کوئی فائدہ نہیں تھا بہنا پا جوڑنے کا۔وہ اپنا وار کر چکی تھی۔رشتے پھر سے بکھر رہے تھے۔مگر سب سے اچھا یہ تھا کہ وہ تینوں سگے بہن بھائی اس مشکل وقت میں ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔بھلے مریم مجرم نکلتی مگر وہ کسی کے لیے بھی اپنے بھائی کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

☆......☆......☆

حاشر اپنی ان مصروفیات کی وجہ سے ایک اہم معاملے پر بیٹھنے والے جرگے کا حصہ نہیں بن پا رہا تھا۔لیکن آج وہ شرکت کرنے کے لیے جا رہا تھا۔کیونکہ آخری فیصلہ اس نے ہی کرنا تھا۔نیناں اور ناز کو اب وہ اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔دشمنوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔کب وار کر دیں۔

ناز نے گاڑی میں اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔حاشر آنکھ اٹھا کر دیکھا تھا۔وہ نظر جھکا گئی تھی۔وہ اب کبھی اس سے نہیں ماننے والا تھا۔جو بھائی کی عزت نہیں رکھ سکی تھی اسکا دوبارہ کیا اعتبار کرنا۔وہ دوسرے چانس دینے کا عادی نہیں تھا۔

سفر خاموشی سے کٹا تھا۔انہیں حویلی چھوڑ کر وہ سیدھا جرگے آ گیا تھا۔بابا جان اور اسکے بھائی پہلے پہنچ گئے تھے۔اور جب جرگے کا فیصلہ مخالف پارٹی کے خلاف گیا تھا۔تو انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔یہ پہلی

بار تھا کہ میر حاشر کے سامنے بیٹھ کر اسکے فیصلے کو چیلنج کیا جا رہا تھا۔اور حد تو تب ہوئی جب وہ اس کی ذاتی زندگی پر اتر آئے تھے۔اسے اسکی بیوی کے طعنے دینے لگے۔

" تم سے اپنی بیوی تو سنبھالی نہ گئی۔ ہمارے فیصلے کیا کرو گے۔ سنا ہے بڑے بڑے کام کرتی ہے تمہاری بیوی۔۔" حاشر تو ہوش کھونے لگا تھا۔اسکے بھائی ، بابا جان سب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔میر حاشر نے آگے بڑھ کر اس آدمی کو اتنا مارا تھا کہ حد نہیں۔اسکا جنون دیکھ کر مخالف پارٹی نے بندوقیں نکال لی تھیں۔یہاں اسکے بھائیوں نے اور قبیلے والوں نے ان پر بندوقیں تان لی تھیں۔مردوں کے بیچ گھر کی عورتوں کا ذکر کون برداشت کرتا ہے۔برداشت کرنے والے کرتے ہونگے مگر ایک بلوچ نہیں کرتا۔

حاشر نے ایک بھائی کے ہاتھ سے پسٹل لے کر اسے ہوا میں خالی کر دیا تھا۔اندر کی آگ پھر بھی نہیں بجھی تھی۔

"اسے کتوں کے آگے ڈال دو۔۔" آخری ٹھڈا مار کر اس نے اپنے ایک ملازم کو اشارہ کیا۔

"میر حاشر اسے چھوڑ دو۔ ورنہ جنگ ہوگی۔" مخالفوں سے ایک جوشیلے نے آگے بڑھ کر اسے وارننگ دی۔"اگر جنگ ہے تو میں ابھی سے میدان میں کھڑا ہوں۔اسے بھول جاؤ کہ یہ کبھی پیدا بھی ہوا تھا۔" اس نے دوسرے بھائی کے ہاتھ سے مڑ کر ایک اور پسٹل لے لیا تھا۔اور اسے اس جوشیلے نوجوان پر تان لیا۔" کیا کر رہے ہو میر۔چھوڑو جانے دو۔بات کو کیا بڑھانا۔"ان میں سے ایک بزرگ آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔

اسکے بھائی اسی طرح پوزیشن سنبھالے کھڑے تھے۔وہ زندگی میں جو بھی کر لیتے۔جس مقام پر بھی چلے جاتے۔کچھ چیزیں کبھی نہیں بدلتیں۔وہ سب لڑنے مرنے کو تیار کھڑے تھے۔بھری محفل میں انہیں گھر کی عورت کا طعنہ دیا گیا تھا۔وہ جان لینے سے کم پر کیسے راضی ہوتے؟؟۔

"اپنے اس نوجوان کو سمجھا دو۔مردوں کا کام نہیں ہوتا کہ لڑتے وقت عورتوں کی باتیں لے آئیں۔یہ کمی (چھوٹے) لوگ کرتے ہیں۔اسکی تربیت میں کمی رہ گئی ہے۔اگلی بار مردوں کی محفل میں لاؤ تو آداب سکھا کر لانا۔کہیں ایسا نہ ہو سب کہیں یہ کمین کون ہے۔" پھر اس نے آگے بڑھ کر اس نوجوان کے سینے پر جا کر

پسٹل رکھا۔اور اسے ایک دوبارا اسکے سینے پر ٹھوکا۔

"اگر زندگی میں دوبارہ تم نے ایسی بات کہی تو یاد رکھنا۔تمہاری لاش بھی تمہارے گھر والوں کو نہیں ملے گی۔عزتیں سب کے گھر میں ہوتی ہیں۔ہر گھر کے معاملات بھی ہوتے ہیں۔انجان نہیں ہوں میں کسی کے بھی معاملے سے۔اگر نہیں بولتا تو اس لیے کہ یہ مردوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔لیکن پہلی اور آخری بار بتا رہا ہوں۔یاد رکھو۔عورتیں سب کی ہوتی ہیں۔ہر گھر کی کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے۔"

وہ شیر کی طرح دھاڑا تھا۔اس کے الفاظ کو سب نے کھلے کانوں سے سنا تھا۔اور دماغ میں بٹھا لیا تھا۔اس کے چھپے الفاظ کے مفہوم کو سب نے اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا۔اب وہ مر کر بھی ایسی بات نہیں کر سکتے تھے۔کیونکہ ہر گھر میں عورتیں ہوتی ہیں۔ہر گھر کی ایک کہانی ہوتی ہے۔

گھر آ کر آگے رقیہ بی بی نے اسے دیکھتے طعنہ کسا تھا۔وہ ایک دم سے پلٹ کر ان تک گیا تھا۔وہ اسکی لال آنکھیں دیکھ کر ڈر گئی تھیں۔سب مرد آگے پیچھے اندر آئے تھے۔

اسے ماں کے ساتھ کھڑا دیکھ کر رقیہ بی بی کے بیٹے انکے ساتھ آ کھڑے ہوئے تھے۔"حاشر۔۔"اسکے بھائی نے وارننگ کے انداز میں کہا تھا۔ایک تماشہ باہر لگا تھا۔ایک اندر لگ چکا تھا۔ملازماؤں نے اپنے کام چھوڑ کر ادھر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔کسی نے جا کر ہاجرہ بی بی کو بلا لیا تھا۔"رکھی جاؤ سب کو بلا لاؤ۔"حاشر نے ان سے نگاہ ہٹا کر ایک طرف کھڑی ملازمہ کو حکم دیا تھا۔تھوڑی دیر میں سب وہاں جمع ہو گئے تھے۔

" آپ سب میرے خاندان کا، میرے اس گھر کا حصہ ہیں۔میرے لیے آپکی عزت میری اپنی عزت ہے۔اسی طرح میری عزت بھی آپکے لیے اپنی عزت ہونی چاہیئے۔مریم میری بیوی، میری عزت ہے۔یعنی میر حاشر کی عزت۔وہ مجھ سے الگ نہیں ہے۔اس پر کوئی بات کرنے کا مطلب میر حاشر پر بات کرنا ہے۔اور میر حاشر۔۔"وہ رکا۔"وہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ غیرت پر انگلی اٹھانے والے کا کیا انجام کرنا چاہیئے۔جا سکتے ہیں سب۔"

وہ اپنے کمرے میں آ کر اندر کی کھولن کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔یہ محبت انسان کو کتنا ذلیل کروا کے رکھ دیتی ہے۔یا پھر یہ کہیں اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا۔۔بھلے شاعر نے کسی اور صورت حال پر کہا ہو۔مگر میر

حاشر کو اپنا حال یہی لگ رہا تھا۔
اماں اندر آئیں تو وہ کرسی پر بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ ماتھے پر تفکر کی لکیریں تھیں۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بنائے ٹھوڑی تلے ٹکائے ہوئے تھا۔ کہنیاں دونوں ٹانگوں پر ٹکی تھیں۔ وہ یقیناً بہت ضبط والا مرد تھا۔ کمرے میں کوئی بھی چیز بکھری نظر نہیں آ رہی تھی۔ اماں کو تو ایک لمحے کو لگا تھا وہ اپنے کمرے کا حشر بگاڑ دے گا۔ مگر وہ جیسے اپنے غصے کو اپنے اندر ہی ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہولے سے چلتی اسکے ساتھ رکھی کرسی پر آ بیٹھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر چونکا۔ اور سیدھا ہو بیٹھا۔
" کیسے ہو۔؟" ان کے لہجے میں محبت تھی۔ حاشر کا دل چاہا کہ دے بہت بکھرا ہوا ہوں۔ " ٹھیک ہوں۔ ٹھیک ہوں۔" اس نے جیسے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔ اماں اسے دیکھتی رہیں۔
" اسکے لیے زمانے سے جنگ لڑ رہے ہو۔ اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" اسکی آنکھوں میں سختی ابھر آئی تھی۔ " اماں۔" اس نے تحمل سے ماں کی طرف رخ کیا۔ " وہ میری بیوی ہے۔ میری ذات کا دوسرا حصہ۔ ایسے کیسے چھوڑ دوں۔ اس پر برا وقت آیا ہے تو اس سے پیچھا چھڑا لوں۔ اگر میں اس سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ میرے اچھے برے وقت میں میرے ساتھ رہے تو پھر یہ اصول مجھ پر بھی لاگو ہوتا ہے۔"
" جس پر اتنا یقین کر رہے ہو۔ اگر وہ غلط نکلی۔ اگر وہی مجرم نکلی تو۔۔؟" اماں نے اسکے دل کے ایک کونے میں پلتے ڈر کو زبان دی تھی۔ وہ اتنے ثبوت دیکھ چکا تھا۔ کہ اس کا بے قصور نکلنا معجزہ ہی ہوتا۔ اور وہ اس معجزے کے لیے ہی ساری کوششیں کر رہا تھا۔ لیکن دل کے ایک کونے میں ڈر بیٹھ گیا تھا۔
اگر وہ مجرم نکلی تو۔۔ وہ محبت کے بھروسے پر یقین کے پل صراط پر چل رہا تھا۔ پل صراط کب آسان ہوا کرتی ہے۔ اگر اسکا یقین جھوٹا نکلتا تو وہ ایسا گرتا۔۔ کہ پھر اس کا نام ونشان بھی نہیں ملنا تھا۔ وہ صحیح کہہ رہا تھا وہ اپنی ذات کے لیے یہ جنگ لڑ رہا تھا۔ ایک زمانے سے اس لڑکی کے لیے نہیں اپنے لیے لڑ رہا تھا۔ وہ اسے اپنی ہی ذات تو لگتی تھی۔
" اماں جیتنے کے یقین کے ساتھ اس جنگ میں گھسا ہوں۔ ہارنے کا ڈر ہے، مگر جیتنے کا یقین ہے۔ باقی سب رب کے ہاتھ میں ہے۔ اسکی رضا میں راضی ہوں۔۔" اس نے اب بھی اپنے ضبط کے دامن کو نہیں چھوڑا

تھا۔اس لمحے اماں کو اپنی بہو پر رشک آیا تھا۔جس کے حصے میں ایسا باوفا مرد آیا تھا۔ورنہ مرد ذات تو وہ ہے کہ شک کا بال آجائے تو گھر خراب کر لیتے ہیں اور زندگیاں بھی۔۔

اور وہ ہر روز نئے ثبوت دیکھ کر کیسے کیسے نہ ٹوٹتا ہوگا۔مگر پھر بھی اپنی بیوی پر یقین کر رہا تھا۔لوگ کہتے ہیں وفا صرف عورت کا شیوہ ہے۔کوئی آ کر میر حاشر کو دیکھتا۔وہ کسی عورت سے بھی زیادہ برے حالات میں اپنے ساتھی سے وفا نبھا رہا تھا۔ورنہ انکے شوہر نے تو بنا کسی وجہ کے انکی محبت کو کچھ سالوں میں بھلا دیا تھا۔انہیں خود پر فخر ہوا کہ ایسا بیٹا پیدا کیا تھا۔

وہ ان ماؤں میں سے نہیں تھیں جو بہو کو سخت سست سنا کر اپنی بڑھاس تو نکال لیتی ہیں۔مگر اپنی اولاد کا دل دکھا جاتی ہیں۔کہ جن سے انہیں محبت ہے انکی ماں کو اسکی قدر بھی نہیں۔وہ بیٹے کے لیے زیر لب دعائیں کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔"خدا کرے وہ لڑکی بے قصور نکلے۔۔"

حاشر نے رات ہونے سے پہلے ہی واپسی کا قصد کر لیا تھا۔سکون کہیں نہیں تھا۔ایک دل چاہتا مریم سے جا کر مل آئے۔مگر وہ صرف منکوحہ تھی بیوی نہیں۔ان باتوں کے بعد پتا نہیں اسکے ابو اجازت بھی دیتے کہ نہیں۔مگر اسے اپنا علاج صرف مریم کا دیدار لگ رہا تھا۔جسم میں پھر سے نئی انرجی آجاتی۔ٹوٹتی امیدیں پھر سے جڑ جاتیں۔مگر یہ ابھی ممکن نہیں تھا۔کتنے مہینوں سے اسکی آواز بھی نہیں سنی تھی۔کبھی کبھی وہ خود بھی اپنی محبت پر حیران ہوتا تھا۔مریم کو اس سے اتنی محبت نہیں تھی۔مگر اسکی محبت ہر روز جیسے پہلے سے بڑھ کر ہوتی جا رہی تھی۔وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ محبت کی ایسی سٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔اگر یقین ٹوٹتا وہ بھی ٹوٹ جاتا۔

ان سب باتوں کا ادراک رکھنے کے باوجود بھی وہ اپنے دل کے ہاتھوں بے بس تھا۔محبت، بن قید انسان کو بے بس کر دیتی ہے۔وہ بچاؤ کے ہر ممکن راستے کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔مگر پھر بھی ان راہوں پر چلنے کا خواہش مند نہیں ہوتا۔وہ اپنے انجام کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔زرا بھی پاؤں پھسلا۔ہستی بھی ہل جائے گی۔مگر پھر بھی وہ خوش گمانی کے پرندے کا تعاقب کرتے، کانٹوں بھری راہ پر چلتا ہی جاتا ہے۔اس راہ پر خوش نصیبوں کو کامیابی ملتی ہے۔ورنہ مجنوں، رانجھے بن کے تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔

وہ ایسا شاندار اور کامیاب مرد صرف اپنی محبت کے بھروسے ہی کھڑا تھا۔ایک زمانے کی مخالفت مول لیے اس کے لڑ رہا تھا۔

جس پر اب اسکے گھر والے بھی بھروسہ نہیں کر رہے تھے۔ جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ پلی بڑھی تھی۔ساری زندگی ان کی آنکھوں کے سامنے گزاری تھی۔صرف دو سال ان سے اوجھل گزرے تھے۔اوران دوسالوں کی ہی وجہ سے وہ ان کے لیے مجرم بنتی جارہی تھی۔کہ ان کی آنکھ سے اوجھل کچھ نہ کچھ تو کرتی رہی ہوگی۔وہ تو وہاں نہیں تھے کیسے گواہی دیتے۔ایک وقت کے بعد وہ تھکنے لگے تھے۔ان کے یقین چٹخنے لگے تھے۔

مگر محبت دنیا کا سب سے انوکھا معجزہ ہے۔وہ ساری زندگی اس سے دور کہیں ایک الگ دنیا میں رہی تھی۔مگر جب سے اسے دیکھا تھا۔زندگی کا حصہ نہیں بنی تھی بلکہ ذات کی حصے دار بن بیٹھی تھی۔اب ہر ثبوت کے بعد بھی وہ سچی لگتی تھی۔ایسے معجزے صرف محبت کے نصیب میں ہوتے ہیں۔

آج چھ ماہ ہونے کو آئے تھے۔اسکے ساتھ کام کرنے والے افسر بھی تھک گئے تھے۔بس بہت ہوا۔وہ قانونی مجرم تھی۔اب اسے قانون کے حوالے کردینا چاہیئے تھا۔حاشر کے دل میں اب صرف ایک فیصد امید بچی تھی۔اور وہ وقت آخر اسکی روتی آنکھوں کے ساتھ بولا جانے والا جملہ۔۔"میں نے نہیں کیا۔۔"

اسے خود سے ڈر لگنے لگا تھا۔اس نے وہیں بیٹھ کر اپنے وکیل کو کال کی تھی۔پھر اگلے دن وہاں جاکر اسے پیپرز تیار کرنے کا کہا تھا۔" آر یو شیور میر صاحب؟" وکیل نے آخری بار کنفرم کیا تھا۔اس نے سر ہلا دیا تھا۔وہ طلاق کا حق اپنی بیوی کو دے رہا تھا۔

وہ اپنے دل کے ننانوے فیصد حصے سے لڑ کر یہاں بیٹھا تھا۔بس ایک فیصد کے سہارے۔۔

اسے ڈر لگ گیا تھا۔کہیں اسے چھوڑ نہ دے۔وہ سدباب کر رہا تھا۔اپنے ناقابل تلافی نقصان کے لیے۔

ان چھ ماہ میں اس کے گھر والے بھی تھک گئے تھے۔بابا،اماں،جاذب اور نیناں۔۔باقیوں کی وہ سنتا ہی کب تھا۔پھر اس نے اسے خط لکھا تھا۔اب رابطے کا بس یہی ذریعہ تھا۔مختصر ساخط۔

"میں خود سے ڈر گیا ہوں۔کہیں ان ثبوتوں کی وجہ سے جذبات میں آکر کچھ غلط نہ کر بیٹھوں۔ہاں تم چاہو تو مجھ سے الگ ہوسکتی ہے۔میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ اپنے ہاتھوں سے تمہیں خود سے الگ کروں۔"

اس خط کے ساتھ اس نے یہ پیپرز اسکے گھر بھیج دیے تھے۔ اسے تب نہیں پتہ تھا کہ اماں مریم کے گھر والوں کو جواب دے چکی ہیں۔

اسکے ذہن میں بار بار اب مریم کا آخری جملہ گونجتا تھا۔ "میں نے نہیں کیا۔۔"

وہ چونک گیا۔ "وہ ہر بار یہی کہتی میں نے نہیں کیا۔ ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ مجھے نہیں پتہ کس نے کیا۔۔۔ وہ اس سے اپنی ساری گفتگو کو پھر سے یاد کر رہا تھا۔ دماغ اتنا الجھا ہوا تھا کہ ٹھیک طرح یاد نہیں آ رہا تھا۔

" کیا وہ اصلی مجرم کو جانتی ہے؟ بتایا کیوں نہیں اس نے"۔۔ وہ الجھ رہا تھا۔

" مجرم جانتی تھی تو چھپاتی کیوں۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔۔" اس نے اس امکان کو رد کیا۔ اسکی دوست اسکی روم میٹ۔۔۔ وہ کہاں گئی۔۔ اسے ایک دم سے جیسے کچھ کلک ہوا تھا۔ شروع میں ان کا دھیان ہی اس طرف نہیں گیا تھا۔ ہر پکڑا جانے والا کہتا ہمیں مریم عالم سپروائز کرتی تھی۔ اپر ہینڈ تو پھر بھی کوئی اور تھا۔ مگر باس کی قریبی ساتھی وہی تھی۔ وہ انکی باتوں کے بعد صرف مریم کی ذات تک ہی الجھ کر رہ گئے تھے۔ ہر دوسرے بندے پر شک کیا تھا۔ اسکی دوست کا تو خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ایک بار آیا تھا تو اس نے خود رد کر دیا تھا۔ وہ تو اسکی بیسٹ فرینڈ تھی۔ اپنے گھر کے مسئلوں میں الجھی ہو گی۔ اس معاملے میں اسے کیوں گھسیٹ کے لانا۔

" افففف۔۔۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔ انہوں نے ہر بندے کو چیک کیا تھا۔ بس اسے ہی نہیں کیا تھا۔ وہ تیز رفتاری میں گاڑی دوڑا کر پولیس ڈپارٹمنٹ پہنچا تھا۔ تھکی ہوئی ٹیم اس دیوانے کے یقین کو اب بے زاری سے دیکھ رہی تھی۔

شروع میں وہ لوگ متاثر بھی ہوئے تھے۔ بیوی سے اتنی محبت کرتا ہے۔ مگر اب وہ تھک چکے تھے۔ وہ اسکا بنک اکاؤنٹ چیک کر رہے تھے۔ پہلے بھی کیے تھے۔ مگر جب کچھ ہاتھ نہیں آنا ہوتا تو سامنے کی چیز بھی اوجھل رہتی ہے۔

مریم کے اکاؤنٹ میں ہر بار باہر سے بہت سی اماؤنٹ آتی تھی۔ لیکن اگلے دن وہ دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی جاتی تھی۔ وہ اکاؤنٹ اسکی دوست ردا کے نام پر تو نہیں تھا۔ مگر حاشر کو یقین تھا۔ وہ اسکی دوست ردا ہی تھی۔

انہوں نے پکڑی جانے والی لڑکیوں کے اکاؤنٹس کی ڈیٹیلز چیک کیں تو مریم کے پاس رقم کے دو دن بعد ان سب کے اکاؤنٹ میں انکے حصے منتقل کر دیے جاتے تھے۔اب جو یہ بیچ والا اکاؤنٹ تھا۔اسکی ساری ڈیٹیلز نکلوا رہے تھے۔اسی اکاؤنٹ کے تھرو پھر وہ رقم سب میں بانٹ دی جاتی۔ایسے کاروبار کرنے والے بے وقوف نہیں ہوتے کہ یوں بنکوں میں اپنے ثبوت چھوڑ جائیں۔اس سب کا صرف ایک مطلب تھا۔پولیس جو کب سے ان کے پیچھے تھی۔انہیں مجرم چاہیئے تھا۔

انہوں نے پوری پلاننگ سے ایک لڑکی کو ٹارگٹ کیا تھا۔انہیں بھی اندازہ تھا۔پکڑے جانے کے بعد بنک اکاؤنٹس تک کنگھالے جائیں گے۔وہاں بھی وہی مجرم تھی۔اتنی پرفیکٹنیس دراصل بدصورتی پیدا کر رہی تھی۔جو لڑکی اگر اتنی ہی مجرمانہ ذہنیت کی حامل تھی۔وہ اپنے اصلی نام کے اکاؤنٹ کو کیوں استعمال کرتی۔

اب سوال یہ تھا کہ اس نے کس کو اجازت دی تھی کہ اسکے اکاؤنٹ کو استعمال کرے۔یا پھر یہ بھی اسے نہیں معلوم تھا۔ان سوالوں کے جواب یا تو مریم دے سکتی تھی یا خود اصلی مجرم۔چیزیں سامنے آ کر پھر الجھنے لگی تھیں۔

کال ریکارڈز میں اسکی آواز۔۔اور کئی بار چیک کرنے پر بھی وہ اصلی ریکارڈنگز ہی نکلی تھیں۔نہیں اتنی پرفیکشن۔۔کوئی کسی کو پھنسانے کے لیے ہی پیدا کر سکتا ہے۔مریم کا موبائل آن کر کے وہ ردا کے نمبر پر کال کر رہے تھے۔ہر بار بند ہوتا۔اگر وہ لڑکی اسکی واقعی دوست تھی تو نمبر کیوں بند تھا۔سم کے ذریعے ایڈریس نکلوایا تو حسب توقع غلط نکلا تھا۔

حاشر کے اندر جان لوٹ آئی تھی۔وہ پھر سے پر جوش ہو چکا تھا۔یقیناً یہی لڑکی گناہ گار تھی۔ایک نئی انرجی کے ساتھ اب وہ سب کام کر رہے تھے۔مریم اور ردا کی کالز کو اب سنا جا رہا تھا۔ایک ایک لفظ غور سے۔۔"ضروری نہیں کہ اس نے مریم کا موبائل ہی استعمال کیا ہو۔ہوسکتا ہے سم نکال کر اپنے موبائل میں لگاتی ہو۔کیونکہ مریم کے موبائل میں تو کوئی ڈیوائس یا چپ نہیں لگی ہوئی۔" ایک لڑکے نے ایک دم سے سب کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

اور پھر ان کالز کے ایک ایک لفظ کو چھانٹنے کے بعد انہوں نے ردا کو پہچان لیا تھا۔اسکے الفاظ کی ادائیگی

سے۔ حاشر خوشی سے رو دینے کو تھا۔ وہ ہنستے ہنستے وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔ کتنے دنوں کی محنت رنگ لائی تھی۔

کتنی دیر آسمان کو تشکر بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ "اوہ اللہ۔۔۔شکریہ پیارے اللہ۔۔۔" وہ ہنستا تھا۔ آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ پھر چند گہری سانسیں لے کر وہ واپس اندر آ گیا تھا۔ ابھی صرف ایک کلیو ملا تھا۔ اب پوری ٹیم کو یقین تھا کہ بہت سے ثبوت مل جائیں گے۔ اور ثبوت نہیں بھی ملتے وہ لڑکی مل جائے۔ اس سے اقرار کروا لیں گے۔

ردا کی تلاش جاری تھی۔ حاشر روز اس کے نمبر پر کال کرتا۔ ایک دن میں کئی بار۔۔ شاید وہ سم کبھی آن ہو جائے۔ پھر اس نے اس نمبر پر میسج کیے تھے۔ "مریم کی طبیعت بہت خراب ہے وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ آجکل کی مہمان ہے۔ میں اسکا شوہر۔ اس نے تم سے رابطہ کرنے کا کہا ہے۔" جانے نمبر آن ہوتا کہ نہیں۔ اور کیا معلوم وہ اس کو پڑھ کر رابطہ کرے کہ نہیں۔ اور ایک دن کسی اور نمبر سے حاشر کو فون آیا تھا۔ ردا تھی۔ وہ ایک دم سے سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ "کیا ہوا مریم کو؟" اسکی پریشان آواز محتاط تھی۔ بہت بیمار رہتی ہے۔ ڈاکٹرز نے اسے ایک ماہ کا وقت دیا ہے۔" حاشر نے اس ایس پی کے کہنے پر اس جھوٹ کو گھڑا تھا۔ ایسے تو وہ ہاتھ آنے سے رہی۔ پھر اپنی لوکیشن تو اس نے نہیں بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا وہ اسے ہاسپٹل ملنے آئے گی۔ حاشر نے ایک ہاسپٹل کا کہہ دیا تھا۔ اور تین دن بعد وہ قدرے محتاط سی وہاں آتی دکھائی دی تھی۔ ہاسپٹل کے چپے چپے کو کور کیا گیا تھا۔ تاکہ وہ بھاگ نہ پائے۔

اور پھر ایک روم میں نقلی مریضہ کو دیکھ کر جب وہ جذباتی ہو کر آگے بڑھی تھی۔ روم کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ اور اب وہ ایک اندھیرے کمرے میں بندھی بیٹھی تھی۔ صرف منہ کھلا تھا۔ حاشر کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ "بتاؤ کیوں کیا تم نے؟" پولیس میں سے ابھی کوئی سامنے نہیں آیا تھا۔ اتنا تو پتہ تھا کہ وہ مریم سے محبت کرتی تھی تبھی دوڑی چلی آئی تھی۔ اب اسے اسی کے ذریعے جذباتی کر کے ہی کچھ اگلوایا جا سکتا تھا۔ ورنہ پھر پولیس اپنا کام کرتی۔

"کیا کیا ہے میں نے۔ مریم کہاں ہے؟"

"اب کیوں مریم کی اتنی فکر ہو رہی ہے۔ اسے اتنا بری طرح پھنسا کر۔۔"

"میں کیوں پھنساؤنگی۔میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ صاف انکاری تھی۔" مریم کہاں ہے۔اسے بلاؤ۔"

"وہ مرگئی ہے۔۔" حاشر نے سرد لہجے میں کہا۔" کیا۔کیسے۔۔" وہ بے یقین ہوئی۔

"اس پر کچھ غلیظ الزام لگے تھے۔تو اس لیے اسے غیرت کے نام پر قتل کر دیا گیا۔" تب تک حاشر کو نہیں معلوم تھا کہ وہ واقعی یہ ہو چکا تھا۔اس نے پیپرز بھیجنے کے بعد وہاں رابطہ نہیں کیا تھا۔نہ ہی وہاں سے کیا گیا تھا۔ویسے بھی وہ دن رات اسقدر مصروف رہتا تھا کہ سونے کو بھی بمشکل چند گھنٹے ملتے تھے۔

اس بات کے بعد تو وہ رونا شروع ہوئی۔ہچکیوں کے ساتھ۔سسکیوں کے ساتھ۔" کیسے بے وقوف لوگ ہو تم۔۔کیا وہ لگتی تھی ایسے جرم کرنے والی۔وہ تو بہت معصوم تھی۔کیوں کر دیا ایسا۔۔مریم۔۔" اسکی آہیں تھیں۔حاشراب تحمل سے اسے بولتے دیکھ رہا تھا۔کوئی انسان کتنا بھی چالاک بن جائے۔مگر اسکی بھی کوئی نا کوئی کمزوری ہوتی ہے۔اس خطرناک لڑکی کمزوری بس مریم تھی۔اسکی پیاری دوست۔

"جب اس سے اتنی محبت تھی تو اسے پھنسایا کیوں تھا۔"

وہ بہت معصوم تھی۔۔کیوں مارا اسے۔۔کیوں مارا۔۔" وہ سر کو دائیں بائیں کرتے روئے جارہی تھی۔پھر جب رو رو کر تھکی تو حاشر نے دوبارہ پوچھا۔" کیونکہ وہ بہت معصوم تھی۔پہلی بار اسکے لیپ ٹاپ میں ویڈیو ڈالی تو اسے کہا مریم نہ کھولنا۔میری پرسنل ہے۔تو پھر اس لڑکی نے اسے نہیں کھولا تھا۔کھولتی تو ڈلیٹ کر دیتی نا۔مگر اس نے مجھ پر اعتبار کر کے کھولی ہی نہیں تھی۔میں ایسی معصوم لڑکی کہاں ڈھونڈ سکتی تھی۔

مجھ پر گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔مجھے اپنی جگہ کسی اور کا نام دینا تھا پولیس کو۔وہاں سب لڑکیوں میں سب سے معصوم اور بے وقوف وہی تھی۔مریم میری دوست۔۔" اس نے آہ بھری۔وہ جیسے بالکل ڈھے چکی تھی۔مریم کی موت کے صدمے نے اسے اندر تک دکھی کر دیا تھا۔" وہ بہت اچھی تھی۔۔بہت۔۔مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔۔بس صرف وہی کرتی تھی۔۔"

"اور تم نے کیا کیا۔۔"

"سب کچھ فائنل تو تب کیا تھا میں نے۔جب وہ تمہارے نکاح میں آئی تھی۔مجھے لگا اتنے طاقتور لوگ ہو۔اسے بچا لوگے اور میری طرف سے بھی پولیس کا دھیان ہٹ جائے گا۔"

"اپنے یہ لولے لنگڑے جواز اپنے پاس رکھو۔تم نے اس لیے کیا کہ تمہیں آسان شکار چاہیئے تھا اور اس سے زیادہ آسان شکار کون ہو سکتا تھا؟" وہ غرایا تھا اب۔اس کا دل چاہا اسکے منہ پر ہٹ کرے۔

"بس مسٹر حاشر آپ کا کام ختم ہوا۔" اندھیرے کو ختم کر دیا گیا تھا۔تفتیشی افسر نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر اسے اٹھنے کو کہا۔وہ ردا کو گھورتا اٹھ کھڑا ہوا۔

پولیس کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ ردا کو بتاتے مریم نہیں مری تھی۔وہ اسی جذباتی کیفیت میں ہی بہت کچھ بتا سکتی تھی۔جب کے وہ پولیس کو دیکھ کر ہڑبڑاہٹ کا شکار تھی۔پھر وہ چیختی رہی۔بولتی رہی۔حاشر نے اسکا اقرار ویڈیو میں ان سے لیا تھا۔اسے اپنے گھر والوں کو دکھانا تھا۔لوگ بنا ثبوت کے لگے الزام کو سچ مانتے ہیں۔صرف زبان سے نکلی بات ہی دوسرے کے جرم کا ثبوت بن جاتی ہے۔مگر سچائی ثابت کرنے کے لیے اصلی ثبوتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کے لیے کسی کی زبان سے دی گواہی ناکافی مانی جاتی ہے۔

اور یہ وہی دن تھا جس دن مریم نے فجی کی فلائٹ پکڑی تھی۔

☆......☆......☆

آج اس نے اسی طرح ان سب کو بلایا تھا اور ثبوت دکھایا تھا۔تاکہ ہر شخص دیکھ لے میر حاشر سچا تھا۔اسکی محبت کھوٹی نہیں تھی۔اور ہر شخص شرمندہ تھا۔کہ وہ جھوٹ کو سچ مان بیٹھا تھا۔

وہ ایک خوشی بھرے احساس کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔دو نفل شکرانے کے ادا کیے تھے۔ایک آزادی کا احساس تھا۔کسی بوجھ سے آزاد ہونے کا احساس۔۔وہ اپنی محبت کے امتحان میں سرخرو ہوا تھا۔اسکے صرف ہونٹ ہی نہیں آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

وہ تینوں بہن بھائی اس وقت اماں کے کمرے میں تھے۔حاشر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے کرسی سے ٹیک لگائے مسکراتے ہوئے اس منظر کا حصہ تھا۔جیسے صدیوں بعد یہ سکون میسر آیا تھا۔

"اماں اب بس شادی کی ڈیٹ فکس کرتے ہیں۔" جاذب نے خوشی سے کہا۔

"ہاں ضرور۔لیکن مریم کی امی کی کال آئی تھی تو میں نے کہا تھا کہ ہمیں آپکی بیٹی نہیں چاہیئے۔ہماری طرف سے جواب سمجھیں۔" حاشر سیدھا ہوا۔"اماں۔۔۔"

"تب مجھے یہی لگتا تھا وہ مجرم ہے۔اس لیے غصے میں کہہ دیا تھا۔" وہ معصومیت سے بولیں۔ "اف اماں۔۔" وہ تینوں ایک ساتھ بولے تھے۔

پھر حاشر اپنی اماں اور بابا جان کے ساتھ مریم کے گھر آیا تھا۔

دروازہ مریم کی بھابھی نے کھولا تھا۔انہیں دیکھ کر وہ گنگ ہو گئی تھیں۔پھر ان کے متوجہ کرنے پر ناچاہتے ہوئے انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی تھیں۔اسکے ابو بیمار تھے۔بھائی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔بھاگ کر ساس کو بلایا تھا۔وہ افتاں وخیزاں دوڑی چلی آئی تھیں۔

ہاجرہ بی بی انہیں گلے لگا کر ان سے معافی مانگ رہی تھیں۔وہ حیرت سے سب سن رہی تھیں۔سمجھ تو بھابھی کو بھی نہیں آرہا تھا۔ماجرا کیا تھا۔پھر حاشر نے انہیں ساری بات کہہ سنائی تھی۔ساری بات سن کر وہ اونچی آواز میں پھوٹ پھوٹ کو رو دی تھیں۔"مریم۔۔میری مریم۔۔" حاشر سمیت وہ سب پریشان ہو اٹھے تھے۔

"مریم کہاں ہے۔اسے بلادیں۔" حاشر نے پریشان لہجے میں بھابھی کو مخاطب کیا۔

"وہ چلی گئی ہے۔۔" وہ ابھی تک شاک میں تھیں۔اسکی روتی امی کو ہاجرہ بی بی چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔لیکن ان کا رونا بڑھتا جارہا تھا۔

"پلیز آپ مریم کو بلادیں۔" اس نے زور سے بات دوبارہ کہی تھی۔"وہ چلی گئی ہے۔پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے۔۔وہ اس گھر کو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔۔" شور سن کر اسکے ابو آ گئے تھے۔اور جب پوری بات کا انہیں پتہ چلا تو انکی بھی حالت مریم کی امی جیسی تھی۔اس گھر میں بین کی آواز گونجنے لگی تھی۔اسکی امی بار بار اپنے بال نوچ رہی تھیں۔"میری بیٹی کہاں چلی گئی۔۔میری مریم۔۔" حاشر بے یقینی سے ان سب کو روتا دیکھ رہا تھا۔ہاجرہ بی بی کو اس ماحول سے وحشت ہو رہی تھی۔

پھر کچھ دیر بعد اسکا بھائی علی آ گیا تھا۔حاشر نے اسے ویڈیو دکھائی تھی۔وہ دیوانہ وار اپنے آپ کو مارے جا رہا تھا۔یہ کیا کر دیا تھا اس نے۔" کہاں ہے یہ لڑکی۔اسے میں اپنے ہاتھوں سے ختم کرونگا۔۔"

"اب پولیس کی تحویل میں ہے۔" اسکے بے قابو وجود کو حاشر نے ایک جھٹکے سے پکڑا تھا۔علی روتے ہوئے دہرا رہا تھا۔اس نے اپنی بہن کو مارنے کی کوشش کی تھی۔اور حاشر۔۔وہ بے یقینی سے ان سب کو دیکھ رہا

تھا۔کیا یہ واقعی اسکے گھر والے تھے؟

اسے گھر سے گئے دو ماہ ہو چکے تھے۔وہ اسکے پاس نہیں آئی تھی تو کہاں تھی۔اس نے دل میں آئے سوال کو دہرا دیا تھا۔

" آپ نے طلاق بھجوادی تھی۔آپ کے پاس کیسے آتی وہ۔۔" علی کو اس پر بھی غصہ تھا۔

" کیا بکواس ہے۔میں کیوں اسے طلاق دیتا۔میں نے طلاق کا حق اسے دیا تھا۔"

" پیپرز پر طلاق میں نے خود پڑھی تھی۔" علی چلایا۔"میں نے اسے طلاق کا حق دیا تھا۔کہاں ہیں پیپرز۔پھر پڑھوا نہیں۔"

☆......☆......☆

حاشر اپنے پیپرز لے آیا تھا۔کیا وہ اتنی پاگل تھی کہ پیپرز کو کھول کر پڑھا بھی نہیں تھا۔ایسے ہی مان گئی تھی کہ اسے طلاق ہو گئی ہے۔نہ ہی اسکا خط پڑھا تھا۔اسے مریم پر شدید غصہ تھا۔ایک بار مل جاتی اسے۔۔

پہلے ردا کی تلاش تھی۔اب مریم کی۔سکون بس چند دن کا تھا۔

کوئی کلیو تک نہیں تھا کہ گئی کہاں تھی۔وہ اسکے ابو سے پوچھ چکا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کیا کیا لے گئی تھی۔انہوں نے بتایا تھا کہ چند جوڑے،اپنے ڈاکومنٹس اور زیورات۔

وہ اور جاذب مل کر اسے ڈھونڈ رہے تھے۔اسکے ابو اور علی بھی اسے ڈھونڈنے نکلتے تھے۔وہ اپنے شہر کا ایک ایک کونہ دیکھ چکے تھے۔وہ ہوتی تو ملتی۔

زیورات۔۔ہاں زیورات۔۔یہ انکے خاندانی زیور تھے۔اور بہت پرانے تھے۔اس نے یقیناً انہیں کہیں بیچا ہو گا۔زیورات بہت مہنگے تھے اور ڈیزائن بھی ایسے تھے کہ ہر جیولر انہیں نہیں خرید سکتا تھا۔پاکستان میں اب وہ ایک ایک جیولر شاپ پر نہیں جا سکتے تھے۔لیکن ہر بڑے شہر کے بڑے جیولرز پر جا کر ان کی تصویر دکھاتے۔کوئی ان کو بیچنے آیا ہو۔

کئی دنوں بعد لاہور کے ایک جیولر کے پاس ان زیورات کا پتہ چلا تھا۔دونوں بھائی وہاں جا پہنچے تھے۔زیورات تو وہی تھے۔پھر انہوں نے سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھی تھی۔وہ بہت کمزور لگ رہی تھی۔حاشر کو وہاں

دور سے نظر آتی اس تصویر میں بھی اسکی آنکھوں کی ویرانی صاف نظر آرہی تھی۔وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔

"انہوں نے کہا تھا۔انکے شوہر ادھر افریقہ میں ہیں۔۔" وہ آدمی اسکی بات دہرا رہا تھا۔حاشر کے چہرے پر واضح بے بسی تھی۔اسکے بعد کوئی پتہ نہیں تھا۔ہر کلیو وہیں آ کے اینڈ ہو رہا تھا۔آگے کروڑوں انسانوں سے بھری دنیا تھی۔اور اس میں سے مریم عالم کا سراغ لگانا تھا۔حاشر نے پریشانی سے سر تھام لیا تھا۔

وہ اس اتنے بڑے شہر میں کہاں جا چھپی تھی۔اس دن کے بعد سے میر حاشر نے جیسے لاہور کا در پکڑ لیا تھا۔شروع میں کئی دن ڈھونڈنے پر نا کام ہو جانے کے بعد وہ چلا گیا تھا۔

وہاں اسلام آباد میں بہت کام تھے۔مگر جیسے ہی کام سے فرصت ملتی۔وہ لاہور کی گلیوں میں بھٹکتا پھرتا۔جانے کس دروازے سے نکلتی نظر آ ئے۔کہیں کسی گاڑی میں بیٹھی۔۔کبھی پیدل چلتے۔۔وہ انسانوں کے جم غفیر میں اس لڑکی کو ڈھونڈتا رہتا۔

اور جب کبھی ڈھونڈ کر تھک جاتا تو کہیں بھی بیٹھ کر سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیتا۔

جانے زندگی میں اتنی بدصورتی کیوں گھل گئی تھی۔ایک آسان اور سادہ زندگی کی خواہش تھی۔اور زندگی تھی کہ اسکی پیچیدگیاں ختم نہیں ہوتی تھیں۔

☆......☆......☆

وقت کب رکا ہے کسی کے لیے۔ان کے لیے بھی نہیں رکا تھا۔جاذب اور نیناں کی شادی ہو گئی تھی۔مگر وہ ابھی تک مریم کا جوگ لیے ہوا تھا۔بابا جان نے سخت سست سنائی تھیں

" محبوبہ کے لیے جوگ لیتے تو سمجھ بھی آتا ہے۔یار بیویوں کے لیے کون جوگ لیتا ہے۔" وہ اسے غیرت دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔" میرے لیے تو وہی محبوبہ تھی۔" اس نے آرام سے جواب دیا تھا۔" گھر سے جانے والی لڑکیوں کو زمانہ کھا جاتا ہے۔جانے کس حال ہوگی۔پتہ نہیں زندہ بھی ہے کہ نہیں۔" بابا جان کا اپنا انداز تھا اسے منانے کا۔

شروع میں بیٹے کا جنون دیکھ کر انہوں نے غصے میں کہا تھا۔" یہاں وہاں گلیوں میں کیوں ڈھونڈتے

ہو۔ کسی دارلامان میں کیوں جاتے ہو۔ سیدھا اس بازار جاؤ۔ وہیں مل جائے گی۔ گھر سے نکلنے والیاں پھر وہیں بیٹھی ملتی ہیں۔"

"باباجان۔ آپ شاید اسے پہچان نہیں پائے تھے۔ اگر خدانخواستہ اسے پر ایسا وقت آیا بھی ہوگا تو مجھے یقین ہے اس نے وہاں سے نکلنے کی ہر راہ ڈھونڈی ہوگی۔ اور اگر راہ نہیں ڈھونڈ پائی ہوگی تو یا مرگئی ہوگی، یا مارگئی ہوگی۔۔ میں نے عام عورت پسند نہیں کی تھی۔ میں جانتا ہوں۔ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں مل سکتی ہے مگر وہاں نہیں۔ دوبارہ یہ بات کہہ کر میرا دل مت دکھایئے گا۔" باباجان پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہے۔ "انوکھا بیٹا پیدا کرڈالا۔ بیوی کے جوگ لیتا ہے۔۔"

باباجان کے کہنے پر جاذب نے مریم کی تلاش ایسے لوگوں کے بیچ شروع کردی تھی۔ انکا بیٹا تو پاگل تھا۔ انہیں یقین تھا۔ یہیں کہیں ملے گی۔ یا کہیں کسی نوکرانی کے روپ میں ملے گی۔ گھر سے بھاگی لڑکیاں پھر بے مول ہی ملتی تھیں۔ اور اب انہیں اپنے بیٹے کے لیے وہ نہیں چاہیئے تھی۔ جانے کہاں کہاں کی خاک چھان رہی ہوگی۔ پھر ملنے پر اسے گھر بٹھادیتے۔۔

ٹھیک ہے۔ انہیں اپنی بہو بہت پسند تھی۔ مگر بہت ہوا۔ وہ پچھلے دوسالوں میں انکے لیے بس مصیبت ہی بن گئی تھی۔ اور پھر ان کا بیٹا اسکے لیے جوگ لے رہا تھا۔ ان کی برداشت ختم ہورہی تھی۔ ایک سال اور گزر گیا تھا۔ حاشر کی اسکی تلاش کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ آخری بار لاہور میں نظر آئی تھی۔ تو اسکے لیے وہ شہرِ یاراں تھا۔

انہوں نے بیوی سے کہا تھا کوئی قسم دے کے اسے دوسری شادی پر منائیں۔ اور اب تو وہ خود بھی دل سے یہی چاہتی تھیں کہ اسکا گھر بس جائے۔ مگر وہ تو وہی پرانا حاشر تھا جو کسی طور ہاتھ نہیں آتا تھا۔

"تم ماں ہو۔ کبھی معاف نہیں کرونگی۔۔ اپنے سر کی قسم کچھ بھی۔۔ مگر کرو۔ اسکی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔ سب بچے اپنی زندگیوں میں آگے بڑھ گئے ہیں۔ وہ ابھی تک وہیں ہے۔" باباجان بہت دکھی تھے۔

"ہاں جیسے خود بڑی قسمیں دیتے تھے۔ مجھ سے آکے کہتے ہیں۔ تم کوئی قسم دو۔" اماں نے انہیں گھورا۔

"عموماً ماں کی قسم پر بیٹے مان جاتے ہیں۔ تم کہو دودھ نہیں بخشوں گی۔" وہ انہیں پٹیاں پڑھا رہے

تھے۔لیکن یہ قسم ان کے دل کو لگی تھی۔ان کا بھی دل دکھتا تھا۔جب جاذب بتا تا کہ ادالا ہور گئے ہوئے ہیں۔اور یہ بھی معلوم تھا۔وہاں ہر گلی کی خاک چھانتا ہوگا۔وہ ہوش مند نظر آتا مرد وہاں جا کے دیوانہ بن جاتا تھا۔

پلوشہ کی شادی تو ہوگئی تھی۔اسکی چھوٹی بہن کے لیے اب وہ خود سوچتی تھیں۔پھر فیصلہ کر کے وہ بیٹے کے پاس اسلام آباد آگئی تھیں۔اور پھر رات کو ڈنر کے بعد شوہر کے اشارے پر اسکے پیچھے کمرے میں آگئی تھیں۔یہاں وہاں کی باتوں کے بعد وہ اصل مدعے پر آگئی تھیں۔

"حاشر تمہیں ایسے دیکھ کر میرا دل دکھتا ہے بچے۔اور کتنی اکیلی زندگی گزارو گے۔اب شادی کرلو۔"

"میں تو پہلے سے شادی شدہ ہوں۔"اس نے ان کی بات پر ناسمجھی سے انہیں دیکھا۔

"تو کہاں ہے تمہاری بیوی۔۔"وہ غصہ ہوئیں۔"ڈھونڈ رہا ہوں۔مل جائے گی۔"اسکا اطمینان قابلِ دید تھا۔"حاشر دوسری شادی کرلو۔اب تک کچھ نہیں کہا تمہیں۔لیکن اب بس بہت ہوا۔میں ادی زہرہ کی چھوٹی بیٹی کو تمہارے لیے مانگ رہی ہوں۔"

"اوہو اماں کیا ہو گیا ہے۔ریلیکس۔۔میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔"

"جب تک تمہاری وہ لاڈلی ملے گی۔تب تک تم بڈھے نہ ہو چکے ہو۔۔"اماں جل کر بولیں۔اس نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔

"اماں ابھی تک تو اسکے لاڈ اٹھا نہیں پایا۔آپ کو کہاں سے پتہ چل گیا وہ میری لاڈلی ہے۔"بولتے ہوئے وہ دل گرفتہ ہوا۔

"جو اسکے لیے مجنوں بنے پھر رہے ہو۔یہ کم لاڈ ہے۔"حاشر نے اماں کے تیور دیکھ کر اپنے قہقہے پر قابو پایا تھا۔وہ اس سے سنجیدہ گفتگو کرنے آئی تھیں۔"دیکھو بیٹا تمہاری عمر بڑھ رہی ہے۔تینتیس کے ہو۔کب وہ ملے گی۔کب تمہارے بچے آئیں گے۔۔"صرف اسکی اماں میں ہی یہ کوالٹی تھی کہ سنجیدہ بات بھی اسطرح کرتی تھیں کہ قہقہوں کا گلا گھونٹنا مشکل ہو جاتا تھا۔

"جب نصیب ہوگا۔سب ہو جائے گا۔"اس نے سنجیدگی کے دامن کو پکڑا۔

"شادی کروگے تو نصیب بنے گا۔ایسے تھوڑی نا نصیب بن جائے گا۔"

"اماں میری بات سنیں۔میں نے پہلے بھی کہا تھا، پھر کہہ رہا ہوں۔میری زندگی میں بس ایک ہی عورت آئی ہے۔وہ موجود رہے یا نہیں مگر میرے لیے وہی ہے۔اس لیے کسی کی بیٹی کے لیے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔کیونکہ میں شادی نہیں کرونگا۔"

"حاشر میں تمہیں اپنا دودھ نہیں معاف کروں گی۔۔"اماں نے روتے ہوئے اپنا آخری پتا بھی پھینک دیا تھا۔وہ بے یقینی سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔

"آپکی مرضی ہے اماں۔اب آپ سے بخشوانے کے لیے کسی کی زندگی تو خراب نہیں کر سکتا۔مت معاف کیجیئے گا مجھے۔"اسکے چہرے پر سنجیدگی تھی۔اب کے اماں نے رونا چھوڑ کر بے یقینی سے بیٹے کو دیکھا تھا۔"کیا زندگی خراب۔۔وہ تمہیں چھوڑ کر جا چکی ہے۔"

"وہ ایک دن آ بھی جائے گی۔اور آپ تو ماں ہیں۔روز قیامت بھی دوزخ میں جاتا دیکھ کر معاف کر دیں گی۔وہ ماں نہیں ہے میری۔وہ تو اپنی زیادتیوں پر سزا دلوانے کے لیے اللہ کے آگے ٹھہر جائے گی۔پھر کیا کرونگا۔آپکی مانوں تب بھی میری آخرت خراب۔نا مانوں تب بھی۔۔تو میں ماں کی معافی کا رسک لینا پسند کرونگا۔"

"میں ماں ہوں۔میری نافرمانی کر کے میرا دل دکھا رہے ہو۔"

"میں نافرمانی نہیں کر رہا۔آپ مجھے ایسے دوراہے پر لا رہی ہیں جہاں آپکی بات مان کر بھی میری آخرت خراب ہو جانی ہے۔آپ تو اپنا حق معاف کریں گی۔اسکے ساتھ کی زیادتی پر آپکی معافی بھی مجھے سزا سے نہیں بچا سکے گی۔آپ کو اندازہ ہے آپ نے مجھ سے کس چیز کا مطالبہ کیا ہے۔"وہ افسوس سے انہیں دیکھ رہا تھا۔"آپ کو میرے سر کی قسم۔آپ دوبارہ ایسی بات نہیں کریں گی۔"

پتہ نہیں یہ مائیں ایسا کیوں کرتی ہیں۔جان بوجھ کے اپنی اولاد کو جہنم کے دوراہے پر لا کھڑا کرتی ہیں۔اور جو مرد ماں کی فرمانبرداری کر کے اپنی طرف سے جنت کے حقدار بن رہے ہوتے ہیں۔مگر درحقیقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اسکے ذمہ صرف ماں کے نہیں اسکے ساتھی کے بھی حقوق ہیں۔اور اگر اس نے معاف نا کیا۔۔جنت تو ویسے دور چلی جائے گی۔اللہ اپنے بندوں کے ساتھ زیادتی کو معاف نہیں کرتا۔اور کئی مائیں

اپنی اولاد کو خوشی سے جہنم کے اس دروازے کے قریب کھڑا کر دیتی ہیں۔

اماں تو پھر چلی گئی تھیں۔حاشر خراب موڈ کے ساتھ گاڑی کی چابی اٹھاتا باہر نکل آیا تھا۔یہ مریم اسے ایک بار مل جاتی۔۔۔اسے مریم پر شدید غصہ آیا تھا۔نا وہ جاتی زندگی سے،نا اماں آکے ایسی قسمیں دینے کی کوشش کرتیں۔۔

" کیا بنا؟" بابا جان نے بیوی کو دیکھتے ہی پوچھا۔" وہی جواب تک بنتا آیا ہے۔"

" تم کوئی تگڑی قسم دیتیں۔پتہ نہیں کونسی مائیں ہوتی ہیں جو بیٹوں سے بات منوا لیتی ہیں۔۔" انہوں نے جان بوجھ کر انہیں طعنہ دے کر غصہ دلانے کی کوشش کی۔

" ہاں جی انوکھی مائیں ہوتی ہیں۔اور انوکھے بیٹے۔وہ کہنے لگا۔ٹھیک ہے اماں،نہ معاف کیجیئے گا۔آپکی مان کر جانا تو ویسے جہنم میں ہے۔کیونکہ وہ نہیں معاف کرے گی اپنا حق۔فرشتے تو ویسے جہنم میں لے جائیں گے۔۔"

"اس نے واقعی یہی کہا؟"

" نہ میں تو خود سے گھڑ کر بنا رہی ہوں۔۔" انہیں ویسے ہی بیٹے پر جلال آیا ہوا تھا۔شوہر کو گھور کر دیکھا۔" کتنا سیانا ہے میرا بیٹا۔ماں ہونا۔پتہ ہے معاف کر دوگی۔بیویاں کب معاف کرتی ہیں۔وہ تو قبر تک اپنے ویر لے جاتی ہیں۔" اب کے بابا جان نے بھی ان پر نشانہ باندھا تھا۔

" کاش کے ایسے فرمانبردار شوہر ہمیں بھی ملے ہوتے۔جو ہمارے حصے میں آیا وہ بہن تک کا فرمانبردار تھا۔اور ایک یہ ہے ماں کی قسموں کا توڑ رکھنے والا۔میں پوچھتی ہوں۔آج تک کہیں ایسا ہوا ہے۔ماں قسم دے ڈرائے۔آگے سے بیٹا کہے۔آپ تو معاف کر دیں گی۔اماں بیوی معاف نہیں کرے گی۔نہیں کرونگی معاف میں بھی۔۔"

" تمہیں تو شوہر کو معاف کرنا نہ آیا۔۔" بیٹے کا جواب سن کر بابا جان کو معلوم ہو گیا تھا۔وہ آج بھی وہی تھا کسی کے ہاتھ نہیں آنے والا۔اب بیوی کے ساتھ شغل لگا رہے تھے۔

☆......☆......☆

زندگی کے تھال میں دو سکے اور آن گرے تھے۔اب وہ پینتیس کا تھا۔مگر اسکی بیوی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔جاذب نے بعد میں اسے بتایا تھا کہ وہ پاکستان کے ہر اس کونے میں جا چکا ہے جہاں کسی بھی لاوارث لڑکی کے ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔

"ادا ،دو ہی صورتیں ہیں۔یا تو ملک سے باہر گئی ہونگی یا پھر اللہ کے پاس۔۔"وہ اپنے بھائی کے لیے اتنی محنت کر رہا تھا۔اب وہ تھک چکا تھا۔

ٹھیک ہے وہ اچھی لڑکی تھی۔اسکے ساتھ ظلم ہوا تھا۔مگر اب بس بہت ہوا ان کے بھائی کو آگے بڑھ جانا چاہیئے تھا۔ادھر اسکے ابو اور بھائی بھی جانے اسے کہاں کہاں ڈھونڈتے رہتے۔وہ میر حاشر سے رابطے میں رہتے تھے۔اور ہر بار مایوسی ہوتی تھی۔حاشر نے اس بات پر جاذب کو غور سے دیکھا۔

"تمہارے خیال سے وہ باہر جا سکتی ہے؟"

"میرے خیال سے ہو سکتا ہے وہ مر چکی ہوں۔یہ آپ نے نہیں سنا؟ کب تک ایک نادیدہ چیز کے پیچھے بھاگتے رہیں گے۔؟ زندہ ہوتیں تو مل جاتیں۔آپ ایک ایسے انسان کے انتظار میں خود کو رکھے ہوئے ہیں۔جس کے لوٹ آنے کا کوئی چانس بھی نہیں ہے۔بس کر دیں۔کیوں لاحاصل انتظار میں خود کو باندھ رکھا ہے؟ پانچ سال کم نہیں ہوتے۔اگر کبھی کہیں مل جائیں تو کہہ دیجئے گا۔پانچ سال انتظار کیا تھا۔۔"

"تمہیں نہیں لگتا تم اپنی حد پار کر رہے ہو؟"وہ کرسی کی بیک سے ٹیک لگائے اسے یہاں سے وہاں جھلا رہا تھا۔جاذب کی باتوں نے اسکے ماتھے پر بل ڈال دیے تھے۔

"ادا آپ کو احساس ہے۔آپ کو اسطرح دیکھنا کس قدر تکلیف دہ ہے؟"

"کیوں کیا ہو گیا ہے مجھے۔پہلے بھی تو ایسا ہوتا تھا؟ جب شادی نہیں کی تھی تب بھی مسئلہ تھا۔اب جب کر لی تب بھی مسئلہ ہے۔۔"

جاذب افسوس سے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔جو بظاہر اپنا ہر کام احسن طریقے سے کرتا تھا۔اسکی مصروفیات بھی وہی تھیں۔مگر لاہور جا کر وہ کچھ اور ہو جاتا تھا۔ہر چیز بھول جاتی اسے۔کسی دیوانے کا گمان ہوتا تھا۔ہر ایک چہرے کو کھوجتا رہتا۔کبھی لڑکیوں کے راستے روک کر انہیں مریم کی تصویر دکھا کر پوچھتا۔اس لڑکی کو کہیں دیکھا

ہے۔وہ جاتا تو اکیلا تھا۔مگر جاذب ہر بار بھائی کے پیچھے جاتا تھا۔

اور اسکی حالت دیکھ کر اسکا دل چاہتا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔وہ ہوش مند مرد محبت کے زہر سے قطرہ قطرہ مر رہا تھا۔اپنی پوزیشن ،اپنا عہدہ بھلائے اس لڑکی کے لیے پھرتا تھا۔جس سے خود کبھی ایک بار بھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔بھائی کی حالت دیکھ کر اسکے ڈھونڈنے میں تیزی آجاتی تھی۔بڑے چھوٹے شہر۔۔اس نے ملک کا کونا کونا اس دیوانے کے لیے چھان مارا تھا۔وہ ہوتی تو ملتی۔۔

"میری بھی تو بیوی ہے۔مجھے بھی اس سے محبت ہے۔مگر اتنی نہیں کہ اسکے لیے گلیوں کی خاک چھانوں۔۔"اب جاذب نے اور طرح سے اسے گھیرنا چاہا۔

"ہر دل پر محبت اور روپ میں اترتی ہے۔میرے دل میں اسکے سوا کوئی اور نہیں آتی۔کوشش بھی کی ہے۔مگر دل بار بار اسی کا نام لیتا ہے۔۔۔"

یہ مختلف وقتوں میں کی جانے والی بحث تھی۔ آج بھی جاذب غصے میں اٹھ کر اسکے آفس سے نکل کر اپنے آفس میں آگیا تھا۔

☆......☆......☆

حاشر ٹیبل پر جھکا ایک فائل کو سٹڈی کر رہا تھا۔ایک ہاتھ کی انگلیاں کیلکولیٹر پر تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔جاذب افراتفری سے دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

"ادا یہ دیکھیں۔۔"اسکی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔جیسے بھاگتا ہوا آیا ہو۔اس نے اپنا موبائل اسکے آگے کیا۔سکرین پر نظر پڑتے ہی حاشر کی سانسیں تھم گئی تھیں۔اس نے تیزی سے موبائل اپنے ہاتھ میں لیا۔ایک ویڈیو چل رہی تھی۔جہاں اب ہزاروں کے مجمع کو دکھایا جا رہا تھا۔اور پھر دوبارہ کیمرہ سٹیج پر سپیچ کے لیے آئے سپیکر پر ڈالا جا رہا تھا۔

"ہم لوگوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو اپنا آپ لگا دیتے ہیں۔اور پھر جب وہ ہمیں چھوڑ دیتے ہیں تو ہماری حالت نہ زندوں میں رہتی نہ مردوں۔۔محبت واقعی ایسا ہی کرتی ہے۔میرا ماننا ہے کہ آپ کسی سے بھی محبت کریں تو اس میں اپنا سو فیصد حصہ نہ دیں۔

اپنے وجود کا ایک حصہ خالص اپنی ذات کے لیے بچا کے رکھیں۔ تا کہ جب وہ چھوڑ جائے تو کم از کم آپ اٹھنے کے قابل تو ہوں۔ آپ اس قابل تو ہوں کہ پھر سے اپنی زندگی شروع کر سکیں۔ جو حصہ اپنے لیے رکھیں۔ تو اسے سب سے چھپا کے رکھیں۔ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے کہ آپ نے اپنے اندر صرف اپنی ذات کے لیے کچھ رکھ چھوڑا ہے۔ کیونکہ جب ظالموں کو معلوم ہو جائے تو وہ ایکسٹرا محبت دکھا کے وہ بھی لے جاتے ہیں جب دیکھتے ہیں آپ خالی ہیں تو پھر آپ میں سو کیڑے نکال کر اٹھ کر چل دیتے ہیں۔ پھر وہ تو اپنی نئی زندگی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ پھر اٹھنے کی تمنا کے باوجود بھی نہیں اٹھ پاتے۔ اندھی محبت انسان کو پیرالائز کر دیتی ہے۔ ٹھیک ہے محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی۔ جس سے ہو۔ جب ہو مگر یاد رکھیں آپ کی ذات کے اندر ایک حصہ خالص آپ کے لیے ہونا چاہیئے وہ حصہ انہیں بھی نہ دیں جو آپ سے شدید محبت کے دعوے دار ہوں۔ کیونکہ برے وقت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ تب انسان کے اندر کا وہ حصہ اسکے کام آتا ہے۔۔"

حاشر نے اسکے نیچے ایک اور ریلیٹڈ ویڈیو کھولی۔ وہ دونوں بھائی خاموشی سے موبائل کو دیکھ رہے تھے۔

"میری زندگی پہلے بہت آسان تھی۔ پھر ایسے الٹی ترتیب ہوئی کہ میں حیران بھی نہ ہو سکی۔ مگر یہی زندگی ہے۔ غیر متوقع۔۔ آپکی سوچوں سے پرے۔۔

مجھ پر ایسا وقت بھی آیا، جب میری زندگی میں موجود سب مردوں نے مجھ سے اپنا دامن چھڑا لیا تھا۔ کیونکہ میں انکے لیے ایک دھبہ بن گئی تھی۔ اور میں انہی کے طرز پر سوچتی رہی کہ اگر عورت کے نام کے ساتھ کسی مرد کا نام نہیں رہا تو وہ اب کسی کام کی نہیں رہی۔ دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جائے اور اگر کبھی اٹھے تو خود کو بیچ کے۔۔ میں نے یہی دیکھا کہ خود عورتیں بھی جب ایسے مسائل سے گزرتی ہیں تو وہ پھر خود کو زندہ رکھنے کے لیے، یا اپنی زندگی کے مردوں سے بدلہ لینے کے لیے خود کو بازار میں لا کھڑا کرتی ہیں۔ میں کہتی ہوں اگر عورت ہمت سے اپنے وجود کی عزت کے لیے کھڑی ہو جائے تو کسی آدم کے بیٹے کی جرات نہیں کہ وہ حوا کی بیٹی کو سجا بنا کر کاروبار کرے۔

ٹھیک ہے زندگی میں مشکلات آتی ہیں۔ تو جو عورتیں خود کو اس کام کے لیے پیش کرتی ہیں کیا تب وہ سکون

کے جھولے میں جھولتی ہیں؟ زندگی کے مسئلے تو چلتے رہتے ہیں۔بس ان کی وجہ سے اپنے قدم نہیں اکھاڑتے ہیں۔خود کو کسی مرد کی نہیں اپنی عزت سمجھیں۔آپ کیسے گوارا کرسکتی ہیں کہ آپ کا وجود اتنا سستا کر دیا جائے کے چند پیسوں کے عوض کسی کو بھی مل جائے؟ آپ یہ کیسے سوچ سکتی ہیں کہ اگر آپ کی زندگی میں کوئی مرد نہیں رہا تو آپ عزت دار نہیں رہیں۔خود کو مٹا دیں؟؟

اٹھیں،اور اپنا آپ منوائیں۔مگر اسطرح اپنے وجود کی تذلیل کر کے نہیں۔بھلے آپ اکیلی ہیں۔مگر اچھے راستے کو چنیں۔جب تک آپ کے نام کے ساتھ کسی مرد کا نام رہتا ہے آپ اپنی حفاظت کرتی ہیں۔جب صرف اپنا ہی نام رہ جاتا ہے تو پھر کیا ہوتا ہے؟ کیا آپ کا اپنا نام آپکے لیے عزت اور غیرت نہیں بن سکتا؟

اٹھیں اور اپنے وجود کی عزت کے لیے لڑیں۔اور دنیا کے اچھے شعبوں میں اپنا نام لکھوائیں۔

بھلے آپ اکیلی ہیں۔مگر اپنے آپ میں مکمل ہیں۔آپ کی کوشش کئی عورتوں کے لیے روشنی بن سکتی ہے۔میں یہاں اپنی زندگی کی مشکلیں اس لیے نہیں بتا رہی کہ آپ لوگ مجھے باہمت کہیں۔میں اس لیے آپ سے شیئر کر رہی ہوں کہ ہوسکتا ہے آپ میں سے کوئی ایک بھی اپنی زندگی میں ایسی ہی کسی مشکل کا سامنا کر رہی ہو۔میرے الفاظ اسکے لیے روشنی بنیں۔کہ جب یہ اکیلی عورت اپنے لیے عزت بن سکتی ہے تو آپ بھی بن سکتی ہیں۔

میں اک جگنو اک تارہ سہی

اندھیر نگر کی تو روشنی ہوں

اور یاد رکھیں غیرت کا مفہوم کسی مرد سے ریلیٹڈ ہونا نہیں ہوتا۔غیرت کا صرف ایک ہی مفہوم ہے اور وہ ہے خدا کی بنائی حدود کو نہ توڑنا۔۔" سامنے ساری عورتیں بیٹھی تھیں۔کوئی انٹرنیشنل خواتین کا سیمینار تھا۔وہ ایک کرسی کے آگے بیٹھی ہاتھ میں مائیک پکڑے بول رہی تھی۔اور وہ ساری عورتیں اسے توجہ سے سن رہی تھیں۔حاشر نے اس سے نیچے والی ایک ویڈیو کھولی۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔وہ وہی تھی۔مریم۔۔مریم عالم۔۔وہ بے یقینی سے ایک ایک کر کے اسکی ویڈیوز دیکھ رہا تھا۔نہیں۔۔وہ مریم عالم نہیں تھی۔وہ تو مریم میر تھی۔

میر پڑھ کرا سکے دل کے اندر کچھ ہوا تھا۔اس نے ایک اور ویڈیو کھولی۔اس میں سوال جواب سیشن تھا۔کسی یونیورسٹی کے سٹوڈنٹس اس سے سوال و جواب کرر ہے تھے۔ایک لڑکی اٹھی۔

" آپ خود حجاب کرتی ہیں۔تو آپ ہمیں حجاب پر بھی لیکچر دے کر بتائیں گی کہ یہ اچھا ہے؟" لڑکی کا لہجہ صاف مذاق اڑاتا ہوا تھا۔پتہ نہیں کس موضوع پر وہ سب بولنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔یہ چند منٹ کی کلپ تھی۔اب کیمرہ پھر مریم پر تھا۔اور پیچھے ایک بینر پر لکھا جرمنی نظر آ گیا تھا۔

" آپ مسلم ہیں؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

" جی۔۔"لڑکی نے جواب دیا۔" تبھی آپ کو ٹینشن لگ گئی کہ میں آپ کو حجاب پر لیکچر نہ دے دوں۔"وہ ہنسی۔پھر سنجیدہ ہو کر اسے دیکھا" آپ مسلم ہیں۔آپ کے لیے ایک کتاب اوپر سے بھیجی گئی ہے۔یہ حکم اس میں ہے۔میں کیوں آپ کو حجاب کرنے کو کہوں گی؟ جائیں اس کتاب کو کھولیں۔پڑھیں۔اس میں حجاب کے علاوہ بھی حکم ہیں۔

ان کو مان سکتی ہیں۔مانیں۔نہیں مان سکتی تو ایک پیپر پر اپنی دلیلیں لکھتی جائیں کہ آپ کے خیال سے وہ حکم کیوں نہیں مانا جانا چاہیئے۔اور جب سب دلیلیں لکھ لیں تو پھر سوچیں۔جس نے حکم دیا ہے اسکے سامنے یہ دلیلیں دہرا سکتی ہیں؟ جب وہ پوچھے گا میرا فلاں حکم کیوں نہیں مانا تھا۔تو آپ اپنی وہ دلیلیں اسکے آگے دہرا سکتی ہیں؟۔اگر واقعی کر سکتی ہیں تو گڈ اینڈ ویل۔

ورنہ تلاش جاری رکھیں کسی نئی دلیل کے لیے۔تا کہ جواب دے سکیں۔باقی میں کوئی مذہبی سکالر نہیں ہوں۔اس لیے مجھے اسکی اہمیت کا صحیح طرح معلوم نہیں ہے۔میں خود اس لیے کرتی ہوں کہ میں ایسے کمفرٹیبل فیل کرتی ہوں۔" وہ باقاعدہ حجاب نہیں کرتی تھی۔ایک سکارف کو اپنے دوپٹہ سٹائل میں لیتی تھی۔سر کے بال کبھی کبھار نظر آ جاتے۔اور نیچے گردن سے ڈھیلا۔لباس تو ہر ویڈیو میں مغربی تھا۔مگر اس میں مشرقی ٹچ تھا۔یوں کہ اسکا جسم نمایاں نہیں ہو رہا تھا۔

وہ لڑکی بیٹھ گئی تھی۔اب کوئی لڑکا کھڑا ہو رہا تھا۔حاشر نے موبائل ایک طرف کر دیا۔اسکی کیفیت بہت عجیب ہو رہی تھی۔شاید یہ بہت زیادہ خوشی تھی۔جسکا وہ کب سے انتظار کر رہا تھا۔وہ مل گئی تھی۔اور اچھے حال میں ملی

تھی۔اوہ خدا شکر۔۔

اسکے بعد اس نے اسی سوشل میڈیا کے اکاؤنٹ پر رابطہ کیا تھا۔معلوم ہوا وہ مختلف اداروں میں جا کر لیکچرز دیتی ہے۔اسکی رہائش کہاں ہے۔نہیں معلوم۔وہ ایک سے دوسرے لنک کے پاس جا رہا تھا۔لوگ اسے دوسرے کے پاس ریفر کر دیتے۔شاید اسے معلوم ہو کہ مریم میر کہاں رہتی ہے۔یہ کیا ماجرا تھا؟ کوئی بھی اسکی رہائش کا نہیں جانتا تھا۔

ایک بار پھر سے وہ اپنے عہدے کا استعمال کر رہا تھا۔فارن منسٹری سے اسکا ریکارڈ نکلوا رہا تھا۔وہ پاکستان سے باہر کب گئی تھی۔اور پھر وہاں سے کس ملک گئی تھی۔موجودہ رہائش کہاں تھی۔خوش قسمتی سے وہ ایسے ملکوں میں گئی تھی۔جہاں پاکستانیوں کی کم تعداد ہوتی ہے۔اسکا ڈیٹا آرام سے مل گیا تھا۔سارا ریکارڈ نکلوا کر اس نے اس کے ابو کو اسکے مل جانے کی اطلاع کی تھی۔سب بہت خوش تھے۔وہ مل گئی تھی۔رشیا کا ویزہ لگوا کر وہ اب رشیا میں تھے۔حاشر کو ماسکو کی فضائیں اپنی اپنی لگنے لگی تھیں۔وہ یہیں تھی۔مگر اسے اس پر بہت غصہ بھی تھا۔وہ اس سے ٹھیک ٹھاک جھگڑا کرنے والا تھا۔وہ اس کے پاس کیوں نہیں آئی تھی۔کیوں؟؟

☆......☆......☆

ایمبسی سے اس کی رشیا کے بارے میں معلومات لے کر، وہ دونوں اب اس ادارے کی طرف جا رہے تھے۔جہاں وہ پڑھا رہی تھی۔اور وہاں سامنے رک کر اس نے فیصلہ کیا تھا۔پہلے اسکے ابو اس سے مل لیں۔وہ آدھا راستہ تو روتے آئے تھے۔وہ پھر پارکنگ میں کھڑی گاڑی میں بیٹھا رہا۔

پہلے وہ اپنے گھر والوں سے تعلقات ٹھیک کر لے۔پھر وہ جائے گا۔اسکے ابو پرنسپل آفس گئے تھے۔وہ مریم عالم اردو ٹیچر سے ملنے آئے تھے۔پھر انہیں وہاں سے اسکے روم میں بھیج دیا گیا تھا۔

مریم اس وقت اپنا ایک لیکچر لے رہی تھی۔جب اسے اطلاع دی گئی کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔اب اکثر لوگ اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔کوئی اپنے کسی سوال کے جواب کی تلاش میں آتا تھا۔تو کسی کو کیا کام ہوتا تھا۔اس نے گردن ہلا کر پانچ منٹ میں آنے کا کہا تھا۔جب وہ فارغ ہو کر اپنے آفس میں پہنچی۔سامنے ایک آدمی اسکی ٹیبل کی جانب جھکا ایک پمفلٹ پڑھ رہا تھا۔مریم نے دروازہ بند کیا۔

"ہیلو۔میں مریم میر ہوں۔" کہتے وہ اپنی کرسی کی جانب بڑھی۔

اس کے ابو نے مڑ کر اسے دیکھا۔مریم کا سانس جہاں کا تہاں رہ گیا تھا۔اسکے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی تھی۔نوٹس کے صفحے بکھر کے یہاں وہاں ہو گئے تھے۔اسکے ابو روتے ہوئے اسے دیکھتے ہولے ہولے قدم اسکی جانب بڑھانے لگے۔

"میری بیٹی۔۔مریم۔۔"انہوں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگانا چاہا۔وہ ایک دم سے ہوش میں آ کر پیچھے ہٹی تھی۔

"کیا کرنے آئے ہیں آپ۔۔"اسکی آواز میں خوف تھا۔وہ محسوس کر کے اور غم زدہ ہوئے۔

"میں تم سے ملنے آیا ہوں۔تمہیں لینے آیا ہوں۔چلو میری بیٹی۔۔اپنے گھر چلو۔۔ہم سے غلطی ہو گئی تھی۔۔"

مریم نفی میں سر ہلا رہی تھی۔اسے یقین نہیں تھا کہ وہ سچ بول رہے ہیں۔وہ دوسرے ملک میں تھی۔یہاں اسے مار نہیں سکتے تھے۔پھنس جاتے۔اس لیے اسے پیار سے بہلا کر ساتھ لے جانے آئے تھے۔

"مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔۔"وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

ان کے دل کو تکلیف ہو رہی تھی۔وہ اتنے سال بعد ایک دوسرے کو مل رہے تھے۔بیٹی نے آگے بڑھ کر انہیں گلے سے بھی نہیں لگایا تھا۔وہ اپنی صفائیں دیتے رہے۔بالآخر وہ رو پڑی تھی۔" آپ کو معلوم ہے۔ایک بیٹی کو اپنے باپ سے کتنی محبت ہوتی ہے؟شاید ہر بیٹی کے دل میں ہوتی ہو۔مگر میرے دل کے تو آپ ہی بادشاہ تھے۔میرے ہیرو تھے۔مجھے آپ سے اتنی محبت تھی کہ میرا دل چاہتا۔آپ جہاں جہاں قدم رکھتے ہیں میں وہاں وہاں اپنا دل رکھتی جاؤں۔اتنی محبت تھی آپ سے۔۔اور آج بھی ہے۔۔لیکن آپ نے کیا کیا؟"

وہ دکھ سے ان کو دیکھ رہی تھی۔" آج آپ کہتے ہیں۔میرے دامن سے داغ ہٹ گیا ہے تو اب دوبارہ اسی خاندان کا حصہ بن جاؤں؟ تب مجھے کیوں نہیں قبول کیا تھا؟تھی تو آپکی ہی بیٹی۔۔چاہے بری ہی ہوتی۔۔ماں باپ بھی اولاد کو پھینکتے ہیں؟؟

مجھے زندگی بھر نہیں بھولے گا۔میرے قتل کے وقت آپ وہاں موجود تھے۔آپ نے آگے بڑھ کر میرے

بھائی کا ہاتھ نہیں روکا تھا۔" وہ بولتے بولتے پھر سے رونے لگی تھی۔ "میرا بچہ جو گزرا، اسے بھول جاؤ۔۔ ہم شرمندہ ہیں۔ماں باپ کو معاف کردو۔کبھی کبھار ماں باپ زیادتی کر جاتے ہیں۔مگر اولاد سے محبت بھی تو کرتے ہیں۔۔ہمیں تم سے بہت محبت ہے۔۔"

"میری سگی بہن۔۔وہ جب آتی تھیں تو میرا چہرہ بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔گھر کے بچوں کے لیے میں بری تھی۔امی کھانا کم دیتی تھیں۔کہ ایسے مر جائے گی۔بالآخر بھائی نے قتل کرنے کا سوچ بھی لیا اور عمل بھی کر لیا۔اب آپ لوگ یہی سوچیں۔میں اسی رات ہی مر گئی تھی۔مرے ہوئے زندہ نہیں ہوتے۔" اسکے ابو اسکے روتے وجود کو تھامنے کے لیے پھر آگے بڑھے۔وہ سر جھکائے رو رہی تھی۔انہوں نے اسے گلے لگا لیا تھا۔اسکا ضبط ٹوٹ گیا تھا۔وہ اونچی آواز سے رونے لگی۔" کیوں کیا میرے ساتھ ایسا کیوں۔۔میں نارمل ہو کر بھی نارمل نہیں رہی۔۔کیوں۔۔" وہ روتے ہوئے اسکے سر کو تھپتھپا رہے تھے۔پھر خود کو سنبھال کر وہ پیچھے ہوئی۔

"چلے جائیں میری زندگی سے۔نہ اب آپ لوگ میرے لیے زندہ ہیں۔نہ میں آپ لوگوں کے لیے۔۔"

" کہہ دینے سے سب رشتے ختم نہیں ہو جاتے میرا بیٹا۔" ان کا لہجہ وہ برسوں بعد سن رہی تھی۔اسکا دل کٹا جا رہا تھا۔

" ہر رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ہر رشتہ۔۔جب اس میں خلوص اور محبت نہ رہے۔آپ میرے والد ہیں۔آپ سے محبت فطری ہے۔کل بھی تھی، آج بھی ہے۔مگر اب میں آپ پر اعتبار نہیں کرتی۔جب اعتبار نہیں کرتی تو آپ لوگوں کے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتی ہوں۔آپ جائیں یہاں سے۔۔پلیز چلے جائیں۔"

"میں تمہاری ماں سے کیا کہوں گا۔وہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی۔جب سے تمہارے ملنے کا پتہ چلا ہے۔وہ خوشی سے سو نہیں پائی۔۔" وہ بے بسی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"انہیں تب ضرور نیند آئی ہوگی۔جب میں کئی کئی دن کھانے کے لیے یہاں وہاں بھٹکتی تھی۔اور پھر اپنی عزت نفس پر پیر رکھ کے بھیک مانگ کر پیٹ بھرتی تھی۔انہیں تب بھی نیند ضرور آئی ہوگی جب میں یہاں سردی کے مارے لوگوں کے دروازے کھٹکاتی تھی۔ مجھے آگ کے آگے بیٹھنے دیں۔اور وہ کسی فقیر کی مانند دھتکار دیتے تھے۔انہیں اس رات بھی نیند آئی ہوگی جب میں اپنی عزت بچانے کے لیے کچرے میں ساری رات پڑی رہی

تھی۔مجھے بتائیں۔میں کیا کیا بھولوں؟ وہ کچرے میں گزری رات آج بھی میرے دماغ میں اسی طرح تازہ ہے۔کئی لوگوں کے بیچ بیٹھی ہوتی ہوں۔جب یوں لگتا ہے۔کچرے کے کیڑے میرے جسم پر حرکت کر رہے ہیں۔

راتوں کو سوتے وقت یوں لگتا ہے کسی نے منہ پر گند کا ڈھیر ڈال دیا ہو۔بد بو سے نیند نہیں آتی۔۔لیکن تب بھی۔انہیں نیند آتی ہو گی۔اب بھی آجائے گی۔آپ لوگ میرے ماں باپ ہیں۔آپ سے ہمیشہ محبت رہے گی،خون کی محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔میں نے ہر چیز کے لیے آپ لوگوں کو معاف کیا،مگر خدارا اب میری زندگی میں نہ آئیں۔۔خدا کے لیے چلے جائیں۔۔مجھے جینے دیں۔۔میری تکلیف کو نہ بڑھائیں۔۔" وہ شکستہ قدموں سے پلٹ رہے تھے۔اور مریم نے بائیں ہاتھ پر اپنے دانت گاڑ دیے تھے۔اسے اپنی چیخیں روکنی تھیں۔

اسکے ابو جا رہے تھے۔اسکا دل انکے قدموں سے لپٹا جا رہا تھا۔وہ ضبط کی آخری انتہاؤں پر تھی۔اسے واپس نہیں جانا تھا کسی صورت نہیں جانا تھا۔ان کے جانے کے بعد وہ وہاں سے نکل آئی تھی۔اسے رونا تھا کھل کے بہت سا۔۔شدت ضبط سے جسم میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔وہ سامنے نظر آتے اپنے سٹوڈنٹ کو اطلاع کرتی وہاں سے نکل آئی تھی۔اب بقیہ لیکچر اس نے کل دینا تھا۔ابھی تو رونا تھا۔۔

وہ دوسرے دروازے سے نکل کر پیدا چلتی جا رہی تھی۔جب کہ حاشر نے اسکے ابو کو آتے دیکھ کر پوچھا تو انہوں نے روتے ہوئے سب بتا دیا تھا۔پھر وہ اسکے آفس تک گیا تھا۔وہ وہاں نہیں تھی۔کہاں چلی گئی تھی؟ کیا ایک بار پھر سے بھاگنے والی تھی؟۔۔حاشر کو ڈر لگا۔

آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی وجہ سے بار بار راستہ دھندلا ہو رہا تھا۔اسکے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔روتے روتے اسکی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔وہ چلتے چلتے وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی تھی۔بلند آہوں اور سسکیوں کے ساتھ رو ئے جا رہی تھی۔ایک ایک رگ میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔شدت غم سے اسکا دل پھٹنے کو تھا۔اسکی سانسیں اندر کہیں اٹکتی جا رہی تھیں۔

یہ دن کا مصروف وقت تھا۔گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔پیدل کوئی نہیں تھا۔

اس تکلیف سے اسے اپنی رگوں میں درد ہی بہتا محسوس ہو رہا تھا۔وہ درد کے مارے جھکتی جا رہی تھی۔وہ

ہر بار سوچتی۔بس یہی ہے درد اور تکلیف کی انتہا۔اور ہر بار غلط ثابت ہوتی تھی۔اس نے کب سوچا تھا۔اسکے ابو اسے لینے آئیں گے۔اور وہ درد کی اس انتہا کو بھی چھوئے گی۔آج ساری تکلیفیں ایک ساتھ آملی تھیں۔جھوٹے الزام کا دکھ،گھر والوں کے بدل جانے کا غم،حاشر کے چھوڑنے کی تکلیف۔۔پردیس میں گزری ذلت کے بہت سے دن۔۔جس نے پوری زندگی کے ہر سکھ کی قیمت وصول کی تھی۔وہ کس غم کو بھولتی۔۔کس درد کا مداوا کرتی۔۔کس درد کو دل سے نکالنے کے جتن کرتی۔۔اسکا دل چھوٹا سا تھا۔اسکی گزری زندگی کے وہ سب غم ایک ساتھ اسکے دل میں نہیں سمارہے تھے۔وہ روتے روتے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ چکی تھی۔یوں لگتا تھا پورا جسم ہی فنا کے دہانے پر آن کھڑا تھا۔

روتے ہوئے اسکا جسم ہل رہا تھا۔جانے کتنی دیر وہ روتی رہی۔

پیچھے سے ایک عورت نے اس کے کندھے پر ہمدردی سے ہاتھ رکھا۔مریم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔وہ ہمدردی سے اسکی طبیعت کا پوچھ رہی تھی۔مریم نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔وہ ٹھیک نہیں تھی۔اسے اپنا بے جان لگ رہا تھا۔جسم کی طاقت بس چند گھنٹوں میں نچڑ چکی تھی۔اتنی دیر میں روتے روتے اسکی آنکھوں میں درد ہونے لگا تھا۔

وہ اس عورت کے سہارے بمشکل کھڑی ہوئی۔اور ٹیکسی کر کے اپنے اپارٹمنٹ چلی آئی۔

☆......☆......☆

حاشر اسکے گھر کا ایڈریس انتظامیہ سے پوچھ رہا تھا۔پہلے تو وہ دینے سے انکاری رہے۔یقیناً اس نے ہی انہیں منع کر رکھا تھا۔اس لیے کسی کے پاس اسکے گھر کا ایڈریس نہیں تھا۔پھر بہت مشکلوں سے وہ اس کا ایڈریس لے سکا تھا۔اس کے گھر جانے سے پہلے اسکے ابو کو وہ ہوٹل چھوڑ آیا تھا۔انکی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔انہیں ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔انہیں آرام کرتا چھوڑ کر خود یہاں آگیا تھا۔

جب اس کے گھر پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔اسکے اپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑا وہ چند لمحے بند دروازے کو دیکھتا رہا۔پھر خود کو کمپوز کر کے بیل بجائی۔کافی دیر وہ بیل بجاتا رہا۔وہ دروازہ ہی نہیں کھول رہی تھی۔وہ پریشان ہوا پھر کہیں چلی تو نہیں گئی۔بالآخر قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا تھا۔

حاشر کے دل کو قرار آ گیا تھا۔کب کی سنی غزل کے مصرعے یاد آ گئے تھے۔

ایک مدت ہوئی تم کو دیکھا نہیں

اک زمانہ ہوا مسکرائے ہوئے

ڈھیلی سی ٹراؤزر کے ساتھی ڈھیلی سے شرٹ۔بندھے بالوں سے نکلی کچھ بکھری لٹیں۔۔اور سوجی ہوئی آنکھیں۔یقیناً وہ صبح سے اب تک روتی رہی تھی۔وہ اسے دیکھ کر پہلے تو دنگ ہوئی تھی۔پھر ایک دم سے اندر چلی گئی تھی۔"اب انہیں بھی معافی چاہیئے ہوگی۔۔" وہ بڑبڑاتی جا رہی تھی۔

حاشر خود ہی اندر آ گیا تھا۔اور دروازہ بند کر دیا۔وہ چلتے ہوئے بیڈ روم کی طرف جاتی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی۔حاشر نے تسلی سے اس کے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ایک چھوٹا سا مگر روشن اپارٹمنٹ تھا۔ایک جانب چھوٹا سا بیڈ روم تھا۔جس پر پانچ سیڑھیاں چڑھ کر جانی پڑتی تھیں۔اسکی پارٹیشن ایک گلاس سے کی گئی تھی۔جس پر ابھی پردے ہٹے ہوئے تھے۔اور بیڈ کی بکھری چادر نظر آ رہی تھی۔پھر اس کے سامنے چھوٹا سا ڈرائنگ روم پلس سٹنگ روم تھا۔اور اسکے سامنے والی دیوار گلاس وال تھی۔جس کے ایک کونے سے پردے ہٹے ہوئے تھے۔

دوسرے کونے میں چھوٹا سا کچن اور وہاں رکھی ڈائننگ ٹیبل اور اسکے گرد رکھی دو کرسیاں۔

اسکے سامنے چھوٹی سی لائبریری تھی۔وہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا۔مگر مکمل تھا۔اور خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔مریم سوجی ہوئی آنکھوں سے اسے جائزہ لیتے دیکھ رہی تھی۔وہ وہی تھا۔گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا رہا تھا۔اور وہ اسکے سامنے سے گزر گئی تھی۔"بہت خوبصورت اپارٹمنٹ ہے۔۔"

"یہ میرا گھر ہے۔۔" وہ جتاتے لہجے میں بولی۔حاشر اسکی طرف متوجہ ہوا۔اسکی سوجی آنکھوں نے توجہ کھینچ لی تھی۔وہ چلتا ہوا اسکے سامنے جا کھڑا ہوا۔وہ چوتھی سیڑھی پر بیٹھی آنکھوں میں سختی بھرے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔حاشر نے گہری سانس لی۔

" کیسی ہو؟"

"جس کام کے لیے آئے ہیں وہ کریں نا۔۔" اس نے طنز کیا۔

" کس کام کے لیے آیا ہوں۔" وہ اسی طرح اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔

" آپ کو بھی معافی تلافی چاہیئے ہوگی۔تا کہ سکون سے رہ سکیں۔تو شروع کریں اپنا کھیل۔"

"سوچ لو۔کہیں ایسا نہ ہو تمہیں ہی معافی مانگنی پڑ جائے۔" وہ ایک ایک لفظ چبا تا اس سے دو قدم نیچے بیٹھ گیا تھا۔پاؤں زمین پر ہی تھے۔رخ موڑ کر سیڑھیوں کی گرل سے ٹیک لگالی تھی۔

"واہ کیا ہی خوش فہمیاں ہیں۔۔میں آپ سے معافی مانگوں گی۔۔کیوں مانگوں گی میں معافی۔ہاں۔۔"

وہ بھڑک اٹھی تھی۔حاشر نے واضح محسوس کیا تھا۔وہ اس بات سے بے پرواتھی کہ وہ اسکے سامنے بغیر دوپٹے کے بیٹھی ہے۔کچھ تھا اسکے انداز میں۔۔غصہ۔۔اور حقارت۔۔ہاں حقارت بھی تھی۔وہ اسے بے وفا سمجھ رہی تھی۔

وہ اس پر اپنا سارا غصہ نکالنا چاہتی تھی۔۔برسوں کا دبا غصہ۔۔مشکل وقت میں ساتھ چھوڑنے کی تکلیف آنکھوں میں واضح تھی۔

حاشر نے ہاتھ بڑھا کر اسکا ہاتھ تھامنا چاہا۔اس نے غصے سے ہاتھ چھڑا لیا تھا۔تیزی سے نین کٹورے بھرنے لگے تھے۔

" کوئی ضرورت نہیں مجھے ہاتھ لگانے کی۔اب روتا دیکھ کر ہمدردی ہو رہی ہے۔اس وقت کہاں تھے۔۔کیوں چھوڑ دیا تھا۔" وہ رو پڑی تھی۔جلتی آنکھوں میں پھر سے پانی آجانے کی وجہ سے تکلیف بڑھ گئی تھی۔حاشر اٹھ کر اسکے ساتھ بیٹھ گیا۔

" نہیں چھوڑا تھا تمہیں۔۔کیسے چھوڑ سکتا تھا۔۔" مریم نے روتے ہوئے اسکے کندھے پر سر رکھ لیا تھا۔آج ہی سارے ضبط ختم ہونے تھے۔برسوں بعد رونے کے لیے کوئی کندھا دستیاب ہوا تھا۔وہ سالوں سے اکیلے روتی آئی تھی۔روتے ہوئے پھر سے اسکی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔بہت مشکل دن تھا۔آج ہی ضبط کے سارے بندھن ٹوٹنے تھے۔۔اسکا جسم کانپ رہا تھا۔برسوں کی تکلیف تھی۔حاشر نے اسے سکون سے رونے دیا۔اسکے کندھے کے گرد اپنے بازو کا تحفظ بنائے۔اسکے کندھے کو تھپک رہا تھا۔جب اسے روتے ہوئے احساس ہوا کہ حاشر کے کندھے پر سر رکھے رو رہی ہے۔ایک دم سے پیچھے ہوئی تھی۔اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں صاف کیں۔اور گالوں کو بھی صاف کیا۔

وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔مریم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔وہ اب اسکا شوہر نہیں تھا۔کاش کہ مرجاتا جب اس کا نہیں تھا تو۔اسے پھر سے رونا آیا۔وقت نے اسکے بہت سے نا قابل تلافی نقصان کیے تھے۔اسکی پھر سے بھرتی آنکھوں کو دیکھ کر حاشر نے فوراً وارننگ دی۔

"بس کرو اب۔بہت رولیا۔" حاشر کے ضبط کی داد دینی چاہیئے تھی۔وہ پرسکون تھا۔"پہلی بات یہ بتاؤ۔تم گھر سے نکل کر میرے پاس کیوں نہیں آئی تھیں۔"اب اس نے اپنا رجسٹر کھول لیا تھا۔

"طلاق کے بعد کوئی گنجائش بچتی ہے؟"مریم نے الٹا سوال کیا۔"تم نے طلاق نامہ خود پڑھا تھا۔"

" کیوں پڑھتی میں۔جب معلوم تھا۔دو دن پہلے آپکی والدہ نے فون کر کے سب کہہ دیا تھا۔پھر آپکے پیپرز کو پڑھنے کی گنجائش بچتی تھی۔" حاشر نے افسوس سے اسے دیکھتے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے فولڈ کیا ہوا وہ لفافہ نکالا۔"اسے پڑھو۔۔یہی کاغذ تھے نا۔پڑھو اور بتاؤ۔کیا ہے یہ۔"

اور پڑھنے کے بعد جو مریم کے چہرے کے تاثرات تھے۔وہ کسی طور نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھے۔حاشر نے واضح خوشی دیکھی تھی۔"تم نے پاکستان کیوں چھوڑا تھا؟"حاشر اس سے ایک ایک چیز کا حساب لینے والا تھا۔مریم نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر خوشی کے اس تاثر کو حاشر سے چھپانا چاہا۔حاشر نے اسکے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔مریم نے نظریں اپنے پیروں پر ٹکا لی تھیں۔خود پر اتنا غصہ آنے لگا۔بھلا کیا ضرورت تھی اسے بن کہے معاف کرنے کی کی؟جی حاشر نے معافی نہیں مانگی تھی۔اور وہ اسے پھر بھی معاف کر چکی تھی۔اور اب اس وقت اسکے سامنے کھڑی شرما رہی تھی۔ڈوب کے مرجاؤ مریم۔۔وہ خود کو سنا رہی تھی۔وہ اسکا ہاتھ پکڑے اسے صوفوں کی جانب لے آیا تھا۔" کچھ پوچھا ہے تم سے۔۔" حاشر نے بات دہرائی۔"پاکستان میں نہیں رہ سکتی تھی۔اگر رہتی تو کہیں چھپ کے۔۔مجھے وہاں سے نکلنے کے بعد ایک اچھی اور مکمل زندگی گزارنی تھی۔یوں چھپ چھپا کے نہیں۔۔ساری دنیا کے لیے مجرم تھی۔مگر اپنے لیے تو نہیں تھی۔میں تو جانتی تھی کہ میں بے گناہ ہوں۔میرے لیے یہی کافی تھا۔میرے لیے اپنے حق میں اپنی گواہی بھی کافی تھی۔اور جب بے گناہ تھی تو میں اچھی زندگی ڈیزرو کرتی تھی۔جو پاکستان میں ناممکن تھی۔" بولتے ہوئے پھر سے اسے وہ دن یاد آنے لگے تھے۔مریم نے اپنے پردیس کے ذکر کو مختصر کرنا چاہا تھا۔مگر حاشر ایک ایک بات پوچھتا رہا۔اور مریم خود پر قابو

پائے اسے سب سناتی رہی۔

پھر بنا مریم کے پوچھے وہ اسے اپنا سفر بتانے لگا۔ ردا کے ذکر پر اسکے چہرے کے عضلات تن گئے تھے۔" تم جانتی تھی۔ وہ ہی اصلی مجرم تھی؟" حاشر غور سے اسکے چہرے کو پڑھ رہا تھا۔

"ہاں۔ تو بتایا کیوں نہیں تھا۔" اسے دھچکا لگا تھا۔

"شروع میں اندازہ نہیں تھا۔ مگر جب بھی سوچتی ہر بار اسی کی طرف شک جاتا تھا۔ پھر میں سوچتی کہ میں کہیں بدگمان تو نہیں ہو رہی۔ وہ تو میری بہت اچھی دوست تھی۔ میں اپنے آپ کو جھٹلا دیتی تھی۔ میں کبھی مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتی تھی کہ میری پیٹھ میں چھرا کس نے گھونپا تھا۔ میرے لیے ایک ہی تکلیف بہت تھی۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی۔ جب مڑ کر دیکھوں تو کوئی پیارا نظر آئے۔"

وہ آہستگی سے بول رہی تھی۔ حاشر نے افسوس سے سر ہلایا۔ وہ واقعی بہت معصوم تھی۔" ردا کے پکڑے جانے کے بعد اس نے وہاں مجھے بلایا تھا کہ میں اسکی طرف سے تم سے معافی مانگوں۔" وہ تلخی سے ہنسی۔" پتہ نہیں انسان کیوں اتنے خودغرض ہوتے ہیں۔ گھر کے گھر تباہ کر دیے اور سوچتے ہیں پھر معافی سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

حاشر نے اسکے چہرے پر آئی ایک لٹ کو پرے کیا۔ دوسرے ہاتھ میں اسکا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ویسے ہی جیسے ہمیشہ پکڑتا تھا۔

اس نے جب اماں کی قسم اور اپنے جواب کا بتایا۔ تو مریم کا قہقہہ بلند ہوا تھا۔ روئی روئی آنکھوں سے وہ ہنستے ہنستے بے حال ہونے لگی تھی۔ اور اسکا ڈمپل۔۔ کئی سالوں بعد اسے دیکھنے والا آیا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ۔ حاشر واقعی آپ نے ایسا کہا۔۔۔" کئی سالوں بعد وہ دل سے ہنس رہی تھی۔ آنکھوں کی رونق لوٹ آئی تھی۔" میں کبھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ ان قسموں کا بھی توڑ ہوا کرتا ہے۔۔۔" بول کر وہ پھر سے ہنسنے لگی تھی۔

کافی دیر باتوں کے بعد حاشر کو بھوک لگنے لگی۔

" تمہاری وجہ سے اتنے دنوں سے سکون سے کھانا نہیں کھایا۔ کچھ بناؤ جلدی سے۔"

" کیا بناؤں۔۔جلدی سے۔۔"

" مرغ مسلم اور بریانی بنانے کو نہیں کہا۔اتنا پریشان ہو رہی ہو کچھ بھی بنا لو۔"

پھر وہ مٹر پلاؤ بنانے کا سوچ کر اٹھی۔وہ چاول نکال رہی تھی۔جب حاشر نے اسکے بالوں سے بال پین نکال لیا۔سارے بال کھل گئے تھے۔اور اسکی پیٹھ کو ڈھانپ لیا تھا۔مریم نے جھنجھلا کے اسے مڑ کے دیکھا۔وہ اسکے بالوں کو تکے جا رہا تھا۔

" تمہارے بال گھنگریالے ہیں۔۔" اسکی صدمے بھری آواز آئی تھی۔مریم کا دل خوش ہوا۔اسکے بال اسے پسند آئے تھے۔

" آپ کو اچھے لگتے ہیں گھنگریالے بال۔۔" اسکی آواز میں کھنک تھی۔

" طاہر شاہ کسے پسند آتا ہے؟" حاشر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

" جی؟؟؟" مریم نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔" آئی ٹو آئی۔۔" وہ ہلکے سے گنگناتا ہوا ڈائننگ ٹیبل کے گرد رکھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔مریم کو جب بات سمجھ آئی تو اس نے صدمے سے اسے دیکھا۔وہ اسکی بے عزتی کر کے گیا تھا ابھی۔

" جلدی کرو۔۔مجھے بھوک لگی ہے۔" وہ اسکے صدمے کو خوب سمجھ رہا تھا۔مریم نے غصے سے مڑ کر پھر سے بالوں کو باندھ لیا تھا۔اور اب جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھی۔پیچھے وہ بھی اسی تیزی سے اسے آئی ٹو آئی سنائے جا رہا تھا۔

" میرے بالوں کی چھوڑیں۔اپنی فکر کریں۔بوڑھے ہو رہے ہیں۔" وہ مڑے بغیر چمچ ہلاتے جل کر بولی۔سالوں بعد وہ ملا تھا۔اور اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

" میری اماں کو بھی یہی ٹینشن تھی۔بڑھتی عمر کے ساتھ پھر شادی مشکل ہو جائے گی۔۔" وہ اپنی سنا رہا تھا۔" ارے بڑھتی عمر کا خوف۔۔" وہ مڑ کر کسی کمرشل بریک کی طرح شروع ہوئی۔

" پونڈز کریم لگائیں۔بڑھتی عمر جیسے تھم سی جائے۔" اپنی طرف سے اس نے اسے لاجواب کیا تھا۔

" اچھا پونڈز والوں کے پاس بالوں کو سیدھا کرنے کی کوئی پروڈکٹ ہے؟ تاکہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں حاشر اور مریم
نہ کسی کی بڑھتی عمر رہے نہ گھنگھریالے بال۔۔"

مریم نے سلاد کے لیے اٹھایا کھیرا غصے سے پلٹ کر اسکی طرف پھینکا۔یہ شخص سالوں بعد اسے مل رہا تھا۔حاشر نے کھیرا کیچ کر لیا تھا۔

"دھو کر تو پھینکتی۔زرا جو شوہر کی خدمت کا شوق ہو۔"

کھیرے کا معائنہ کرتے وہ اسے دھونے کے لیے اٹھنے لگا۔

☆......☆......☆

مریم نے اپنے رشتے کی پہلی شرط یہی رکھی تھی کہ اسے پاکستان لوٹ کر نہیں جانا تھا۔وہ پھر سے ایسے لوگوں کے بیچ نہیں رہ سکتی تھی۔جو اسکے برے وقت میں اسے کسی گلے سڑے حصے کی طرح دور پھینک دیتے تھے۔

حاشر چاہے تو رشتہ قائم رکھے ورنہ توڑ دے۔رشتہ توڑنا تو ناممکن تھا۔مگر اسکی پاکستان میں بھی بہت سی مصروفیات تھیں۔جن کا حل یہ تھا کہ وہ کچھ دن پاکستان میں رہتا تھا۔اور کچھ دن اسکے پاس آجاتا تھا۔

اور اب وہ ماسکو نہیں ایمسٹرڈیم میں رہتے تھے۔کیونکہ ان کا ایک آفس یہاں بھی تھا۔انہوں نے نیا گھر لیا تھا۔جو اس سے بڑا تھا۔

حاشر کا ارادہ تھا۔اب وہ پاکستان کی مصروفیات کو کم کر کے مکمل طور پر بس یہیں کا بزنس سنبھال لے۔زندگی نے بہت کچھ لیا تھا تو بہت کچھ دیا بھی تھا۔

انکی دو سال کی بیٹی تھی۔مریم اسکے گھنگریالے بال دیکھ کر اتنی خوش ہوئی تھی کہ حد نہیں۔مگر حاشر نے پھر بھی اسے طاہر شاہ کہنا نہیں چھوڑا تھا۔سب محبتیں ایک طرف۔۔یہ طاہر شاہ کی چڑ،ایک طرف۔آج وہ پندرہ دن بعد گھر آ رہا تھا۔مریم نے ڈنر کی تیاری کر لی تھی ہر بار اسکے گھر آنے پر کسی دعوت کا سا اہتمام کرتی تھی۔اب بھی بنی سنوری اسکا انتظار کر رہی تھی۔اور جب وہ گھر آ کر بیٹی سے ملا،تو اسکی مسکراہٹ گم ہوئی۔مریم نے اسکے بالوں کی افریقی مینڈھیاں بنائی ہوئی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔"بالوں پر کچھ ہو تو،اسے ہیئر اسٹائل کہتے ہیں۔"اب کہو طاہر

شاہ۔۔اس نے ہنسی دبائی۔وہ سنجیدگی سے بیٹی کے بال کھولنے لگا۔

"نہیں میں نہیں کھولنے دونگی۔کتنی تو پیاری لگ رہی ہے۔۔"اس نے بیٹی کو اٹھالیا۔وہ اسے تنگ کر رہی تھی۔

"مریم۔۔آج کے بعد میری بیٹی کا ایسا ہیئر اسٹائل نہ بنانا۔بہت مہربانی۔"اس نے غصے سے کہا۔مریم پر ذرا اثر نہ ہوا۔"پہلے وعدہ کریں۔پھر کبھی طاہر شاہ کا نام نہیں لیں گے۔"

"ٹھیک ہے وعدہ۔۔"

اب وہ بیٹی کے بال کھول رہا تھا۔

"اپنی ظالم ماں کو دیکھو۔کیسے افریقیوں کی طرح کھوپڑی سے بال چپکا دیے تمہارے۔۔"وہ بیٹی سے بول رہا تھا۔"اتنے پیارے بال ہیں میری بیٹی کے۔خوامخواہ حلیہ بگاڑ دیا۔۔"

"اچھا اور بیٹی نے وراثت میں یہ بال ماں سے لیے ہیں۔۔"

"اور بیٹی کی ماں نے سانپ والے انکل سے (طاہر شاہ)۔۔"اب حاشر مسکرا رہا تھا۔وہ پیر پٹختی کچن میں چلی گئی تھی۔

"تم نے کہا تھا طاہر شاہ کا نام نہ لینا۔۔میں نے نہیں لیا۔اب کیوں ناراض ہوگئیں۔۔"اس نے پیچھے سے صدا لگا کر پوچھا تھا۔

وہ پٹخ پٹخ کر برتن ڈائننگ ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔حاشر بیٹی کے سارے بال کھول کر اب ناراض بیوی کو منانے جا رہا تھا۔

ان دونوں نے اپنی زندگی کے بہت مشکل دن دیکھے تھے۔ایک نے اپنا ایمان جیتا تھا اور دوسرے نے وفا کی نئی مثال قائم کی تھی۔وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے پرفیکٹ میچ تھے۔بیسٹ کپل۔۔۔

......ختم شد......